ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

اکتوبر سنہ ۱۹۸۷ء

کرکٹ اسپیشل

BBM 5 85 UD R-LINTAS

جلد نمبر ۲
شمارہ نمبر ۴
اکتوبر ۱۹۸۷ء
صفر ۱۴۰۸ھ
قیمت:- پندرہ روپے
زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی

سرپرست
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

مشاورت
مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

قانونی مشیر (اعزازی)
خواجہ عدیل احمد ایڈووکیٹ

مدیرِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

مدیرِ اعزازی
طاہر مسعود

ناظمِ اشتہارات
طارق ظفر ربی

مدیرِ مسئول
تجمل حسین چشتی

مشیرِ ادارت
محمد سلیم مغل

خطاطی
رئیس الحسن، عارف سعید

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

گرین گائیڈ اکیڈمی
ادارہ اشاعت برائے تعلیم و تعمیر سیرت اطفال
زیرِ سرپرستی
ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن

ناشر: ظفر محمود شیخ، طابع: زاہد علی، مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی
برائے خط و کتابت و مقامِ اشاعت: گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲ ڈی نورس روڈ سائٹ کراچی

اداریہ	۶
اچھی بات	۷
حمدِ باری تعالیٰ کوثر اعظمی	۸
کتابیں (نظم) حماد	۹
ڈاک ڈاک کس کی ڈاک	۱۰
اس مہینے کا نام کیسے پڑا حمیرا لطیف	۱۳
چراغ سے چراغ سیّد خورشید عالم	۱۴
ورلڈ کپ، کہاں، کب، کن کے درمیان! شیڈول	۱۷
پاکستان ورلڈ کپ جیت لے گا علی واصف	۲۱
ورلڈ کپ، سنسنی خیز مقابلہ، ایک جائزہ عبدالشکور	۲۵
جب ہم جیت گئے علی نوری	۲۹
برطانوی کرکٹروں کی فریاد (نظم) عارف انجم صدیقی	۳۳
مقبول، غیر مقبول کرکٹرز (سروے)	۳۵
کرکٹ اور جانور ضیاء الرحمٰن ضیاء	۴۳
میاں داد کی ڈبل سینچری (نظم) فراست رضوی	۴۷
کارٹون	۴۸
کھیلو گے کودو گے بنو گے نواب ایاز احمد فریدی	۵۱
دنیا کے مایہ ناز بے ایمان ایمپائر طارق محمود میاں	۵۷
کرکٹ کی کہانی ع ع جعفری	۶۳
میں کرکٹر بنوں گا (نظم) شاہنواز فاروقی	۶۹
ایمپائر کے اشارے کو سمجھیے	۷۰
کرکٹ کا قاعدہ فیاض اعوان	۷۱
آل راؤنڈر علی عمران	۸۳
میرے بچپن کا زمانہ نصر اللہ خان	۸۶
جاؤ نہ انکل عمران شوکت عابد	۹۴
ثمرہ شیخ سعدیؒ کی حکایت	۹۵
فوٹو گرافی (مشاغل کی کہانی) عقیل عباس جعفری	۹۹
دوستی کے آداب ع الف، صدیقی	۱۱۱
کرکٹ کا گیت (نظم) امان اللہ خان دل	۱۱۴
دائرۂ معلومات اثر رباب جعفری	۱۱۵
انکل آٹی کیورو بوٹ (سائنسی سوال و جواب)	۱۲۱
پانڈا (جس کی نسل ختم ہو رہی ہے)	۱۲۶
ہے نا حیرت کی بات	۱۲۸

ترتیب

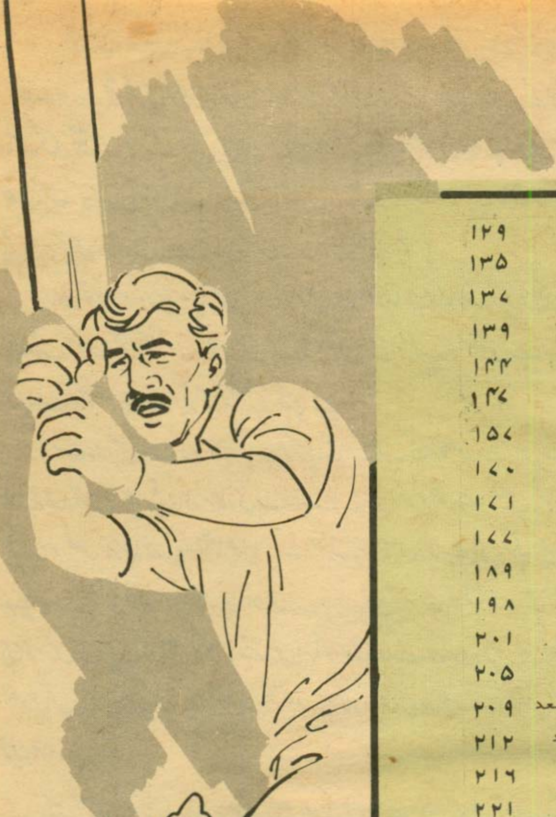

سفید بھوت ابوظفر زین	۱۲۹
مدر ٹریسا خلیل اللہ فاروقی	۱۳۵
جنگی ہاتھی (قرآنی کہانی)	۱۳۷
خزانہ میرزا ادیب	۱۳۹
پنٹو کے آنسو (تصویری کہانی)	۱۴۴
ہارا ہوا کپتان نثار احمد زبیری	۱۴۷
چھکا یاسر آدرش	۱۵۷
قومی بچت (نظم) رشید ارشد	۱۷۰
گلی کی رونق ابنِ شہباز خان	۱۷۱
پہلوان کا فرار (حق اسکواڈ) اخلاق احمد	۱۷۷
پناہ (سلسلہ وار ناول) عبدالعزیز عزمی	۱۸۹
برف کے بغیر اسکیٹنگ نسیمِ سحر	۱۹۸
چائے کی داستان عطا محمد تبسم	۲۰۱
کون سا جانور تیز دوڑتا ہے سید ابو احمد عاکف	۲۰۵
الطاف حسین حالی، ایک ناصح ایک شاعر انور سعد	۲۰۹
کچھوا اور خرگوش (منظوم ڈرامہ) امجد اسلام امجد	۲۱۲
آیئے آرٹسٹ بنیں	۲۱۶
ایک ٹانگ کا بادشاہ غلام عباس	۲۲۱
پھر بارش آئی صالحہ بلال حسین	۲۲۵
پاسبان (سلسلہ وار ناول) الف ملک مسلیم	۲۲۹
پریاں کہاں رہتی ہیں؟ قرۃ العین مسلیم	۲۳۹
نور کا ہالہ تسنیم شکیل احمد	۲۴۳
جوجی میاں جاسوس بنے سعیدہ نازش	۲۴۷
لذیذار لطیفے (منتخب لطائف)	۲۵۲
کہانی کی تلاش عبدالودود شاہ	۲۵۷
محبت کا کرشمہ کلثوم واحد	۲۶۱
کردار کی عمارت س۔ خ۔ ع	۲۶۸
شیطان اخگر انور اعوان	۲۶۹
بھلا کر بھلا ہوگا عبیداللہ	۲۷۵
گولے گنڈے والا (انعام یافتہ کہانی) اسما ہارون	۲۸۲
نئی تحریریں	۲۸۵
آؤ ملائیں ہاتھ (قلمی دوستی)	۲۹۶
امی ابو کا صفحہ پروفیسر متین الرحمٰن مرتضیٰ	۳۰۰

اداریہ

ستمبر میں آنکھ مچولی اس وقت آپ کے ہاتھوں میں پہنچا جب بدقسمتی سے پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں ہنگامے ہو رہے تھے۔ کراچی کو چھوٹا پاکستان کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں سارے صوبوں کے لوگ رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں آپس میں کئی رشتے ہیں یہ سب انسان ہیں اور اس حیثیت میں سب برابر ہیں۔ یہ سب مسلمان ہیں اور اس لحاظ سے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ سب پاکستانی ہیں اور اِن کی خوشیاں اور غم، اِن کا جینا مرنا سب ساتھ ساتھ ہے تو پھر یہ جھگڑے اور فساد کیوں ہیں؟ یہ تباہی اور بربادی کس لئے ہے؟ آخر کار اس کا انجام کیا ہوگا؟

یوں تو ان سوالوں پر سوچنا سمجھنا بڑوں کا فرض ہے۔ خصوصاً ان کا جو ذمّہ دار ہیں۔ لیکن ہم اور آپ بھی خود کو اس صورتحال سے الگ نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے کہ اس ملک کا مستقبل ہمارا اور آپ کا مستقبل ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی اِن معاملات پر سوچنا چاہیئے اور حالات کو بہتر بنانے کی اپنی سی کوشش کرنی چاہیئے۔

سب سے پہلی بات تو یہ سوچنے کی ہے کہ کراچی کے اب تک کے ہنگاموں نے کیا دیا ہے؟ اس میں بے گناہ لوگ ہلاک ہوئے ہیں۔ دکانیں، عمارتیں اور سرکاری دفاتر تباہ ہوئے ہیں، کرفیو لگا ہے، تعلیمی و تجارتی ادارے بند ہوئے ہیں۔ گلیاں، سڑکیں اور کھیل کے میدانوں پہ سناٹا چھایا ہے۔ صرف یہی نہیں ہوا ہے بلکہ ساری دنیا نے ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے یہ سب کچھ سُنا، دیکھا اور پڑھا ہے اور ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کی ہے۔ یہی نا کہ ہم کتنی اُجڈ، جھگڑالو اور ظالم قوم ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں دنیا کو بھلا یہ جاننے سے کیوں دلچسپی ہونے لگی کہ درحقیقت یہ سارے ہنگامے ایک مخصوص گروہ کے پیدا کردہ ہیں۔ یہ وہ گروہ ہے جو قوم کے اتحاد و اتفاق کا دشمن ہے۔ اور اس کے عزائم سے باخبر رہنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ ملک ہمیں خدا کی طرف سے انعام کے طور پر ملا ہے کیونکہ مسلمانوں نے اس کو حاصل کرنے کے لئے متحدہ جدّوجہد کی تھی اب اگر ہم اس نعمت کی قدر نہ کریں تو یہ ناشکر گزاری ہوگی۔ اور خدا کی ناشکر گزاری کی بڑی سخت سزا ہے۔

یہ ساری باتیں ہمارے سوچنے کی ہیں۔ خیالات اگر صحت مند ہوں تو اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسی طرح بھائی چارگی، محبت اور عفو و درگزر کے جذبات زیادہ سے زیادہ عام ہوں گے اور ہم پاکستان کو ترّقی کی منزل پر لے جائیں گے کہ دنیا رشک کرے گی۔

تازہ شمارہ کرکٹ اسپیشل ہے۔ چونکہ اکتوبر سے ورلڈ کپ شروع ہو رہا ہے اس لئے کرکٹ سے آپ کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ہم نے نہایت محنت سے یہ خصوصی شمارہ ترتیب دیا ہے۔ کھیل میں دلچسپی، جسمانی اور ذہنی صحت کے لئے ضروری ہے لیکن یاد رکھیئے کہ تعلیم کو کھیل پر اولیت حاصل ہے اس نکتے کو ذہن میں رکھ کر آنکھ مچولی کرکٹ اسپیشل کا مطالعہ کیجئے گا!

آپ کا دوست طلعت محمود شیخ

اچھی بات

ایک بادشاہ نے شکار کھیلتے ہوئے اپنے رکابدار سے کہا کہ "آؤ ہم دونوں گھوڑے دوڑائیں، دیکھیں کس کا گھوڑا زیادہ تیز رفتار ہے"۔ چنانچہ گھوڑے کی دوڑ شروع ہوگئی۔ جب اکیلے بہت دور نکل گئے تو بادشاہ نے گھوڑے کو روک لیا اور رکابدار سے کہنے لگا کہ "اس دوڑ سے میرا مقصد یہ تھا کہ میرے جی میں ایک بات آئی تھی وہ تجھ سے خلوت میں اس طرح کہہ سکوں کہ کسی کو گمان نہ ہو کچھ کہا ہے۔ اپنے اور ساتھیوں میں مجھے کوئی ایسا نظر نہ آیا جسے رازدار بنایا جائے"۔ رکابدار نے اس قدردانی اور ذرّہ نوازی کا شکریہ ادا کیا اور بادشاہ کو تقیین دلایا کہ وہ اُس کے راز کی جان سے زیادہ حفاظت کریگا۔ تب بادشاہ نے اس سے کہا کہ "مجھے اپنے بھائی کی طرف سے بہت اندیشہ ہے۔ حال میں اُس کی حرکات وسکنات سے مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ مجھے مارنے کے دَرپے ہے اور اس لئے میں نے تہیّہ کیا ہے کہ پیشتر اس کے کہ وہ مجھ پر کوئی وار کرے اُس کا اپنا کام تمام کردیا جائے۔ تجھے چاہیئے کہ اس پر کڑی نظر رکھے اور میری حفاظت میں متعدد رہے"۔ رکابدار نے قسم کھائی کہ وہ یہ بات کسی سے نہ کہے گا۔ اور دل وجان سے بادشاہ کی خدمت بجالائے گا۔ لیکن جب سب شکار سے کو شہر کو واپس ہوئے تو رکابدار نے فرصت ملتے ہی تمام قصّہ بادشاہ کے بھائی کو جا سُنایا اُس نے رکابدار کو بہت سا روپیہ انعام دیا اور آئندہ کے لئے بہت سے وعدے وعید کئے۔ اپنی حفاظت کا بھی مضبوط انتظام کرلیا۔ اس بات کو کوئی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ بادشاہ کا انتقال ہوگیا اور اُس کی بجائے بھائی تخت نشین ہوا پہلا حکم جو نئے بادشاہ نے جاری کیا وہ یہ تھا کہ رکابدار کو قتل کردیا جائے۔ اس کمبخت نے بہت گریہ وزاری کی کہ کیا میری خیرخواہی کا یہی صلہ ہے، لیکن بادشاہ نے ایک نہ سُنی اور کہا کہ "سب سے بڑا گناہ راز فاش کرنا ہے۔ اور تو اُس کا مرتکب ہوا ہے۔ میرے بھائی نے اور سب کو چھوڑ کر تجھے اپنا محرم بنایا۔ تو نے اس کا بھید کھول دیا۔ میں تجھ پر کیا بھروسہ کرسکتا ہوں"۔ اس مثل کا مطلب یہ ہے کہ کسی کا راز فاش کرنا اچھا نہیں۔

(حکایت انوارِ سہیلی)

باری تعالیٰ

حمد

کوثر اعظمی

اے خالقِ دو عالم   اے مالکِ مکرّم
اونچا ہے تیرا رُتبہ   کوئی نہیں ہے تجھ سا
بے مثل ذات تیری   اعلیٰ صفات تیری
رَبِّ رحیم ہے تُو   داتا کریم ہے تُو
تو غم گسار سب کا   پروردگار سب کا
پیارا ہے نام تیرا   بالا مقام تیرا
حاکم ہے کُل جہاں کا   مالک ہے اِنس و جاں کا
تو خالقِ زمانہ   تو کارساز، دانا
قُدرت تری ہے عالی   حکمت تری نرالی
تیرے کمال یا رب   ہیں لازوال یا رب
تو نے جو شے بنائی   کیا خوشنما بنائی
پھولوں میں تیری بُو ہے   تاروں میں تو ہی تو ہے
کرنوں میں عکس تیرا   ذرّوں میں نقش تیرا
تیری ہی ایک جھلک ہے   بجلی میں جو چمک ہے
موجوں میں زور تیرا   جھرنوں میں شور تیرا
تیری دمک گہر میں   خورشید میں قمر میں
تاروں کی جگمگاہٹ   تیری ہی مسکراہٹ
ذرّے سے کہکشاں تک   دھرتی سے آسماں تک
ہر سُو ظہور تیرا   پھیلا ہے نور تیرا

کتابیں

حمّاد

ہیں اچھی کتابیں، جواہر کی کانیں
سبھی ان میں پائیں، خرد کی دکانیں
انہی کو بڑا سب سے استاد مانیں
کتابوں سے بڑھ کر نہیں دوست کوئی،

سلیقے سے جینا سکھائیں — کتابیں
جہانوں کی باتیں بتائیں — کتابیں
نہ دیکھے جو منظر، دکھائیں — کتابیں
کتابوں سے بڑھ کر نہیں دوست کوئی،

سمجھتے ہیں جو قدر و قیمت کو ان کی
بنا لیتے ہیں اپنی تقدیر — اچھی
وہ بنتے ہیں افسر بھی سائنسداں بھی
کتابوں سے بڑھ کر نہیں دوست کوئی

جو تحفہ مجھے دو — کتابوں کا دینا
کبھی مجھ سے لو تو کتابیں ہی لینا
ان ہی سے تم اب کشتیٔ زیست کھینا
کتابوں سے بڑھ کر نہیں دوست کوئی

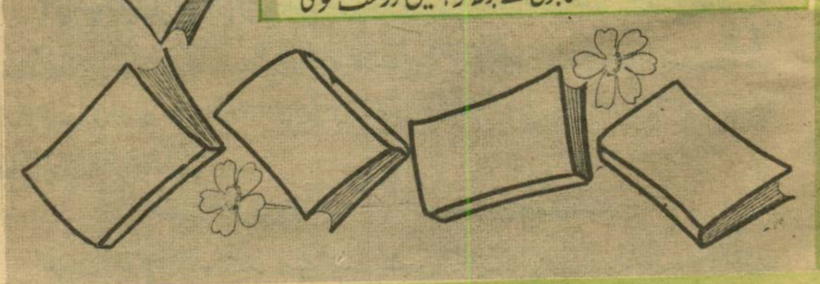

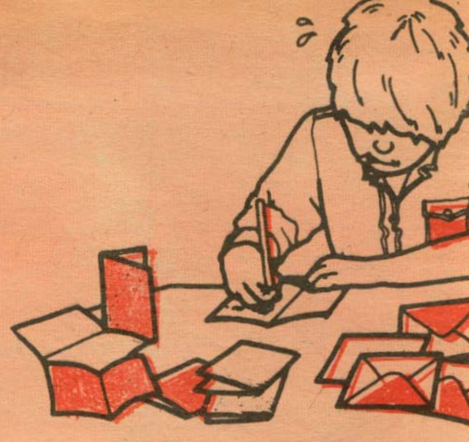

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

صبوحی بانو ——— ملیر کوثر ٹاؤن، کراچی

آپ نے شکایت کی ہے کہ اگست کے شمارے میں بھی پُرانے لکھنے والوں کی تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ اب بھلا اس میں ہمارا کیا قصور ہے کہ نئے لکھنے والے چند شماروں میں چھپنے کے بعد پُرانے ہو جاتے ہیں۔ آپ کا نام شائع نہ ہونے کی شکایت اب دُور ہو جانی چاہیئے۔ رہا سوال آپ کی نگارشات کی اشاعت کا تو ان کا فیصلہ باری آنے پر کیا جائے گا۔

خرّم علی خان ——— وہاڑی

آپ نے خود کو "غریب اور نیا قاری" قرار دیا ہے۔ "نیا قاری" والی بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن "غریب قاری" کیا ہوتا ہے؟ "آنکھ مچولی" کے سارے ساتھی ایک کنبے اور ایک خاندان کے فرد ہیں۔ ایک ہی آسمان پر چمکنے والے ستارے ہیں۔ اور ان میں آپس میں کوئی فرق نہیں۔ آپ لکھنے کی مشق جاری رکھئے۔ کہانی اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

محمد ظفر اللہ ضیاؔ ——— محلہ جنڈی والا کمالیہ

بھئی آپ کو یہ خیال کیسے آگیا کہ ہم "دائرہ معلومات" کے سلسلے میں صرف بڑے شہروں کے قارئین کو انعام دینا پسند کرتے ہیں۔ پاکستان کے سارے شہر اور قصبے، ہمارے اپنے شہر اور قصبے ہیں۔ اور یکساں پیارے ہیں، لیکن اگر کسی کا جواب ہی درست نہ ہو یا قرعہ اندازی میں کسی کا نام ہی نہ نکلے تو ہم کیا کریں؟ اطہر شاہ خاں عرف جیدی کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔

عُظمیٰ عقیل فاروقی ——— نصرت کالونی سکھر

آپ نے "آنکھ مچولی" میں بہنوں کے لیے کھانے پکانے کی ترکیبیں چھاپنے کی تجویز پیش کی ہے۔ یہ ترکیبیں

حمیرا لطیف

اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟

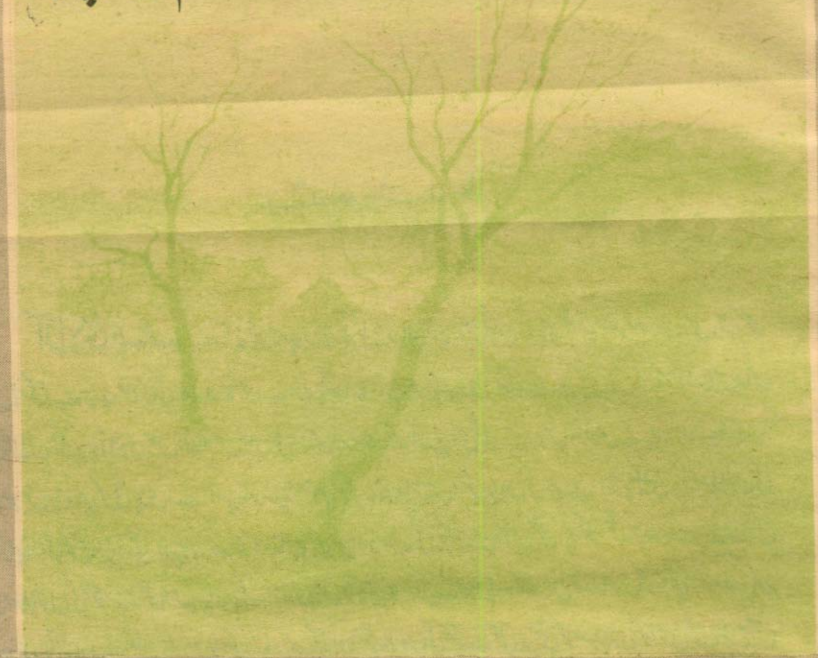

اکتوبر

سال کا دسواں مہینہ

سال کا دسواں مہینہ۔ یہ مہینہ بھی ستمبر کی طرح نہ تو کسی دیوی سے منسوب ہے اور نہ ہی کسی بڑی شخصیت سے بلکہ یہ مہینہ بھی بیچارے ستمبر کی طرح گھر سے بے گھر ہوا پھرتا ہے۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی ہیں آٹھ۔ مگر ترتیب میں یہ دسواں مہینہ ہے۔

ذہن میں قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے، اگست کے بعد کسی مہینے کو رومیوں نے کسی شخصیت سے منسوب کیوں نہیں کیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ جولیس سیزر اور آگسٹس جیسے عظیم المرتبت شہنشاہوں کے بعد ان کی نظروں میں ایسی کوئی شخصیت جچتی ہی نہیں تھی کہ جس کے نام سے وہ کسی مہینے کو منسوب کرتے۔ آگسٹس کی وفات کے ساتھ ہی روم کا سنہری زمانہ گزر جاتا ہے اور اس کے بعد وہاں کوئی ایسی ہستی پیدا نہیں ہوئی جو اہلِ روم کے دلوں کو اس طرح مسخر کر سکتی کہ وہ جولیس سیزر اور آگسٹس کے بعد اسے کوئی درجہ دے سکتے۔ چنانچہ باقی مہینوں کو اسی طرح چھوڑ دیا گیا اور ان میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔

چراغ سے چراغ

سیّد خورشید عالم

"آزادی ایک نعمت ہے" یہ جملہ آپ نے بارہا پڑھا اور سُنا ہوگا۔ لیکن اس کا حقیقی مفہوم صرف اسی وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب غلامی کی لعنت کا کسی نے مزہ چکھا ہو۔ آج ہم ایک آزاد مملکت کے باسی ہیں اور آزاد فضا میں سانس لیتے ہیں، لیکن یہ آزادی ہمیں انعام میں نہیں ملی، نہ ہی خیرات کے طور پر دی گئی ہے۔ اس آزادی کے لیے ہمارے بزرگوں کو طویل جدّوجہد کرنی پڑی ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی کو کچل دیا تھا اور پورے ہندوستان کے سیاہ وسفید کی مالک بن بیٹھی تھی۔ چونکہ انگریزوں سے پہلے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی اس لیے جنگِ آزادی میں ناکامی کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا۔ مسلمان سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی طور پر بالکل تباہ ہو گئے اور انگریزوں کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ مسلمانوں کو اِس بُری طرح کُچل دیا جائے کہ وہ دوبارہ عزّت و وقار کے ساتھ زندگی گزارنے کے قابل ہی نہ ہوسکیں۔ ان تشویشناک حالات میں قومی اُفق پر ایک شخصیت نمودار ہوئی جس نے مسلمانوں میں تعلیمی اور تہذیبی بیداری پیدا کی اور مسلمانوں کو اس قابل بنایا کہ وہ ایک علیٰحدہ، آزاد اور باوقار قوم کی حیثیت سے خود کو تسلیم کرائیں۔ یہ شخصیت سر سیّد احمد خان کی تھی۔

وہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کا ماحول علمی اور مذہبی تھا جس کی وجہ سے وہ ساری زندگی مذہب سے قریب رہے۔ انھوں نے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ، اسداللہ خان غالبؔ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ وغیرہ کا آخری دور بھی دیکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے تھے اس سے سر سیّد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان برِصغیر سے انگریزوں کو طاقت کے بل پر نہیں نکال سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں تاکہ اس طرح دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور سمجھنے کا موقع ملے۔

اسی محرّک کی بناء پر انھوں نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف علوم پر لکھی ہوئی

یوسف جمال ———— پشاور

پیارے بھائی! فی الحال "آنکھ مچولی" کے صفحات میں اضافہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور اسے مہینے میں دوبار شائع کرنے کی مہلت بھی نہیں ہے۔ آپ ایسا کیا کیجیے کہ ایک ہی شمارے کو دوبار پڑھ لیا کیجیے۔ ویسے اس شمارے کی حد تک آپ کی شکایت دور ہو گئی ہوگی۔ کیونکہ یہ ضخیم جو ہے۔!

عظمت مغنی ———— گلشن اقبال، کراچی

"آنکھ مچولی" پر آپ کی تنقید رسالے کو بہتر بنانے کے لیے ہوتی ہے اس لیے ہم کیوں بُرا مانیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم تعریف سے زیادہ تنقید کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ آپ اپنی بُری بھلی رائے سے آگاہ کرتی رہیں۔ لیکن خدارا ناراض ہو کر رسالہ پڑھنا بند نہ کریں۔ ورنہ ہم آپ سے ناراض ہو جائیں گے۔

محمد ندیم لطیف ———— اڈہ گوھر پور، راولپنڈی

واہ، واہ پہلے تو آپ نے مبارکبادوں کا ڈھیر لگا دیا اور پھر اتنی ساری شکایتیں کر ڈالیں۔ اب ہم مبارکباد سے خوش ہوں یا شکایت سے افسردہ۔ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ چلیے آپ کی سب سے بڑی شکایت، جواب نہ دینے کی، اب دُور ہو گئی ہوگی۔

محمد اکرم سیال عاجز ———— چاہ سیالاں۔ تحصیل ننکانہ صاحب

"آنکھ مچولی" ایک ایسے چاند کی مانند ہے جس کی روشنی سے سارا جہاں منوّر ہے۔ ہر ماہ یہ چاند اس جہاں میں اُترتا ہے، اس کی دھیمی دھیمی روشنی سوئے ہوؤں کو جگاتی ہے اور..." عاجز بھائی، آپ کا پورا خط "آنکھ مچولی" کی تعریف میں شاعری سے بھرا ہوا ہے۔ یہ آپ کی محبت ہے اس کے لیے ہم آپ کا کیا شکریہ ادا کریں کہ یہ تو آپ لوگوں ہی کا رسالہ ہے۔

طارق احسان ———— لیاقت آباد، کراچی

اکثر دوستوں کی طرح آپ کو بھی شکایت ہے کہ ہم خط کا جواب نہیں دیتے۔ بات یہ ہے کہ جواب دینے کے لیے صفحات کم ہیں اور ہر ماہ آپ کے خطوط ڈھیروں کی تعداد میں آتے ہیں۔ اگر ہم سارے خطوط کا جواب دینا شروع کر دیں تو رسالے میں کچھ اور چھاپنے کی گنجائش ہی نہ ہو۔ اس لیے ہم صرف انہی خطوط کا جواب دیتے ہیں جس میں سارے ساتھیوں کی دلچسپی کی کوئی بات ہو۔ کتاب "راہ نما" منگوانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ "آنکھ مچولی" کے نام دس روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیج دیجیے "راہ نما" آپ کو روانہ کر دی جائے گی۔

تو دوسرے رسالوں میں بھی چھپتی رہتی ہیں۔ ہم بطورِ خاص بہنوں کی دلچسپی کی ایسی چیزیں چھاپیں گے جو انھیں دوسرے رسالوں میں دستیاب نہیں ہوتیں۔ مثلاً ستمبر کے شمارے میں مضمون "گڑیاں جمع کرنا" آپ نے پڑھا ہوگا۔ آپ کی تجویز زیرِ غور ہے۔

شاھد عبداللہ ——————— پشاور

پیارے بھائی! پہلی دفعہ خط لکھنے کا شکریہ، آپ کی ارسال کردہ معلومات میں ہمیں یہ پڑھ کر واقعی ہنسی آئی کہ انگلستان کا بادشاہ ہنری دوم ایک سال کی عمر میں دوڑنے لگا تھا۔ کھانا بھی کھڑے کھڑے کھاتا تھا اور اُسے موت بھی کھڑے کھڑے آئی۔ کیسا عجیب بادشاہ تھا۔ ادھر آپ لوگوں کے خطوط کے اتنے انبار لگے ہیں کہ کئی دنوں تک کھڑے ہونے کی مہلت نہ مل سکے گی۔

سارہ شیخ ——————— کراچی

آپ یہ جان کر کہ حافظ ولی اللہ ارباب کی کہانی "چھپا رستم" نقل شدہ ہے، دلی صدمہ ہوا۔ ہمیں اب بھی یقین نہیں آتا۔ جس ناول کا آپ نے حوالہ دیا ہے اُس کے مصنّف کا بھی نام لکھئے تاکہ ہم تحقیق کرسکیں۔

صائمہ یونس ——————— گرومندر، کراچی

خدانخواستہ آپ سے ہمیں کیوں دشمنی ہونے لگی۔ یہ لیجیے خط کا جواب حاضر ہے۔ لیکن ایک منٹ ٹھہریئے۔ ہم جواب کیا دیں، آپ نے تو کچھ پوچھا ہی نہیں ہے۔ ہاں البتہ آپ کے پسندیدہ مصنّفوں تک آپ کی مبارکباد پہنچادی جائے گی۔

آصف علی قیصر ——————— پی اے ایف کوہاٹ

آپ نے کیا خوب لکھا ہے کہ جس طرح چینی کی کمی سے حلوے کا ذائقہ پھیکا پڑ جاتا ہے اسی طرح مزاحیہ تحریروں کی کمی سے پرچے کا معیار بھی متاثر ہوتا ہے۔ آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر، لیکن پھر بعد میں چینی کی زیادتی کی شکایت نہ کیجئے گا۔

واجد محمود عباسی ——————— حوض پورہ راولپنڈی

سالنامہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کو اس میں بچّوں سے زیادہ بڑے لکھنے والوں کی تحریریں دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ بھئی "آنکھ مچولی" پر بچّوں کے علاوہ بڑوں کا بھی حق ہے۔ اور پھر بچّوں کو کہانیاں تو بڑے ہی سُناتے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ اسکول کھلنے کے بعد آپ سالنامے کے ساتھ ملنے والی پنسل اور اسکیل فخریہ اپنے ساتھیوں کو دکھائیں گے۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ جواب میں وہ بھی یہ چیزیں آپ کو دکھا دیں۔ پھر؟

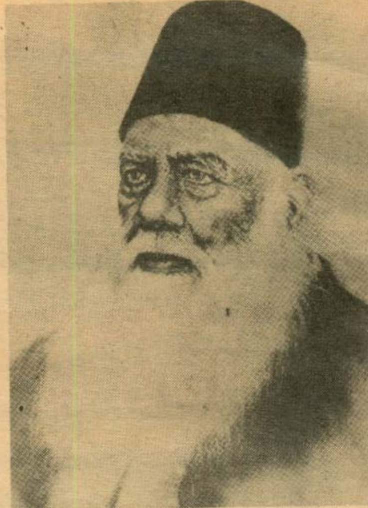

غیر ملکی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ ہو تاکہ جدید تعلیم میں پیش رفت ہو سکے۔

۱۸۷۵ء میں سرسیدّ نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل ہائی اسکول قائم کیا۔ یہ اسکول جلد ہی کالج کا درجہ پا گیا اور اس کے کچھ عرصے بعد اُسے یونیورسٹی کا درجہ مل گیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں علمی ادبی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اس عظیم درسگاہ کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اس یونیورسٹی میں بنگال سے پشاور تک کے طالبِ علم آتے جہاں انھیں نہ صرف زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا جاتا بلکہ ایک اچھا شہری اور ایک اچھا مسلمان بھی بنایا جاتا تھا۔ علیگڑھ یونیورسٹی کے طلباء ملک بھر میں بڑی عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

اس یونیورسٹی کے قیام کے علاوہ سرسیدّ نے جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ تھا کہ انھوں نے سب سے پہلے دو قومی نظریہ پیش کیا یعنی ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔ بعد میں یہی نظریہ بالآخر نظریۂ پاکستان کہلایا۔ اور اس کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا۔ جب مسلمانوں نے ایک علیحدہ وطن کی جدّوجہد شروع کی تو اس تحریک میں علی گڑھ کی تیار کردہ نوجوانوں کی ٹیم نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

علی گڑھ کے انھی سابق طلبا میں ایک نام ہمیں لیاقت علی خان کا بھی نظر آتا ہے، جو درحقیقت سرسیدؒ ہی کے چراغ سے جلائے ہوئے ایک روشن چراغ تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خان مشرقی پنجاب کے ضلع کرنال میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی سال ہے جب قائدِاعظم انگلستان سے بیرسٹر بن کر لوٹے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڑھ سے گریجویشن کیا اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان چلے گئے جہاں انھوں

نے ۱۹۲۱ء میں قانون کی ڈگری اور ۱۹۲۲ء میں بار ایٹ لا کیا۔ وطن واپس آ کر وہ یو پی منتقل ہو گئے۔

نوابزادہ لیاقت علی خان کو ۱۹۲۶ء میں یو پی لیجسلیٹو کونسل کا رکن منتخب کیا گیا۔ وہ چودہ برس اس کونسل کے رکن رہے جس میں چھ برس وہ ڈیموکریٹک پارٹی کے نائب صدر اور قائد رہے۔ ۱۹۴۰ء میں وہ سینٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے جہاں جلد ہی وہ مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے۔ اس سے قبل ۱۹۳۷ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اعزازی سیکریٹری کی حیثیت سے منتخب ہو چکے تھے۔

قائدِاعظم محمد علی جناح ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور انھیں اپنا "دایاں ہاتھ" قرار دیتے تھے۔۔۔۔ لیاقت علی خان کی صلاحیتیں اس وقت کھُل کر سامنے آئیں جب وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں فنانس ممبر کی حیثیت سے اپنے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس عہدے پر اُن کا فائز ہونا ہی اُن کی ایک بڑی کامیابی تھی۔ اپنے بیس سالہ پارلیمانی تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے جو بجٹ قوم کے سامنے پیش کیا اس کی دوستوں کے علاوہ مخالفوں نے بھی تعریف کی۔ اس بجٹ کو "غریب آدمی کا بجٹ" قرار دیا گیا۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا اور لیاقت علی خان اس کے پہلے وزیرِاعظم منتخب ہوئے قائدِاعظم کے انتقال کے بعد ان کی ذمّہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ نئی مملکت کو قائم و دائم رکھنے کے لیے لیاقت علی خان نے دن رات محنت کی۔

اپنے دورِ وزارت میں ایک بار وہ امریکہ کے دورے پر گئے، جہاں انھوں نے نہایت جرأت کے ساتھ پاکستان کے مؤقف کی وضاحت کی۔ انھوں نے جس استقامت سے پاکستان کے لیے کام کیا اس کی نظیر ملنا مُشکل ہے۔ ایک نوزائیدہ مملکت کی ترقی و تعمیر کے لیے ان کی بے پناہ خدمات دشمنوں کو ایک آنکھ نہ بھائی جس کے بعد ان کے خلاف ایک سازش تیاّر کی گئی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی کے ایک جلسے میں تقریر کے دوران ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ انھوں نے خطاب کے لیے کھڑے ہو کر ابھی "برادرانِ ملّت" کے الفاظ ہی ادا کیے تھے کہ سامنے کی صف میں بیٹھے ہوئے ایک شخص سید اکبر نے ان پر فائر کر دیا۔ گولی ان کے سینے میں پیوست ہوئی۔ پاکستان سے ان کی محبّت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ آخری لمحوں میں بھی شہیدِ ملّت کی زبان سے یہی الفاظ ادا ہوئے۔

"خُدا پاکستان کی حفاظت کرے"

مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کے لیے ایک بہترین تعلیمی ادارے کی صورت میں جو چراغ سرسیّد نے جلایا اسی سے روشنی پا کر لیاقت علی خان نے بھی اپنے لہُو سے آزادی کے چراغ کو روشن کیا۔ اب یہ ہمارا اور آپ کا فرض ہے کہ اس چراغ کی حفاظت کریں۔ اسے روشن رکھیں۔

ورلڈ کپ کب، کہاں، کن کے درمیان!

پول اے:۔ بھارت — آسٹریلیا — نیوزی لینڈ — زمبابوے

پول بی:۔ پاکستان — ویسٹ انڈیز — برطانیہ — سری لنکا

بھارت میں کھیلے جانے والے، میچوں کا شیڈول (بشمول ۳ میچ پول بی)

تاریخ		ٹیم بمقابلہ ٹیم	مقام
۹	اکتوبر	بھارت بمقابلہ آسٹریلیا	مدراس
۱۰	اکتوبر	نیوزی لینڈ بمقابلہ زمبابوے	حیدرآباد
۱۳	اکتوبر	آسٹریلیا بمقابلہ زمبابوے	مدراس
۱۴	اکتوبر	بھارت بمقابلہ نیوزی لینڈ	بنگلور
۱۷	اکتوبر	بھارت بمقابلہ زمبابوے	بمبئی
۱۸	اکتوبر	آسٹریلیا بمقابلہ نیوزی لینڈ	اندور
۲۱	اکتوبر	ویسٹ انڈیز بمقابلہ سری لنکا	کانپور (پول بی)
۲۲	اکتوبر	بھارت بمقابلہ آسٹریلیا	نئی دہلی
۲۳	اکتوبر	نیوزی لینڈ بمقابلہ زمبابوے	کلکتہ
۲۶	اکتوبر	بھارت بمقابلہ زمبابوے	احمدآباد
۲۶	اکتوبر	برطانیہ بمقابلہ ویسٹ انڈیز	جے پور (پول بی)
۲۷	اکتوبر	آسٹریلیا بمقابلہ نیوزی لینڈ	چنڈی گڑھ
۳۰	اکتوبر	آسٹریلیا بمقابلہ زمبابوے	کٹک
۳۰	اکتوبر	برطانیہ بمقابلہ سری لنکا	پونہ (پول بی)
۳۱	اکتوبر	بھارت بمقابلہ نیوزی لینڈ	ناگپور
۵	نومبر	سیمی فائنل	بمبئی
۸	نومبر	فائنل	کلکتہ

میچوں کے اوقات (بھارت کے معیاری وقت کے مطابق)

پہلا سیشن ۹ بجے صبح تا ۱۲ بجکر ۳۵ منٹ

لنچ ۱۲ بجکر ۳۵ منٹ تا ایک بجکر ۱۵ منٹ

دوسرا سیشن ایک بجکر ۱۵ منٹ تا ۴ بجکر ۵۰ منٹ

پاکستان میں کھیلے جانے والے ۱۰ میچوں کا شیڈول

تاریخ	ٹیم مقابلہ	مقام
۸ اکتوبر ۸۷ء	پاکستان بمقابلہ سری لنکا	حیدرآباد
۹ اکتوبر	ویسٹ انڈیز بمقابلہ برطانیہ	گجرانوالہ
۱۲ اکتوبر	پاکستان بمقابلہ برطانیہ	راولپنڈی
۱۳ اکتوبر	سری لنکا بمقابلہ ویسٹ انڈیز	کراچی
۱۶ اکتوبر	پاکستان بمقابلہ ویسٹ انڈیز	لاہور
۱۷ اکتوبر	برطانیہ بمقابلہ سری لنکا	پشاور
۲۰ اکتوبر	پاکستان بمقابلہ برطانیہ	کراچی
۲۵ اکتوبر	پاکستان بمقابلہ سری لنکا	فیصل آباد
۳۰ اکتوبر	پاکستان بمقابلہ ویسٹ انڈیز	کراچی
۴ نومبر ۸۷ء	سیمی فائنل	لاہور

میچوں کے اوقات (پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق)

پہلا سیشن: ۹ بجے صبح تا ۱۲ بجکر ۳۵ منٹ

وقفہ برائے لنچ: ۱۲ بجکر ۳۵ منٹ تا ایک بجکر ۱۵ منٹ پر

دوسرا سیشن: ایک بجکر ۱۵ منٹ تا ۵ بجکر ۵۰ منٹ

لطف - لذّت - ذائقہ
ہوئیسٹ ®
ڈراپس
گلے کی خراش میں
بیحد مفید
گلے میں خراش - ہوئیسٹ کی تلاش
اور سب ٹھنڈا ٹھنڈا
450 GRAMS
HOEST® DROPS
delicious
cool
refreshing
TIPOO ENTERPRISES FAISALABAD
MASS

عبدالقادر

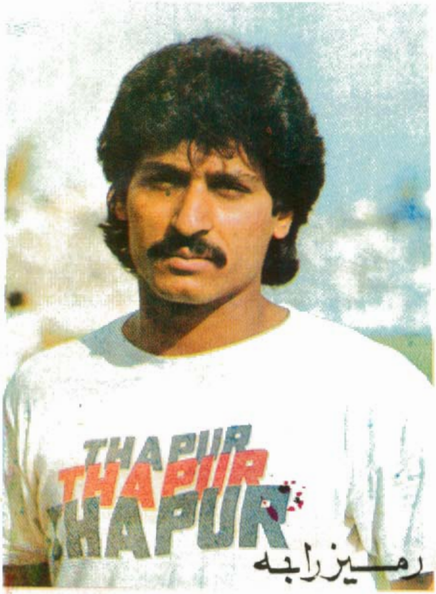

رمیز راجہ

وسیم اکرم

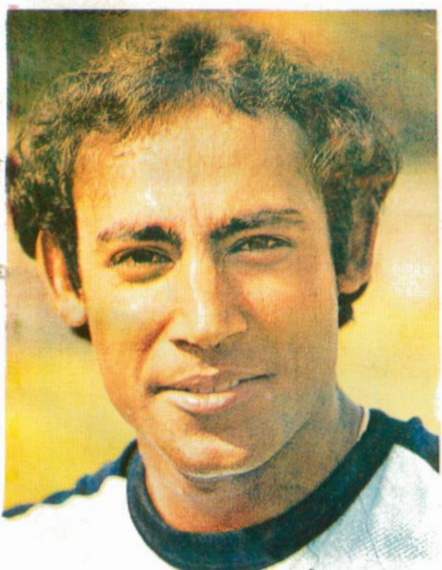

مدثر نذر

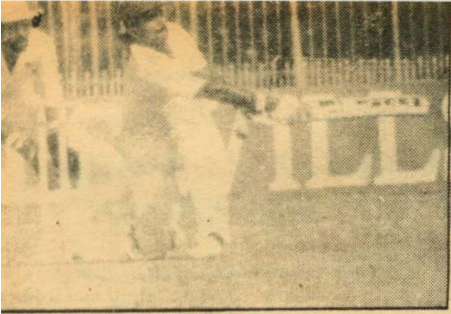

پاکستان ورلڈکپ جیت جائے گا

ایک خواب جو حقیقت بننے والا ھے

علی واصف

برِصغیر کے کرکٹ میدانوں میں ۸ اکتوبر سے کھیلا جانے والا چوتھا ریلائنس ورلڈ کپ کرکٹ ٹورنامنٹ کئی اعتبار سے منفرد ہوگا اس کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ پہلی بار ورلڈ کپ انگلستان سے باہر نکلا ہے ورگرنہ پہلے تینوں ورلڈ کپ انگلستان کے میدانوں میں کھیلے گئے تھے۔

اس بار اگرچہ پاکستان ایک سخت گروپ میں ہے جس میں ویسٹ انڈیز اور انگلستان جیسی ٹیمیں شامل ہیں جبکہ بھارت آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ دوسرے گروپ میں ہیں اس کے باوجود پاکستانی کھلاڑیوں کے حوصلے بلند ہیں اور وہ پُرامید ہیں کیونکہ یہ ورلڈ کپ خود اپنے میدانوں میں کھیلا جارہا ہے لہٰذا قوی امکان اس بات کا ہے کہ پاکستانی ٹیم عمران خان کی قیادت میں چوتھا ورلڈ کپ جیت لے گی۔

تاہم کرکٹ خاصا غیر یقینی کھیل ہے اور خاص طور پر ایک روزہ میچ میں یہ بات خاصی اہم ہوتی ہے کہ کونسی ٹیم ٹاس جیتتی ہے۔ کیونکہ ٹاس جیتنے والی ٹیم کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔

عام خیال ہے کہ ایک گروپ سے پاکستان اور ویسٹ انڈیز جبکہ دوسرے گروپ سے بھارت اور آسٹریلیا ہی فائنل میں آئیں گی اگر پاکستان کا مقابلہ آسٹریلیا سے جبکہ بھارت کا سامنا ویسٹ انڈیز سے ہوگا۔ لہٰذا عین ممکن ہے یہی فائنل میچ پاکستان اور بھارت کے درمیان کھیلا جائے۔ لیکن سب کچھ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انگلستان اور ویسٹ انڈیز ہی فائنل میں پہنچ جائیں جبکہ پاکستان اور بھارت کی ٹیمیں منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی کٹ جائیں۔ کرکٹ

میں کوئی بات بھی رونما ہوسکتی ہے۔

بہرکیف کپتان عمران خان نے جو حال ہی میں بھارت اور انگلستان کو خود ان کی سرزمین پر ہرانے کے تاریخی کارہائے نمایاں انجام دے کر فارغ ہوتے ہیں یہ عزم کر رکھا ہے کہ وہ ورلڈکپ بھی جیتنے کا کارنامہ انجام دیں گے۔

عمران کے ساتھی بھی اپنے کپتان کے اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے بیتاب ہیں ان میں یہ سنگ میل چھو لینے کی سکت اور صلاحیت بھی ہے اور ان کا عزم بھی خاصا مُصمّم ہے۔

اتفاق سے پاکستان نے ہمیشہ ایک پسندیدہ ٹیم کے طور پر ورلڈکپ میں قدم رکھا ہے جب ۱۹۷۵ء میں پہلا ورلڈکپ ہوا تھا تو پاکستان کے پاس مشتاق محمد، ماجد خان، آصف اقبال، صادق اور سرفراز نواز جیسے جغادری کھلاڑی موجود تھے مگر سخت مقابلے کے بعد پاکستان پہلے آسٹریلیا سے اور پھر بڑے سنسنی خیز انداز میں ویسٹ انڈیز سے ہارا۔

۱۹۷۹ء میں بھی پاکستانی ٹیم اتنی ہی اچھی اور پسندیدہ تھی۔ پول اے میں میزبان انگلستان کے علاوہ پاکستان کو آسٹریلیا اور کینیڈا سے کھیلنا تھا جبکہ پول بی میں ویسٹ انڈیز نیوزی لینڈ بھارت اور سری لنکا کی ٹیمیں شامل تھیں پہلے میچ میں جیسا کہ توقع تھی پاکستان نے کینیڈا کو آٹھ وکٹوں سے ہرادیا۔

دوسرے میچ میں جو آسٹریلیا کے خلاف کھیلا گیا پاکستان کی طرف سے آصف اقبال، ماجد خان اور جاوید میانداد نے اچھی بیٹنگ کی اور پاکستان نے سات وکٹوں کے نقصان سے ۲۸۶ رنز بنائے۔ آصف اور ماجد نے بولنگ بھی اچھی کی اور سکندر بخت کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اس طرح یہ میچ پاکستان نے بالآخر ۸۹ رنز سے جیت لیا۔

ادھر انگلستان نے بھی اپنے دونوں میچ جیت لئے تھے اس لئے جب پاکستان اور انگلستان کا آمنا سامنا ہوا تو دونوں کے آٹھ پوائنٹس تھے انگلستان نے بمشکل تمام ۱۶۵ رنز بنائے اور فتح پاکستان کھلاڑیوں کو سامنے نظر آنے لگی لیکن جب پاکستان کا اسکور ۲۷ رنز کوئی آؤٹ نہیں سے یک بیک ۳۴ رنز چھ آؤٹ ہوا تو پاکستانی کھلاڑیوں کے ہوش اڑ گئے اس وقت آصف اقبال، وسیم راجہ اور عمران خان نے ٹیم کو سنبھالا دیا اس کے باوجود پاکستان یہ میچ سنسنی خیز انداز میں ۱۴ رنز سے ہار گیا۔

اس کے بعد پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان سیمی فائنل کھیلا گیا۔

ویسٹ انڈیز نے اچھی بیٹنگ کرتے ہوئے ساٹھ اوورز میں ۲۹۳ رنز بنائے صادق کے بہت جلدی آؤٹ ہوجانے کے بعد ظہیر عباس اور ماجد خان نے اچھا کھیلنا شروع کیا کامیابی قریب نظر آنے لگی۔ ایک موقع پر پاکستان کو ۱۱۸ رنز بنانے تھے۔ اور کافی اوورز اور نو وکٹیں باقی تھیں مگر پھر جیسے بھونچال سا آگیا اور پوری ٹیم ۵۰ اوورز میں ڈھائی سو رنز بنا کر آؤٹ ہوگئی۔

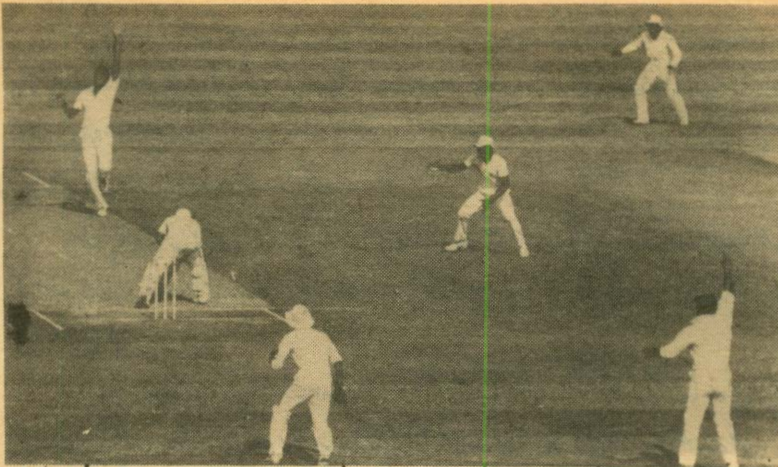

۱۹۸۳ء کا ورلڈ کپ پاکستان نے اس بدنصیبی کے ساتھ کھیلنا شروع کیا کہ عمران خان عین وقت پر زخمی ہو گئے۔

پہلے میچ میں پاکستان نے سری لنکا کے خلاف ۳۳۸ رنز بنا کر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا اور میچ بھی جیت لیا۔ پاکستان نے اگلا میچ نیوزی لینڈ سے کھیلا جو عبدالقادر کی آل راؤنڈ کارکردگی کے باعث یاد رکھا جائے گا۔ مگر ان کی کارکردگی بھی پاکستان کو نیوزی لینڈ کے خلاف شکست سے نہ بچا سکی۔ اس کے بعد پاکستانی ٹیم انگلستان سے بھی ہار گئی۔

پہلی مرتبہ ورلڈ کپ ڈبل لیگ سسٹم پر کھیلا جا رہا تھا لہٰذا پاکستان کو اپنی کارکردگی بہتر بنانے کا ایک اور موقع ملا۔ پاکستان کا سامنا سری لنکا سے ہوا اور آخر میں عبدالقادر کی عمدہ بولنگ نے پاکستان کو یہ میچ جتا دیا۔

پاکستان جب دوسری بار انگلستان سے کھیلا تو اس کی کارکردگی اگرچہ بہتر تھی مگر اس کے باوجود وہ شکست کھا گیا۔ اسی دوران سری لنکا نے نیوزی لینڈ کو ہرا دیا تھا اور پاکستان کے لیے کچھ امکانات پیدا ہو چکے تھے اس لئے نیوزی لینڈ سے پاکستان کا میچ خاصی اہمیت اختیار کر گیا۔ یہ میچ پاکستانی کھلاڑیوں نے پوری جان لڑا کر سنسنی خیز انداز میں ۱۱ رنز سے جیت لیا۔ ایک بار پھر ویسٹ انڈیز کا دیو سیمی فائنل میں پاکستان کے سامنے کھڑا تھا۔

پاکستانی کھلاڑی بمشکل ۱۸۵ رنز بنا سکے اور یہ ٹارگٹ ویسٹ انڈیز نے آسانی سے پورا کر دیا۔ تاہم ویسٹ انڈیز کی ٹیم جس نے ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۹ء کے ورلڈ کپ جیت رکھے تھے ہیٹ ٹرک نہ کر سکی اور ۱۹۸۳ء کے فائنل میں بھارت سے ہار گئی۔

ورلڈ کپ میں قائم ہونے والے ریکارڈز پہ نظر

اب تک ورلڈ کپ میں سب سے زیادہ رن بنانے کا ریکارڈ پاکستان کا ہے۔ پاکستانی ٹیم نے یہ ریکارڈ سری لنکا کے خلاف ۱۹۸۳ میں ۳۸۸ رنز بنا کر قائم کیا تھا۔ جبکہ سب سے کم اسکور کا ریکارڈ کینیڈا کا ہے جس نے انگلستان کے خلاف صرف ۴۵ رنز بنائے تھے۔

اگرچہ ایک روزہ کرکٹ تیز بولروں کا کھیل ہے لیکن ورلڈ کپ میں سب سے اچھی بولنگ کا ریکارڈ ایک اسپنر کا ہے۔ یہ اسپنر بھارت کے سابق کپتان بِشن سنگھ بیدی کا ہے جنہوں نے ۱۹۷۵ء کے پہلے ورلڈ کپ میں ہیڈ نگلے گراؤنڈ پر مشرقی افریقہ کے خلاف بارہ اوورز پھینکے تھے جن میں سے آٹھ میڈن تھے اور انھوں نے صرف چھ رنز دے کر ایک وکٹ لے لی تھی۔ وہ بہت ہی کم رنز دینے پر بہترین بولر قرار دیئے گئے۔

بھارتی کپتان کپیل دیو کے پاس جن کی قیادت میں بھارتی ٹیم نے ۱۹۸۳ء کے ورلڈ کپ میں تاریخی کامیابی حاصل کی تھی سب سے زیادہ یعنی ۱۷۵ اسکور کرنے کا ریکارڈ ہے یہ اسکور انہوں نے ۱۹۸۳ء میں ٹرن برج ویلز کے میدان میں زمبابوے کے خلاف کیا تھا۔

اب تک سب سے زیادہ یعنی ۶۲۶ رنز ۱۹۸۳ء میں سوان سی میں پاکستان اور سری لنکا کے میچ میں بنے ہیں جس میں پاکستان نے پانچ وکٹوں کے نقصان پر ۳۳۸ رنز بنائے تھے جبکہ سری لنکا نے نو وکٹوں کے عوض ۲۸۸ رنز اسکور کئے تھے۔

سب سے کم رنز ۱۹۸۳ء میں اولڈ ٹریفورڈ گراؤنڈ پر بنے جہاں کینیڈا کے کھلاڑی انگلستان کے خلاف صرف ۴۵ رنز پر آؤٹ ہو گئے اور جواب میں انگلستان کی ٹیم نے دو وکٹوں کے نقصان پر ۴۶ رنز بنائے۔

سب سے زیادہ بیٹنگ کا اوسط اب تک انگلستان کے ڈیوڈ گاور کا رہا ہے جنہوں نے ۱۹۸۳ء میں ۷۶ اعشاریہ ۸۰ رنز کی اوسط سے ۳۸۴ رنز بنائے۔

جہاں تک ورلڈ کپ کی بڑی کامیابیوں کا تعلق ہے بھارت نے ۱۹۷۵ء میں ہیڈ نگلے میں مشرقی افریقہ کو دس وکٹوں سے ہرایا تھا۔ اِسی سال انگلستان نے لارڈز میں بھارت کو ۲۰۲ رنز سے شکست دی تھی اور ویسٹ انڈیز نے ۱۹۸۳ میں زمبابوے کو دس وکٹوں سے ہرایا تھا۔

بہت کم اسکور سے ایک کامیابی ویسٹ انڈیز کے حصّے میں آئی جس نے ۱۹۷۵ء میں ایجباسٹن میں پاکستان کو ایک وکٹ سے شکست دی اور انگلستان نے ۱۹۷۹ء میں اولڈ ٹریفورڈ میں نیوزی لینڈ کو صرف نو رنز سے ہرایا۔

زیادہ وکٹوں کے لحاظ سے سب سے اچھی بولنگ ویسٹ انڈیز کے ونسٹن ڈیوس نے کی جنہوں نے ۱۹۸۳ میں ہیڈ نگلے میں آسٹریلیا کے خلاف ۵۱ رنز دیکر سات وکٹیں لیں۔

اب تک کی سب سے مہنگی بولنگ نیوزی لینڈ کے ایم سی اسٹیڈن کی رہی ہے جنہوں نے ۱۹۸۳ء میں اوول میں بارہ اووروں میں ایک سو پانچ رنز دیئے تھے۔

جہاں تک سب سے زیادہ کیچز لینے کا تعلق ہے۔ ویسٹ انڈیز کے کلائیو لائیڈ نے ۱۹۷۵ میں اولڈ ٹریفورڈ میں سری لنکا کے خلاف تین کیچ لئے تھے۔

امید ہے جب تک اکتوبر میں چوتھا ورلڈ کپ کھیلا جائے گا تو ان میں سے بہت سے ریکارڈز تبدیل ہو جائیں گے۔

عبدالشکور

ورلڈ کپ سنسنی خیز مقابلہ

ایک جائزہ

آج سے تقریباً سترہ برس قبل شروع ہونے والی ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ اب کرکٹ کا لازمی حصّہ بن چکی ہے۔ کرکٹ کے شائقین نے محدود اوورز کے میچز کو بہت جلد ہی ذہنی طور پر قبول کیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پانچ روز کی روایتی کرکٹ کے مقابلے میں محدود اوورز کے میچز لوگوں میں زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہر حال میں فیصلہ کُن ثابت ہوتے ہیں۔

ان دنوں کرکٹ کے حلقوں میں موضوعِ بحث چوتھا عالمی کپ کرکٹ ٹورنامنٹ ہے جو پاکستان اور بھارت میں مشترکہ طور پر منعقد ہو رہا ہے۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ عالمی کپ کے مقابلے انگلستان سے باہر نکلے ہیں۔ اس سے قبل تینوں عالمی کپ ٹورنامنٹ انگلستان میں منعقد ہوئے تھے۔

جوں جوں عالمی کپ کرکٹ ٹورنامنٹ کا وقت قریب آرہا ہے۔ شائقین کی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے۔ عالمی کپ کے زیادہ تر میچز بھارت میں کھیلے جائیں گے۔ جہاں سترہ میچز ہوں گے۔ ان سترہ میچز میں ایک سیمی فائنل اور فائنل بھی شامل ہے۔ فائنل کلکتہ کے ایڈن گارڈن میں ۹ نومبر کو کھیلا جائے گا۔ بھارت میں کھیلے جانے والے سترہ میچز میں سے ۳ میچز پول بی کے بھی ہیں۔ پول اے میں بھارت، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور زمبابوے شامل ہیں اس کے برعکس پول بی زیادہ مشکل ہے کیونکہ اس پول میں ویسٹ انڈیز، انگلستان اور سری لنکا کے علاوہ میزبان پاکستان شامل ہیں۔ پاکستان میں ایک سیمی فائنل سمیت دس میچز کھیلے جائیں گے۔

عالمی کپ کے سینٹرز میں کراچی وہ واحد سینٹر ہے جہاں تین میچز رکھے گئے ہیں۔ دیگر سینٹرز پر ایک یا دو میچز ہی کھیلے جائیں گے۔

چوتھے عالمی کپ کرکٹ ٹورنامنٹ کے حوالے سے اس وقت سب سے اہم بات متعدد کھلاڑیوں کا اس ٹورنامنٹ میں حصّہ نہ لینا ہے۔ انگلستان کے ڈیوڈ گاور، ایان بوتھم، ویسٹ انڈیز کے میلکم مارشل ڈیسمنڈ ہینز اور جوئیل گارنر اور نیوزی لینڈ کے رچرڈ ہیڈلی، ورلڈ کپ میں کھیلنے سے معذوری ظاہر کرچکے

ہیں ۔ یہ سب ایسے کھلاڑی ہیں جن کی کشش تماشائیوں کو گراؤنڈ کی طرف کھینچ لاتی ہے ۔ خصوصاً میلکم مارشل ہیڈلی اور بوتھم کو شائقین دیکھنا چاہتے تھے یقیناً انھیں سخت مایوسی ہوگی ۔

میلکم مارشل ، ڈیسمنڈ ہینز اور جوئیل گارنر کے نہ ہونے سے ویسٹ انڈیز کی ٹیم سب سے زیادہ متاثر ہوگی ۔ خاص کر مارشل اور گارنر کی عدم موجودگی میں دوسری ٹیمیں سکون کا سانس لیں گی ۔ کیونکہ یہ دونوں دورِ حاضر کے صفِ اوّل کے بولرز ہیں اور محدود اوورز کی کرکٹ میں انتہائی کامیاب رہے ہیں ۔ جوئیل گارنر جو کرکٹ کی دنیا میں "بگ برڈ" کے نام سے مشہور ہیں ۔ ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں سب سے زیادہ وکٹیں حاصل کرنے والے بولر ہیں ۔ انھوں نے ۱۴۶ وکٹیں صرف ۱۸٫۸۴ کی اوسط سے حاصل کی ہیں جبکہ میلکم مارشل کی ون ڈے انٹرنیشنل میچوں میں حاصل کردہ وکٹوں کی تعداد ۱۱۱ رہی ہے ۔

مائیکل ہولڈنگ کی ریٹائرمنٹ ، میلکم مارشل اور گارنر کی عدم شرکت سے اب بولنگ کے شعبے میں زیادہ تر بوجھ انتھونی گرے اور کورٹنی اولش پر ہوگا ۔

نیوزی لینڈ کی ٹیم کی کارکردگی بھی رچرڈ ہیڈلی کے بغیر بے حد متاثر ہوگی ۔ جن کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ نیوزی لینڈ کے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنا چاول چینی قوم اور بیئر آسٹریلویوں کے لیے ضروری ہیں ۔ اسی طرح ایان بوتھم اور ڈیوڈ گاور کے نہ کھیلنے سے مائیک گیٹنگ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ۔

بوتھم گاور، ہیڈلی اور تین ویسٹ انڈین کھلاڑیوں کے نہ ہونے سے کیا تماشائیوں کی دلچسپی کم نہیں ہوگی؟ اس بارے میں ابھی سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ عالمی کپ میں مشہور کھلاڑی شرکت نہیں کر رہے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں بھی ایسا ہی ہوا تھا جب گریگ چیپل، ایان چیپل، راڈنی مارش اور ڈینس للّی جیسے شہرت یافتہ کرکٹرز نہیں کھیلے تھے مگر اس کا عالمی کپ پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ مارشل، ہیڈلی اور دیگر کھلاڑیوں کے نہ آنے سے شائقین کو مایوسی ہوئی ہے لیکن جو دوسرے کھلاڑی آ رہے ہیں اُن کی مقبولیت اور مقام سے انکار نہیں جیسے ویوین رچرڈز۔ گرینج، مارٹن کرو اور ایلن بورڈر۔ اگر ان کھلاڑیوں نے اپنی موجودہ فارم کو برقرار رکھا تو شائقین کو عمدہ کرکٹ دیکھنے کو ملے گی۔

اب آئیے عالمی کپ میں حصّہ لینے والی ٹیموں پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ کرکٹ کے مبصرین کے خیال میں عالمی کپ کے حصول کے لیے اصل مقابلہ ویسٹ انڈیز، پاکستان اور بھارت کے درمیان متوقع ہے۔

جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہ اس وقت عالمی چیمپئن ہے۔ حالیہ چند برسوں سے بھارتی ٹیم نے ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں انتہائی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس کا ثبوت تیسرا عالمی کپ، ورلڈ چیمپئن شپ آف کرکٹ۔ شارجہ کا چار قومی کرکٹ ٹورنامنٹ اور ایشیا کپ ہیں۔ بھارت کے پاس کپیل دیو۔ سری کانت گاواسکر، اظہرالدین اور دلیپ وینگسارکر جیسے کھلاڑی موجود ہیں۔

کپیل دیو ۱۰۵ ایک روزہ بین الاقوامی میچز میں بھارت کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ جن میں انھوں نے ایک سینچری اور ۱۱ نصف سینچریوں کی مدد سے ۲۱۰۸ رنز بنائے ہیں اور ۱۳۰ وکیٹیں بھی حاصل کی ہیں۔

کپیل دیو نے ۶۷ میچز میں ٹیم کی قیادت بھی کی ہے۔ جن میں سے ۳۴ جیتے ہیں۔ ان کی فتح کا تناسب ۵۲٫۲۳ فیصد بنتا ہے۔ یعنی وہ بھارت کے سب سے کامیاب کپتان ہیں۔ کیونکہ بھارت نے ۵۰ کامیابیوں میں سے ۳۴ ان کی کپتانی میں حاصل کی ہیں۔

آسٹریلیا سب سے زیادہ ایک روزہ بین الاقوامی میچز کھیلنے والا ملک ہے۔ اس نے ۱۷۵ میچز کھیلے ہیں جن میں سے ۸۰ جیتے ہیں۔ ۸۷ میں اُسے شکست ہوئی ہے اور ۱۰ غیر فیصلہ کن رہے۔ آسٹریلوی کپتان ایلن بورڈر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ ۱۵۱ میچز کھیلے ہیں۔ جن میں وہ تین سینچریوں اور ۲۶ نصف سینچریوں کی مدد سے ۳۹۵۲ رنز بنا چکے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت آسٹریلوی ٹیم میں کوئی بھی بولر ایسا نہیں ہے جس نے ۵۰ وکیٹیں حاصل کی ہوں۔

انگلستان نے ۱۳۵ میچز کھیلے ہیں جن میں سے ۷۳ میچز میں اس نے کامیابی حاصل کی ہے ۶۰

میچز میں اُسے شکست ہوئی ہے اور ۴ میچز نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکے ہیں۔

ون ڈے انٹرنیشنل میں نیوزی لینڈ کی کامیابیوں کا تناسب ۴۶،۸۷ فیصد بنتا ہے۔ نیوزی لینڈ نے ۱۱۲ میں سے ۴۹ میچز جیتے ہیں۔ نیوزی لینڈ کی ٹیم ہیڈلی کے نہ ہونے سے بولنگ میں اب چیٹفیلڈ پر زیادہ انحصار کرے گی۔ جبکہ بیٹنگ میں تمام دارومدار مارٹن کرو پر ہوگا۔

پاکستان نے ۱۲۹ ایک روزہ میچز کھیلے ہیں جن میں سے ۵۹ جیتے ہیں اور ۶۵ میں اُسے ناکامی ہوئی ہے بقیہ پانچ میچز کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکے ہیں۔ عمران خان کی قیادت میں پاکستان کی ٹیم کی کارکردگی بے حد شاندار رہی ہے۔ اگر ہمارے کھلاڑی عالمی کپ میں بھی ایسی ہی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسی انھوں نے انگلستان کے دورے میں دکھائی تھی تو پاکستان عالمی کپ جیت سکتا ہے۔ پاکستان کے پاس عمران خان جاوید میانداد، عبدالقادر، رمیز راجہ، وسیم اکرم اور سلیم یوسف جیسے کھلاڑی موجود ہیں۔ خاص کر جاوید میانداد اور عمران خان ایسے کھلاڑی ہیں جو کسی بھی لمحے کھیل کا نقشہ بدل سکتے ہیں۔ عمران خان عالمی کپ میں آخری بار ایکشن میں نظر آئیں گے۔

عالمی کپ میں شریک دیگر دو ٹیمیں زمبابوے اور سری لنکا ہیں۔ سری لنکا ٹیسٹ رکنیت حاصل کرنے والا آخری ملک ہے۔ مگر وہ اب تک ٹیسٹ رکنیت ملنے کا حق ادا نہیں کر سکا ہے تاہم ایک روزہ میچوں میں اس کی کارکردگی کسی حد تک بہتر رہی ہے۔ سری لنکا نے ویسٹ انڈیز کے سوا ہر ملک کے خلاف کامیابی حاصل کی ہے۔

زمبابوے کو ابھی تک ٹیسٹ رکنیت نہیں ملی ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ اگر آئندہ کسی ملک کو ٹیسٹ کھیلنے کی اجازت ملی تو وہ ملک زمبابوے ہی ہوگا۔ تیسرے عالمی کپ میں زمبابوے کے ناتجربہ کار کھلاڑیوں نے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

چوتھا عالمی کپ کرکٹ ٹورنامنٹ کون جیتے گا؟ کیا عمران خان اپنے الوداعی مقابلے کو ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیں گے؟

کیا کپل دیو اپنے اعزاز کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکیں گے؟

کیا ویوین رچرڈز اور اُن کے ساتھی ورلڈ کپ کو دوبارہ جزائرِ غربُ الھند لے جانے میں کامیاب ہو جائیں گے؟

کامیابی کس ٹیم کا مقدر بنے گی؟ شائقین کو ان تمام سوالات کا حتمی جواب ۹ نومبر کو مل جائے گا۔

گوروں کے دیس میں

جب ہم جیت گئے

علی نوری

پاکستانی کرکٹ ٹیم نے گذشتہ دنوں اپنے عالمی شہرت یافتہ آل راؤنڈر عمران خان کی قیادت میں انگلستان کا دورہ کیا جو تین ماہ سے زائد عرصہ پر محیط تھا۔ اس دورے میں انھوں نے تین روزہ فرسٹ کلاس میچ، تین ایک روزہ انٹرنیشنل اور پانچ ٹیسٹ میچوں کی سیریز کھیلی۔ ایک روزہ میچوں کی سیریز پاکستان سخت مقابلہ کے بعد ہار گیا۔ یعنی پاکستان نے ایک میچ جیتا اور انگلستان نے دو۔ لیکن ٹیسٹ سیریز میں پاکستان نے اولڈ ٹریفورڈ ٹیسٹ میں اننگز کی کامیابی کی بدولت انگلستان کو صفر۔ ا سے ہرا کر انگلستان کی سرزمین پر پہلی بار ٹیسٹ سیریز جیتنے کا اعزاز حاصل کیا۔ یہ اعزاز پاکستان نے دنیا کے بہترین آل راؤنڈر عمران خان کی قیادت میں حاصل کیا۔

آپ جانتے ہیں کہ اتحاد میں برکت ہے پاکستان کے کھلاڑیوں نے بھی جیت کے لیے اپنے کپتان عمران خان

کا پورا پورا ساتھ دیا خصوصاً نائب کپتان جاوید میاں داد، وکٹ کیپر سلیم یوسف، فاسٹ بولر وسیم اکرم، آل راؤنڈر مدثر نذر، بیٹسمین سلیم ملک، اسپنرز عبدالقادر اور توصیف احمد اور میڈیم فاسٹ بولر محسن کمال نے بہترین کھیل پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ ٹیم ورک ہو، جیت کا جذبہ اور وطن سے محبّت ہو تو دنیا کی بڑی سے بڑی ٹیم کو بھی شکست دی جا سکتی ہے اور جہاں ٹیم ورک اور عمدہ کارکردگی میں فرق آیا، اوّل ٹیسٹ میں پاکستان انگلستان کو فالوآن کرانے کے باوجود خراب فیلڈنگ کے باعث یقینی کامیابی سے محروم ہو گیا اور میچ ڈرا رہا۔

اس سیریز میں جہاں بعض اہم سنگِ میل عبور کیے گئے۔ وہیں پاکستان کے کپتان اور نائب کپتان نے دو اہم کارنامے انجام دیے۔ پہلا کارنامہ یہ کہ پاکستان کے کپتان عمران خان نے اسی سیریز کے دوران ٹیسٹ کرکٹ میں اپنی ۳۰۰ وکٹیں مکمل کر لیں۔ وہ یہ کارنامہ انجام دینے والے پاکستان کے پہلے، ایشیا کے دوسرے اور دُنیا کے آٹھویں بولر ہیں۔ عمران خان نے اب تک ٹیسٹ کرکٹ میں ۳۱۱ وکٹیں حاصل کی ہیں اور اُن کا فی وکٹ رنز دینے کا اوسط ۲۲ رنز سے بھی کم ہے۔ اُن کے علاوہ انگلستان کے این بوتھم، نیوزی لینڈ کے رچرڈ ہیڈلی، آسٹریلیا کے ڈینس للی، انگلستان کے باب وِلس، بھارت کے کپل دیو، ویسٹ انڈیز کے لانس گبز اور انگلستان کے فریڈی ٹرومین شامل ہیں۔ عمران خان نے ۷۰ ٹیسٹ کھیل ۳۱۱ وکٹیں لیں۔ جبکہ کپل دیو نے بھی ۳۱۱

عمران خان :- مقبول ترین کرکٹر

مدثرنذر :- غیر مقبول ترین کرکٹر

مقبول غیر مقبول کرکٹرز

ایک دلچسپ سروے

گزشتہ شمارے میں ہم نے "آنکھ مچولی" ساتھیوں کی قومی کرکٹرز کے بارے میں پسند وناپسند جاننے کے لئے ایک سروے کا اعلان کیا تھا. اور اس سلسلے میں سوالنامے کا کوپن بھی شائع کیا تھا. اس سروے میں بچوں نے نہایت جوش وخروش سے حصہ لیا. اور تقریباً ۲ہزار ۹۴۴ بچوں نے ملکی اور غیر ملکی کرکٹرز کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا. ہم نے کوپن بھیجنے والے بچوں کے نام شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اتنی بڑی تعداد میں نام شائع کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں اس لئے ہم اپنے پیارے ساتھیوں سے معذرت خواہ ہیں.

سروے کے نتائج کے مطابق بچوں کے مقبول ترین کرکٹر عمران خان اور سب سے غیر مقبول کرکٹر مدثر نذر ہیں عمران خان کو بچوں کی اکثریت نے ان کی شاندار اور جارحانہ بولنگ کی وجہ سے اپنا پسندیدہ کرکٹر قرار دیا جبکہ مدثر نذر سُست اور

غیر دلچسپ بیٹنگ کی وجہ سے بچوں کے غیر مقبول کرکٹر قرار پائے۔ نتائج کی مکمل تفصیلات درج ذیل ہیں۔

نمبر شمار	مقبول ترین کرکٹرز	مقبولیت کا اوسط
۱	عمران خان	۸۰ فیصد
۲	جاوید میاں داد	۷۰ فیصد
۳	وسیم اکرم	۱۶ فیصد
۴	منظور الٰہی ، سلیم ملک	۶.۶ فیصد
۵	رمیز راجہ ، عبدالقادر	۴.۴ فیصد
۶	ماجد خان ، سلیم یوسف	۳.۳ فیصد

نمبر شمار	غیر مقبول کرکٹرز	غیر مقبولیت کا اوسط
۱	مدثر نذر	۳۰ فیصد
۲	محسن حسن خان	۲۰ فیصد
۳	عمران خان	۱۵ فیصد
۴	قاسم عمر	۱۴ فیصد
۵	توصیف احمد	۱۳ فیصد
۶	عبدالقادر	۱۲ فیصد
۷	رضوان الزماں، یونس احمد	۱۰،۱۰ فیصد
۸	شعیب محمد	۵ فیصد
۹	منصور اختر، جاوید میانداد، محسن کمال	۴،۴،۴ فیصد
۱۰	سلیم جعفر ، سلیم یوسف	۳،۳ فیصد

وکٹیں حاصل کی ہیں، لیکن انھیں اس کے لیے ۸۸ ٹیسٹ کھیلنے پڑے۔

ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ وکٹیں این بوتھم نے ۳۷۳ حاصل کی ہیں، ہیڈلی اور للی نے ۳۵۵، باب وِلس نے ۳۲۵، گبز نے ۳۰۹ وکٹیں اور ٹرومین نے ۳۰۷ وکٹیں حاصل کی ہیں۔ ان میں سے للی، وِلس، گبز اور ٹرومین کا شمار صرف بولرز کے زمرے میں ہوتا ہے۔ جبکہ عمران خان، بوتھم، ہیڈلی اور کپل دیو آل راؤنڈرز یعنی بولرز اور بیٹسمین دونوں ہیں۔ بوتھم نے پاکستان کے خلاف آخری یعنی اوول ٹیسٹ میں اپنے ۵ ہزار رنز بھی مکمل کر لیے۔

اوول کا ذکر آیا ہے تو آیئے اُس بیٹسمین کا ذکر کیا جائے جس نے اس گراؤنڈ پر اپنے چھ ہزار ٹیسٹ رنز مکمل کیے۔ یہ ہیں دنیا کے صفِ اوّل کے پاکستانی اسٹار بیٹسمین جاوید میاں داد جنھوں نے اپنی شاندار ۲۶۰ رنز کی اننگز کی بدولت ٹیسٹ کرکٹ میں چھ ہزار رنز پورے کیے۔ یہ اُن کے کیریئر کی پندرھویں ٹیسٹ سنچری تھی۔ وہ پاکستان کے پہلے بیٹسمین ہیں جنھوں نے ٹیسٹ کرکٹ میں چھ ہزار رنز بنائے۔ جبکہ ایشیا میں اس سے قبل گاواسکر اور وِشواناتھ بھارت کی طرف سے یہ کارنامہ انجام دے چکے ہیں۔ جبکہ چھ ہزار ٹیسٹ رنز مکمل کرنے والے وہ دنیا کے ۱۷ ویں بیٹسمین ہیں۔ انھوں نے ۸۶ ٹیسٹ کھیل کر چھ ہزار رنز مکمل کیے۔

اسی گراؤنڈ پر پاکستان نے اپنی پہلی اننگز میں ۷۰۸ رنز اسکور کیے جو ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کا چھٹا بڑا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد کیا جانے والا سب سے بڑا اسکور ہے۔ جس میں جاوید میاں داد، سلیم ملک اور عمران خان نے سنچریاں بنائیں۔ ان تینوں کھلاڑیوں نے پہلی بار انگلستان کے خلاف سنچری بنانے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ سلیم ملک اور میاں داد نے اوول ٹیسٹ میں ۲۳۴ رنز کی شراکت کی جو انگلستان کے خلاف کسی بھی وکٹ کی شراکت کا زیادہ سے زیادہ رنز کا ریکارڈ ہے۔

یہ تو رہے اس سیریز کے اہم سنگِ میل جو پاکستان کے کرکٹرز نے اپنے شاندار کھیل کی بدولت طے کیے۔ باقی اہم واقعات جو سیریز کے دوران ہوئے اور جو ریکارڈ مرتب ہوئے اُن میں پاکستان کے فاسٹ بولر وسیم اکرم نے انگلستان کے ممتاز بیٹسمین ڈیوڈ گاور کو آؤٹ کر کے ٹیسٹ کرکٹ میں اپنی ۵۰ وکٹیں مکمل کر لیں وہ یہ کارنامہ انجام دینے والے ۱۸ ویں پاکستانی بولر ہیں۔ سیریز کے اختتام تک ان کی مجموعی وکٹوں کی تعداد چونسٹھ رہی۔

انگلستان کے اوپنر بیل ایتھی نے لارڈز میں کھیلے گئے دوسرے ٹیسٹ میں اپنے کیریئر کی پہلی ٹیسٹ سنچری اسکور کی۔ جو یقیناً ان کا زیادہ سے زیادہ اسکور بھی ہے۔

اللہ ... مجھے ان لوگوں سے کرنے ... بم نوچ

دنیا بھر کے کرکٹروں نے انجم بات یہ مانی ہے
پاکستانی کرکٹروں کی بولنگ بیٹنگ لاثانی ہے

پاکستان کے کپتان عمران خان نے تیسرے ٹیسٹ میں ۵ ویں بار میچ میں ۱۰ ر وکٹیں حاصل کر کے فضل محمود کا چار بار کا ریکارڈ توڑ دیا۔ اسی ٹیسٹ کی دوسری اننگز میں عمران نے ۴۰ رنز دے کر ۷ وکٹیں لیں جو بیرونِ ملک ان کی بہترین بولنگ ہے۔

بیرون ملک مقیم پاکستانی

فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹس

کی

مقبولیت پر غور فرمائیے

یکم اگست ۱۹۸۵ء سے ۳۰ جون ۱۹۸۷ء تک ان کی فروخت ۶۷۹ کروڑ روپے سے زیادہ ہو چکی ہے

اسی مدت کے دوران ۳۳۱ کروڑ روپے سے زیادہ کے سرٹیفکیٹس بھنائے بھی گئے

اپنا فاضل زرِ مبادلہ ان سرٹیفکیٹس میں لگائیے
گھر بیٹھے سب سے زیادہ منافع کمائیے

ان سرٹیفکیٹس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ان فوائد کو غور سے دیکھیں۔

● پاکستان یا پاکستان سے باہر نامزد اجرائی مراکز سے کوئی بھی شخص کسی بھی وقت زرِ مبادلہ کے عوض خرید سکتا ہے ● خریدار کا نام درج کرنے یا ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ● منتقلی کسی تحریری کارروائی کے بغیر ● جس کی تحویل اسی کی ملکیت ● ان کے منافع پر پاکستان میں انکم ٹیکس معاف — دولت ٹیکس معاف ● پاکستانی بینکوں میں ضمانت کے طور پر قابلِ قبول ● ہر سطح پر مکمل رازداری ● زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی سے استثنیٰ ● پاکستان میں کسی بھی وقت اجرائی مراکز سے زرِ مبادلہ یا پاکستانی روپے میں مع منافع اور پاکستان سے باہر اجرائی مراکز سے زرِ مبادلہ میں مع منافع بھنائے جا سکتے ہیں ● پاکستان میں بھنائی ہوئی رقم زرِ مبادلہ میں پاکستان سے باہر کسی کو بھی ارسال کی جا سکتی ہے ● ان میں سرمایہ کاری کے وسائل پر پاکستان کے ٹیکس حکام کوئی سوال یا تفتیش نہیں کریں گے۔

منافع ایک سال کے بعد ہر ۱۰۰ روپے پر ½ ۱۴ روپے، دو سال کے بعد ۳۱ روپے اور تین سال کے بعد ۵۲ روپے۔

ان کی بھنائی ہوئی رقم سے پاکستان میں ٹریولرز چیکس خریدنے کی اجازت

بیرونِ ملک مقیم جو خریدار یہ سرٹیفکیٹس پاکستان کے اجرائی مراکز سے خریدنا چاہتے ہیں وہ زرِ مبادلہ پاکستان میں کسی نامزد اجرائی مرکز (Office of Issue) یعنی متعلقہ بینک برانچ کے نام بھیجتے وقت یہ صراحت کر دیں کہ یہ رقم انکی طرف سے صرف یہ سرٹیفکیٹس خریدنے کے لئے بھیجی جا رہی ہے۔ پاکستان میں عام زرِ مبادلہ وصول کرنے والے صرف اس بنا پر یہ سرٹیفکیٹس نہیں خرید سکتے کہ اُن کے نام زرِ مبادلہ آیا ہے۔

اجرائی مراکز: مملکت سعودی عرب میں بینک الجزیرہ کی شاخیں، برطانیہ، امریکہ، عرب امارات، ہانگ کانگ میں پاکستانی بینکوں کی نامزد شاخیں، زیورک، سوئٹزرلینڈ میں یونائیٹڈ بینک اے۔ جی اور پاکستان میں پاکستانی اور غیر ملکی بینکوں کی نامزد شاخیں۔ ان کے نام اور پتے تمام پاکستانی بینکوں کی شاخوں اور پاکستان کے سفارتی دفاتر میں دستیاب ہیں۔

بچت محفوظ، منافع بڑا اور یقینی

وزارتِ خزانہ
حکومتِ پاکستان

PID (Islamabad) MF-PBC-U-6-87

manhattan International

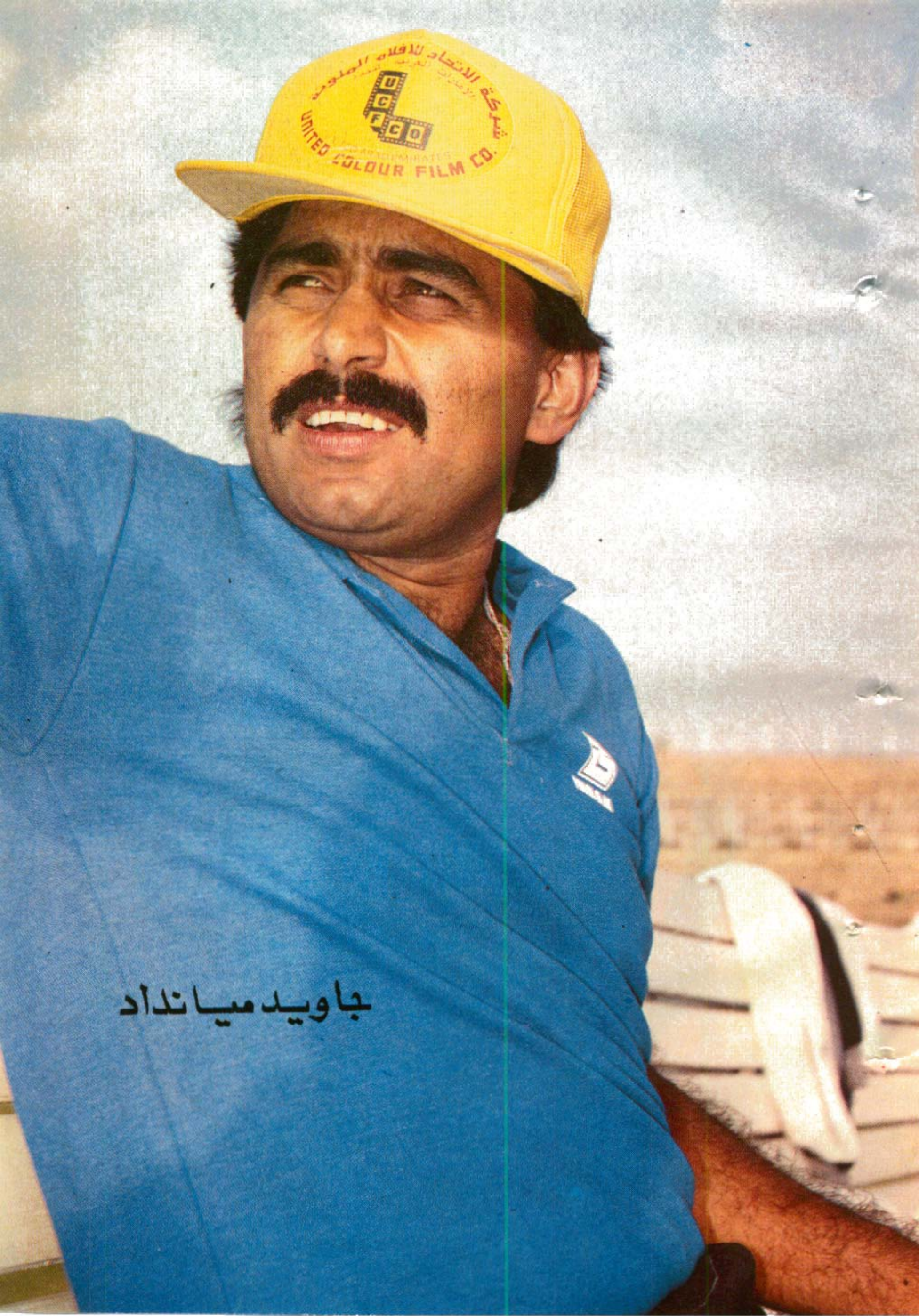

جاوید میانداد

عمران خان

مقبولیت کے اسباب

عمران خان

بولنگ بہت اچھی کرتے ہیں۔ (اکثریت کا جواب) کامیاب اور جارحانہ انداز کے آل راؤنڈر۔ اچھے کپتان ہیں۔ ان کی خوبصورت شخصیت ۔موقعے کی مناسبت سے بہتر حکمت عملی اختیار کرنے کی صلاحیت، بہترین عالمی ریکارڈ یافتہ ہیں۔ اصول پرست اور سنجیدہ آدمی ہیں۔

جاوید میانداد

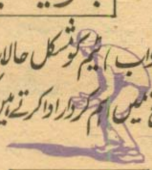

بہترین اور جارحانہ بیٹنگ۔ (اکثریت کا جواب) ٹیم کو مشکل حالات سے نکالنا۔ شارجہ کا چھکا۔ مسلسل آٹھ نصف سنچریاں، پاکستان کی فتح میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اچھا کپتان ہونے کی وجہ سے، بذلہ سنجی اور مذاق کرنا،

وسیم اکرم

○ اچھی اور تیز بولنگ (اکثریت کا جواب)، بہترین آل راؤنڈر، خوش اخلاقی

چوتھے نمبر پر آنے والے کھلاڑی منظور الٰہی اور سلیم ملک اچھی بیٹنگ کی وجہ سے مقبول کھلاڑی قرار پائے۔ پانچویں نمبر پر آنے والے کھلاڑی رمیز راجہ اور عبدالقادر بالترتیب اچھی اوپننگ، بہترین بیٹنگ اور بولنگ کے انداز اور پچ پر ڈانس کی وجہ سے مقبول کھلاڑی قرار پائے۔ چھٹے نمبر پر آنے والے کھلاڑی ماجد خان، اور سلیم یوسف بالترتیب چھکے لگانے، خوبصورت کھیل اور سادگی اور وکٹ کیپنگ کی وجہ سے مقبول کھلاڑی قرار پائے۔

کھلاڑی اور کردار

سروے میں بچوں نے جن کھلاڑیوں کو پسند یا ناپسند کرنے کی وجوہ لکھیں، ان سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بچے کھلاڑیوں کی اخلاقی حیثیت کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ان کی شخصیت کا تجزیہ صرف ان کے کھیل سے نہیں، بلکہ کردار سے بھی کرتے ہیں۔ مثلاً بچوں نے جن کھلاڑیوں کو مقبول قرار دیا، اس کی وجوہ انہوں نے اچھے کھیل کے ساتھ ساتھ اچھا اخلاق اچھی شخصیت، بذلہ سنجی، وغیرہ لکھیں۔ اسی طرح جن کھلاڑیوں کو بچوں نے غیر مقبول قرار دیا، ان کے اسباب بھی ایسے ہی ہیں۔ یعنی خراب کھیل کے ساتھ ساتھ غصّہ کرنا، لڑنا جھگڑنا، بداخلاقی، اسمگلنگ میں ملوّث ہونا، اداکاراؤں سے شادی وغیرہ۔

غیر مقبولیت کے اسباب

مدثر نذر ○ سست اور غیر دلچسپ بیٹنگ (اکثریت کا جواب) ان کی فیلڈنگ پر وقت ہنستے رہتے ہیں۔

محسن حسن خان ○ خراب کارکردگی (اکثریت کا جواب، کم رنز اور سستی، بھارتی فلموں میں کام کرنا بھارتی اداکارہ سے شادی کرنا، کرکٹ کو چھوڑنا۔

عمران خان ○ ریٹائرمنٹ کا اعلان، مغرور اور غصہ ور ہیں۔ اپنی بات منوانا، کھلاڑیوں کے ساتھ غلط رویہ۔

قاسم عمر ○ عمران خان سے جھگڑا، رنز بہت کم بناتے ہیں۔ ان کی اسمگلنگ۔

توصیف احمد ○ سست بیٹنگ خراب بولنگ،

عبدالقادر ○ بولنگ کا خراب اسٹائل، رن آؤٹ ہوتے ہیں، کیچ بہت چھوڑتے ہیں، بال لڑکیوں کی طرح ہیں۔

رضوان الزماں ○ سست اور غیر ذمہ دار بیٹنگ، ہمیشہ ناکام رہتے ہیں، ان کی فیلڈنگ اچھی نہیں ہے۔

یونس احمد ○ نااہلی اور غلط بیانات، لالچ،

شعیب محمد ○ ناکام اوپنر، گیند کو دیکھ کر بوکھلا جانا، جلدی آؤٹ ہونا،

منصور اختر ○ ناکارہ بیٹنگ۔

جاوید میاں داد ○ ورلڈ کپ ٹورنامنٹ سے انکار، اچھی بولنگ نہیں کرتے۔

محسن کمال ○ بولنگ اچھی نہیں کرتے، خراب بیٹنگ،

گو کہ یہ سروے ملکی کھلاڑیوں سے متعلق تھا، مگر بچوں نے قومی کھلاڑیوں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی کھلاڑیوں کے متعلق بھی اپنی آراء لکھیں۔ ہم قارئین کی دلچسپی کے لئے ان کھلاڑیوں کے نام بھی دے رہے ہیں، بچوں کی آراء کے مطابق سری کانت آئن بوتھم، مریوڈ گاورر، گریگ چیپل اور ویوین رچرڈز مقبول کھلاڑی قرار پائے۔

سلیم جعفر ○ بے کار بولنگ، خراب بیٹنگ، تصویر بنانے کے لئے پوز دینا،

سلیم یوسف ○ غلط اپیلیں کرنا، خواہ مخواہ شور کرنا۔

اقبال قاسم ○ کسی کو جلد آؤٹ نہیں کرتے، بیٹنگ زیادہ دیر تک نہیں کرتے۔

ماجد خان ○ اچھا نہیں کھیلتے، زیرو پر آؤٹ ہونا۔

وسیم حسن راجہ ○ کم اسکور پر آؤٹ ہونا۔

دیگر کھلاڑیوں کو ناپسند کرنے کی وجوہ

○ منظور الٰہی، اچھی بولنگ نہیں کرتے ○ آصف مجتبیٰ، اچھا نہیں کھیلتے،

○ سلیم ملک، اچھا نہیں کھیلتے ○ ذوالقرنین حیدر، تنچیاں مارنا۔

○ سرفراز نواز، درمیان میں کرکٹ چھوڑنا ○ وسیم باری، بیٹنگ اچھی نہیں کرتے۔

○ ظہیر الدین، غیر مسلموں کے ساتھ کھیلنا ○ وسیم اکرم، جارحانہ بیٹنگ

نمبر شمار	بچوں میں غیر مقبول غیر ملکی کرکٹرز	غیر مقبولیت کا اوسط
۱	آئن بوتھم	۱۰ فیصد
۲	سنیل گواسکر	۹ فیصد
۳	کپیل دیو	۵ فیصد
۴	میلکم مارشل	۴ فیصد
۵	چتن شرما	۳ فیصد
۶	سدھیر نائیک، نیل فوسٹر، لیری گومز، ویوین رچرڈز، کرس برڈ	۲،۲،۲،۲ فیصد

غیر ملکی کھلاڑیوں کی غیر مقبولیت کے اسباب

ہم نے یہ سروے قومی کھلاڑیوں سے متعلق کیا تھا مگر بچوں نے غیر ملکی کھلاڑیوں پر بھی اپنی رائے دی ہے۔ جس کی دلچسپ تفصیلات درج ذیل ہیں۔

غیر ملکی مقبول کرکٹرز

آئن بوتھم ○ غرور کرنا، بدمزاجی، گندا کھلاڑی۔

سنیل گواسکر ○ سست بیٹنگ، ناکام آل راؤنڈر رنز بہت بناتا ہے۔ دھاندلی، پاکستان کے خلاف کھیلنا۔

پکیل دیو ○ پاکستان کے خلاف کھیلنا، بے ایمان ایمپائروں پر اعتماد کرتے ہیں۔ بُری کپتانی،

میلکم مارشل ○ چڑچڑا ہے۔ ہمارے کھلاڑیوں کا منہ توڑتا ہے۔ تیز دوڑ کر بال کرنا۔

چیتن شرما ○ بکواس بولنگ،

سدھیر نائیک ○ موزے چوری کرنا،

نیل فوسٹر ○ خراب بیٹنگ، لمبی ٹانگیں۔

لیری گومز ○ بیٹنگ اور فیلڈنگ میں ناتجربہ کاری، دنیا کا بدترین فیلڈر

ویوین رچرڈز ○ خوفناک چہرہ، غیر مسلم ہے۔

کرس بروڈ ○ ان کا غصہ، پاکستانی بولروں کو پیٹتا ہے۔

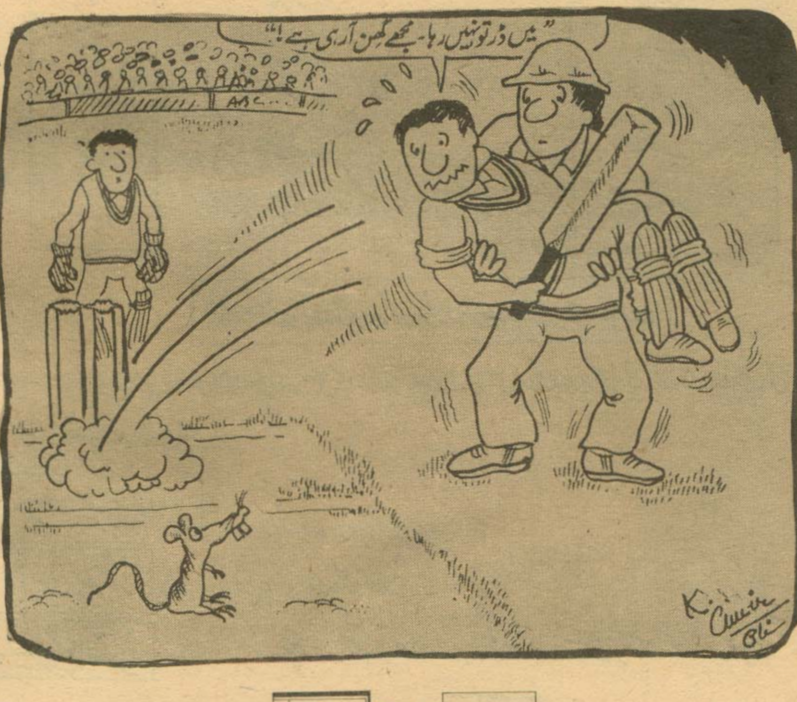

ضیاء الرحمٰن ضیاء

کرکٹ اور جانور

کرکٹ کا سحر صرف انسان تک محدود نہیں، جانور بھی کرکٹ کے اسیر ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ کرکٹ کے طلسم سے جانور بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ یہ کہنا درست ہو یا نہ ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے کرکٹ کے رنگوں میں اضافہ کیا اور اُن میں چند کرکٹ پر، پروانہ وار نثار بھی ہوئے۔

برِّاعظم افریقہ کا ملک کینیا حسین اور گھنے جنگلات کی سرزمین ہے۔ قدیم زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ

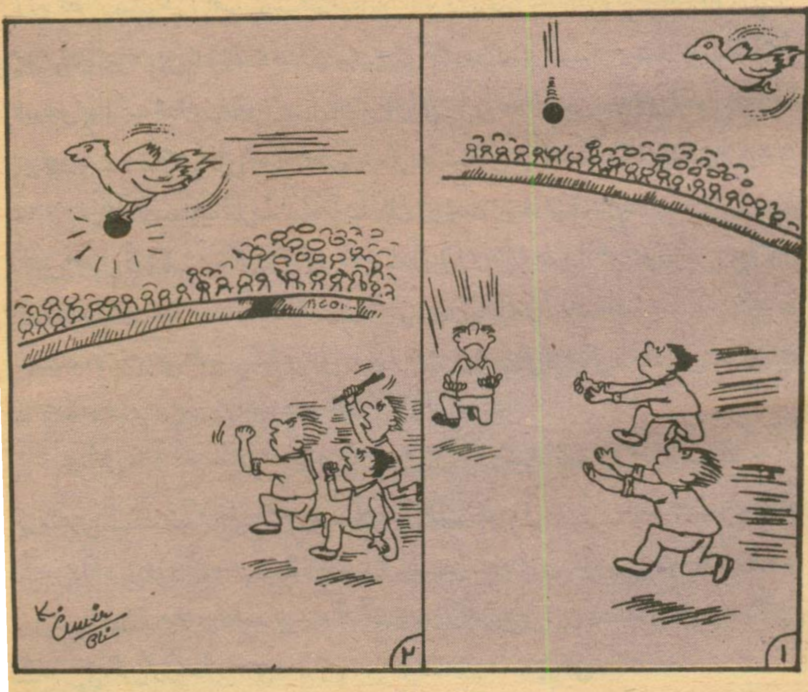

وہاں کے دارالحکومت نیروبی میں ایک کرکٹ میچ کھیلا جا رہا تھا۔ باؤنڈری کے قریب ہی جھاڑیاں تھیں۔ بیٹسمین نے ایک گیند پر زوردار اسٹروک لگایا۔ گیند تیزی سے باؤنڈری کی طرف جانے لگی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یقینی طور پر چوکا ہو جائے گا کہ اچانک جھاڑیوں سے ایک شیر برآمد ہوا اور جست لگا کر باؤنڈری لائن کے اندر آگیا۔ اس سے پہلے کہ گیند باؤنڈری کو پار کرتی، شیر نے گیند کو اپنے جسم سے روک لیا اور اُس سے کھیلنے لگا۔ فیلڈر نے امپائر سے "لاسٹ بال" کا مطالبہ کیا۔ چونکہ گیند باؤنڈری کے اندر تھی اور امپائر سمیت تمام کھلاڑیوں کو دکھائی دے رہی تھی۔ اسی لیے امپائر نے فیلڈر کی اپیل کو مسترد کر دیا۔ بیٹسمین اس موقع سے فائدہ اٹھا کر رن بناتے رہے۔ فیلڈنگ کرنے والی ٹیم نے تماشائیوں کو جمع کیا اور لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے مسلح ہو کر شیر کی طرف بڑھے۔ شیر انھیں دیکھ کر جھاڑیوں میں روپوش ہو گیا۔ جب گیند دوبارہ حاصل کی گئی تو شیر کے پنجوں اور دانتوں سے اُس کا حُلیہ بگڑ چکا تھا۔ لیکن اس دوران بیٹسمین لاتعداد رن بنا چکے تھے۔

عام مکھیاں اور شہد کی مکھیاں بھی کئی بار کرکٹ اسٹیڈیم کا رُخ کر چکی ہیں۔ ۲۵ر نومبر ۱۹۴۷ء کو نیوزی لینڈ میں کرکٹ میچ کے دوران شہد کی مکھیوں کا ایک جتھہ میدان میں داخل ہو گیا۔ کھلاڑیوں کو اتنا موقع بھی نہیں ملا کہ وہ میدان چھوڑ کر ڈریسنگ روم میں پناہ لیتے۔ جو کھلاڑی میدان میں جس جگہ موجود تھا وہاں مُنہ کے بل لیٹ گیا۔ جب شہد کی مکھیوں کا وہ بادل چھٹا، تب کھلاڑیوں اور تماشائیوں کی جان میں جان آئی۔ نومبر ۱۹۵۷ء اور جون ۱۹۶۲ء میں ٹرانسوال اور آکسفورڈ میں کھیلے جانے والے میچوں کو بھی شہد کی مکھیوں کی آمد کی وجہ سے خاصی دیر تک روک دینا پڑا تھا۔ اسی طرح جون ۱۹۶۷ء میں مکھیوں کے ایک غول نے لارڈز کرکٹ گراؤنڈ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہیمپشائر کے دو کھلاڑیوں کی آنکھیں مکھیوں کے ڈنک سے زخمی ہو گئی تھیں۔ یہ بلائے ناگہانی اُس دن صرف لارڈز تک محدود نہیں رہی بلکہ لارڈز سے وہ قافلہ لندن کے دوسرے اہم گراؤنڈ اوول میں پہنچ گیا۔ جہاں تماشائیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کرکٹ میچ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ مکھیوں کے اُس غول کو دیکھ کر ان میں بھی سراسیمگی پھیل گئی اور وہ کافی دیر تک کرکٹ دیکھنے کے بجائے اپنے جسم اور چہرے کو مکھیوں سے بچانے کی تدابیر کرتے رہے۔

۱۲ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کو ساؤتھ آسٹریلیا کے مقام کوویل میں اسکول کے چند لڑکے میچ کھیل رہے تھے۔ بالر کی گیند بیٹسمین نے آگے بڑھ کر کھیلی۔ بیٹسمین کو کوئی چیز اپنی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ وہ ایک زہریلا سانپ تھا۔ وہ بیٹسمین فوراً اُس کی طرف لپکا اور اپنے بلّے کی ایک ہی ضرب سے اُسے دوسری دنیا میں پہنچا دیا۔ دوسری طرف وکٹ کیپر نے اپنے تمام حواس مجتمع رکھے اور موقع غنیمت جان کر تینوں وکٹیں زمین سے اکھاڑ پھینکیں۔ جب بیٹسمین نے مڑ کر اپنی وکٹوں کو دیکھا تو دوسری طرف ایمپائر کی انگلی فضا میں بلند ہو چکی تھی۔

ایک مرتبہ بچوں ہی کے ایک کرکٹ میچ میں ایک شتر مرغ نے گیند کو نگل لیا۔ بچوں کے پاس کوئی اور گیند موجود نہیں تھی۔ اس لیے تمام بچّے اُس شتر مرغ کی طرف دوڑے۔ اُسے پکڑا اور اُس کی گردن کی اس وقت تک مالش کرتے رہے جب تک کہ شتر مرغ نے گیند کو اُگل نہیں دیا۔ یہ واقعہ ۲۱ اپریل ۱۹۲۸ء کو جنوبی افریقہ کے مقام مانٹیگو میں پیش آیا تھا۔

کرکٹ میچ کا خاتمہ کبھی کبھار بڑے انوکھے انداز میں ہوتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں آسٹریلیا کے شہر سڈنی کے ایک مقام ارل وُوڈ میں اسکول کے بچّوں کے درمیان ایک مقابلہ جاری تھا کہ قریب لگے ہوئے سرکس سے ایک ہاتھی بھاگ کر میدان میں آگیا اُس نے اپنی جانب آتی ہوئی گیند کو سونڈ کی مدد سے اُٹھالیا اور بچوں کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُس گیند کو نگل گیا۔ اس طرح مقابلہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

۲۲ دسمبر ۱۹۵۱ء کو انگلینڈ اور مہاراشٹر کی ٹیموں کے درمیان پونا میں کھیلے جانے والے ایک میچ میں ایک بہت ہی حیران کن منظر دیکھنے میں آیا۔ جس نے نہ صرف تماشائیوں بلکہ کھلاڑیوں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔ ہوا یوں کہ کرکٹ کا رسیا ایک بندر اچانک میدان میں داخل ہو کر پچ کے قریب بیٹھ گیا۔ کھلاڑیوں نے اُسے بھگانا چاہا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ غصّے کے عالم میں خیں خیں کرنے لگا۔

جب کھلاڑیوں نے بندر کو زیادہ ہی اشتعال دلایا تو وہ ایک دم امپائر کی طرف لپکا۔ میدان میں موجود تمام افراد ہنستے ہنستے بے حال ہوگئے۔ بالآخر منتظمین اُس بندر کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔

مئی ۱۸۸۹ء میں انگلینڈ کی دو کاؤنٹیوں لیسسٹر شائر اور لنکا شائر کے درمیان میچ میں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ بیٹسمین T.H. warren نے اسٹروک کھیلا۔ گیند باؤنڈری کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک ایک کتّا اپنے مالک کے ہاتھ سے زنجیر چھڑا کر میدان میں داخل ہوا اور گیند کو مُنہ میں دبا کر باؤنڈری لائن کے پار پہنچ گیا۔ امپائر کے خیال میں اگر کتّا مداخلت نہیں کرتا تب بھی گیند باؤنڈری لائن پار کر جاتی اسی لیے امپائر نے بیٹسمین کے لیے چوکے کا اشارہ کیا۔ اسی طرح ایک اور واقعے میں Sussex کے N.T.Tho-mson نامی کھلاڑی کو بونس کے چار رن ملے۔ جون ۱۹۶۳ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف بیٹنگ کرتے ہوئے اُن کے ایک اسٹروک کو ایک کتّے نے فیلڈ کیا اور گیند مُنہ میں دبا کر باؤنڈری لائن پار کر گیا۔

آئی۔سی۔سی کے ہیڈ کوارٹر لارڈز کے لانگ روم میں کرکٹ کے لاتعداد نوادرات جمع کیے گئے ہیں۔ اُن نوادرات میں سے ایک وہ چڑیا بھی ہے جو ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر جہانگیر کے ہاتھوں ہلاک ہوئی تھی۔ کرکٹ کی ایک رسیا چڑیا فضاء میں اُڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر جہانگیر خان کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے ایم سی سی کے بیٹسمین

T.N. Pearce کو بالنگ کرا رہے تھے کہ گیند بیٹسمین کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی چڑیا سے جا ٹکرائی اور وہ چڑیا فوراً ہی راہیٔ ملکِ عدم ہوگئی۔ اسی قسم کا ایک اور حادثہ ۱۲ اگست ۱۸۸۵ء کو پیش آیا تھا۔ Caius اور Trinity Hall کے درمیان کھیلے گئے میچ میں ایک ابابیل Cordeaux نامی کھلاڑی کی ایک گیند سے ٹکرائی اور ہلاک ہوگئی۔ ایک مرتبہ لارڈز کرکٹ گراؤنڈ پر انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے ایک نامور تیز رفتار بالر G. Brown نے ایک انتہائی تیز رفتار گیند کرائی جو ایک کتّے کے لگی جو موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔

۱۹۶۲ء میں کرکٹ کا ایک شائق چوہا پاکستان اور انگلینڈ کے درمیان کھیلے جانے والے برمنگھم ٹیسٹ میں میدان میں گھس آیا اور چند منٹ تک میدان میں اِدھر اُدھر دوڑتا رہا۔ تماشائی اور کھلاڑی خاصی دیر تک چوہے سے محظوظ ہوتے رہے۔

۲۳-۱۹۲۲ء میں انگلینڈ کی ٹیم کے دورۂ جنوبی افریقہ میں کرکٹ کی تاریخ کا انتہائی دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ ڈربن میں دونوں ملکوں کے درمیان آخری ٹیسٹ کھیلا جا رہا تھا۔ انگلینڈ کے کپتان نے ٹاس جیت کر پہلے بیٹنگ کا فیصلہ کیا۔ اُن دنوں جنوبی افریقہ میں ٹیسٹ میچ شروع ہونے سے چند دن پہلے وکٹ مکمل طور پر ڈھانپنے کا رواج تھا۔ چنانچہ انگلینڈ کی اننگ کے آغاز سے قبل گراؤنڈمین میدان میں داخل ہوئے اور وکٹ پر سے کوَر اُٹھائے۔ انگلینڈ کے اینڈی سینڈھم امپائر سے گارڈ لے کر تیار ہوگئے۔ دوسری طرف سے ایس۔ جے۔ اسنوک نے طویل اسٹارٹ کے بعد پوری قوت سے شارٹ پچ گیند پھینکی لیکن گیند پچ سے ٹکرانے کے بعد بالکل ہی بیٹھ گئی۔ بیٹسمین سینڈھم کے لیے یہ بڑی حیرانی کی بات تھی لیکن وہ دوسری گیند کھیلنے کی تیاری کرنے لگے۔ اسنوک کی دوسری گیند بھی پہلی گیند کی طرح بیٹھ گئی۔ اب تو سینڈھم کو تشویش ہوئی اور وہ پچ کا جائزہ لینے کے لیے کریز سے باہر نکلے۔ سینڈھم نے جب پچ کے درمیانی حصّے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو مارے حیرت کے ان کی چیخیں نکلتے نکلتے رہ گئیں۔ انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ انھوں نے پلکیں جھپکائیں اور آنکھوں کو بار بار مسل کر دیکھا لیکن پچ کی حرکت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ جب انھوں نے دوزانوں بیٹھ کر پچ کو غور سے دیکھا تو انھیں سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے مینڈکوں کی ایک فوج نظر آئی۔ مینڈکوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ سبز گھاس میں اُن کی ایک چھوٹی سی مصنوعی پچ بن گئی تھی۔ چنانچہ گراؤنڈمین کو ایک مرتبہ پھر زحمت دی گئی۔ انھوں نے مینڈکوں کو پچ پر اُگی ہوئی گھاس سے علیحدہ کیا۔ گیند انہی مینڈکوں سے ٹکرانے کی وجہ سے بیٹھ رہی تھی۔ مینڈکوں کی کرکٹ سے دلچسپی کا یہ منفرد واقعہ ہے۔

میاں داد کی ڈبل سنچری

فراست رضوی

میاں داد تیری ڈبل سینچری
مٹا دی حریفوں کی سب خودسری

ہر اک شاٹ پر برق سی کوند جائے
وہ "بیٹنگ" تھی تیری کہ جادوگری

جو گیند آئی تجھ تک ہوا ہو گئی
کہ تھی تیرے ہاتھوں میں بجلی بھری

جو تو شیر کی طرح سے ڈٹ گیا
تو "انگلینڈ" کی ٹیم بے حد ڈری

ارے "مائیک گیٹنگ" کو دیکھے کوئی
کہ ہے غم سے پلکوں پہ اُس کے تری

ترا جارحانہ عمل دیکھ کر
اُسے خوف سے لگ گئی تھرتھری

ترے کھیل سے کس قدر خوش ہوا
وہ عمران، کپتان اپنا جری

اُنہی کا وطن اور اُنہی کو شکست
نمایاں رہی ہے تری برتری

تری فتح سے "شہرِ اوول" کے بیچ
لگایا گیا نعرۂ حیدری

انڈیا
انگلینڈ
ویسٹ انڈیز
RETIRED

Rs
Rs
Rs
MAN OF THE SERIES

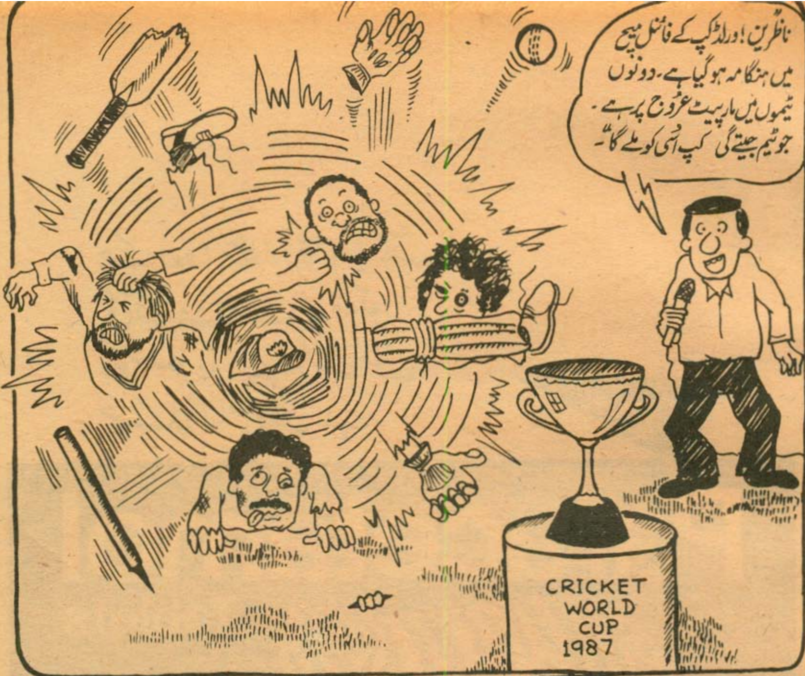

ناظرین! ورلڈ کپ کے فائنل میچ میں ہنگامہ ہو گیا ہے۔ دونوں ٹیموں میں مارپیٹ عروج پر ہے۔ جو ٹیم جیتے گی کپ اسی کو ملے گا۔
CRICKET WORLD CUP 1987

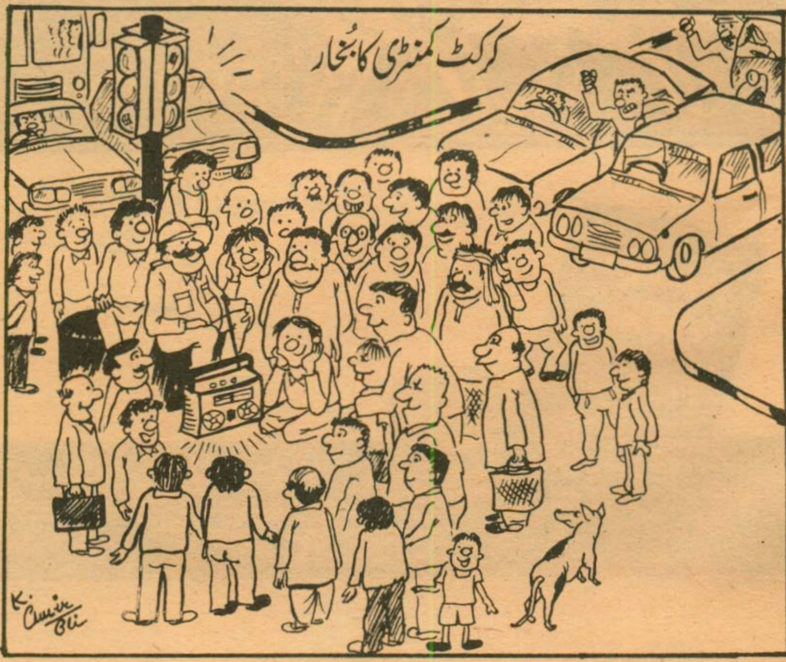

کرکٹ کمنٹری کا بخار

جب درد، نزلہ، زُکام یا بخار
کی تکلیف شدید ہو تو
نِکولس کی پیراسیٹامول
جلد آرام دیتی ہے۔
Nicholas
Paracetamol
Tablets
500 mg
شیر والی پیراسیٹامول
مؤثر اور
تیز اثر
Manufactured by Aspro-Nicholas, SITE, Karachi
Paracetamol
Tablet
500 mg
For Pain & Fever
1-2 Tablets every 4 hours
Mfg. Lic No. 000027
Regn. No. 001657
Manufactured by Aspro-Nicholas, SITE, Karachi
N
ہمیشہ نِکولس کی اصلی شیر والی پیراسیٹامول
لیجئے۔ نقلی گولی سے ہوشیار
پیراسیٹامول خالی پیٹ یا بد ہضمی میں نہ لیں۔ بچوں سے دُور رکھیں۔
طبیعت زیادہ خراب ہو تو ڈاکٹر سے رجوع کریں۔
A-9-84
ASIATIC

ایاز احمد فریدی

کھیلو گے، کُودو گے بنو گے نواب

پڑوس میں ثانی صاحب نئے کرایہ دار بن کر آئے تو سب سے زیادہ خوشی نیلی کو ہوئی کیونکہ اسے اُس کنبے میں اپنی ہم عمر لڑکی بھی نظر آئی تھی۔ ثانی صاحب محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے اور تبادلے کے نتیجے میں یہاں آئے تھے۔ کنبے میں دو بچے تھے ایک عاصم جو آٹھ نو سال کا تھا۔ دوسری سارہ جو نیلی کی ہم عمر تھی، لیکن ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود یہ بچے گھر سے کم ہی باہر نظر آئے۔ البتّہ اسکول جاتے وہ روز ہی نظر آجاتے تھے۔ لہٰذا جمال کے والد ڈاکٹر ناصر نے جب ثانی صاحب اور اُن کے کنبے کو اپنے گھر مدعو کیا تو سب سے زیادہ خوشی بھی نیلی کو ہوئی۔

ثانی صاحب بہت دلچسپ آدمی ثابت ہوئے، رات کو کھانے کے بعد گفتگو کے دوران ڈاکٹر ناصر نے ثانی صاحب کے بیٹے عاصم سے پوچھا کہ وہ گھر سے باہر کیوں نہیں نکلتے۔ جس پر عاصم نے بتایا کہ ابّو جان نے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا

رکھی ہے۔۔۔

ڈاکٹر ناصر نے ثانی صاحب کو مخاطب کر کے پوچھا۔۔

"کیوں جناب۔۔۔ یہ کیسی پابندی ہے۔۔۔؟"

"دراصل اِن کا خیال ہے۔۔۔ جو بچّے باہر کھیلنے میں لگ جاتے ہیں۔۔۔ ان کی پڑھائی متاثّر ہوتی ہے۔۔۔ اسی لیے ان دونوں پر باہر کھیلنے پر پابندی ہے۔" ثانی صاحب کی بیگم نے جواب دیا۔

"کیوں ثانی صاحب۔۔۔ یہ بات ٹھیک ہے۔۔۔" ڈاکٹر ناصر نے پوچھا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ جو بچّے باہر کھیل کُود میں حصّہ لیتے ہیں وہ پھر کھیل کے ہی ہو جاتے ہیں اور تعلیم پیچھے رہ جاتی ہے۔۔۔ میں نے تو اسی لیے بچّوں پر پابندی لگا رکھی ہے۔۔۔" ثانی صاحب نے جواب دیا۔

"میں نے کتنا کہا کہ بچّوں کو ایک آدھ گھنٹہ باہر نکلنے دیا کریں مگر یہ مانتے ہی نہیں۔۔۔" بیگم ثانی بولیں۔

"لگتا ہے آپ کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب۔ پڑھو گے لکھو گے بنو گے نواب' پر عمل کر رہے ہیں۔۔۔" جمال کے ابّو مسکرا کر بولے۔

"بالکل۔۔۔" ثانی صاحب بولے۔

"یہ بات کسی حد تک درست تو ہو سکتی ہے لیکن بالکل درست نہیں۔۔۔" جمال کے ابّو نے کہا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" ثانی صاحب چونک کر بولے۔

"مطلب یہ کہ ہر بچّے کے لیے ضروری نہیں کہ صرف پڑھتا ہی رہے اور کھیلے نہ۔ جبکہ یہ بھی اچھا نہیں کہ ہر بچّہ صرف کھیلتا رہے اور پڑھائی سے دھیان ہٹالے۔۔۔ اس کے لیے توازن بہت ضروری ہے۔۔۔"

"ابھی ورلڈ کپ کرکٹ ہونے والا ہے۔۔۔ انھوں نے ٹی وی ڈبّے میں بند کر کے رکھ دیا ہے۔۔۔ کہ بچّوں کی پڑھائی متاثّر ہو گی۔۔۔" ثانی صاحب کی بیگم نے شکوہ کیا۔۔

"بھئی میرا تو خیال ہے۔۔۔ یہ بچّے۔۔۔ ہاکی۔۔۔ کرکٹ اور دوسرے کھیلوں میں پڑ گئے تو پڑھائی کا خُدا ہی حافظ ہے۔"

"ابّو۔۔۔ کیا یہ عمران خان۔۔۔ منصور اختر اور وسیم اکرم انھوں نے پڑھائی بالکل چھوڑ دی تھی؟!"

جمال نے ابّو سے پوچھا۔۔۔

"نہیں بیٹے ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔۔۔ جیسے میں پہلے کہہ رہا تھا کہ اس کے لیے توازن بہت ضروری ہے کھیل کے وقت کھیل اور پڑھائی کے وقت پڑھائی۔۔۔ یہ جتنے نام بھی تم نے لیے انھوں نے اِسی اصول کے تحت کھیلا بھی اور پڑھا بھی۔۔" جمال کے ابّو بولے۔۔

"آپ ہمیں ذرا تفصیل سے ان کھلاڑیوں کے بارے میں بتائیں ——— جو کھیل کے علاوہ تعلیمی میدان میں نمایاں رہے ..." بیگم ثانی نے پوچھا۔

"بھابھی یہ بات تو ثانی صاحب بھی جانتے ہوں گے کہ عمران خان نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا... اس کے علاوہ تقریباً اٹھارہ سال سے وہ پاکستان کی طرف سے بڑی کرکٹ بھی کھیل رہے ہیں۔"

"یہ بڑی کرکٹ سے کیا مراد ہے؟"... جمال کی امی نے پوچھا...

"بڑی کرکٹ میں... دو ملکوں کے درمیان ہونے والے فرسٹ کلاس... ٹیسٹ میچ اور ون ڈے انٹرنیشنل کو بھی کہتے ہیں اور کاؤنٹی کرکٹ یا کسی بھی ملک میں ہونے والے بڑے ٹورنامنٹ بھی اس میں شامل ہوتے ہیں..."

"آپ ہمیں عمران خان اور دوسرے کھلاڑیوں کے بارے میں بتائیں۔"

"جیساکہ میں بتا رہا تھا، عمران خان نے ستر ٹیسٹ میچوں میں ڈھائی ہزار سے زائد رنز اور تین سو سے زیادہ وکٹیں حاصل کیں... ان کے ایک خالہ زاد بھائی ماجد خان نے کیمبرج سے گریجویشن کیا اور آج کل پاکستان ٹیلی وژن اسپورٹس کوریج کے انچارج کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ماجد خان نے اسّی کے قریب ٹیسٹ میچوں میں تین ہزار سے زائد رنز بنائے جن میں آٹھ سینچریاں شامل تھیں۔ انھوں نے کاؤنٹی کرکٹ بھی کھیلی اور مجھے گلیمورگن کاؤنٹی کے خلاف ان کی ایک اننگز یاد آرہی ہے جس میں انھوں نے ایک اوور میں پانچ چھکے اور ایک چوکا لگایا، جسے بعد میں گیری سوبرز نے ایک اوور میں چھ چھکے لگاکر ریکارڈ بنایا۔ عمران اور ماجد خان کے ایک اور خالہ زاد بھائی جاوید برکی نے بھی تقریباً پچیس ٹیسٹ کھیلے اور ایک ہزار سے زائد رنز بنائے جن میں تین سینچریاں شامل تھیں... جاوید برکی... بھی انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آج کل اسلام آباد کے ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ ... انھوں نے عمران خان اور ماجد خان کی طرح اپنے ملک کی کرکٹ ٹیم کی قیادت بھی کی۔"

"ابّو... اور انکل وقار حسن کے متعلق بھی تو بتائیے جو کہ آپ کے کلاس فیلو بھی رہے ہیں!"... نیلی نے خوشی سے کہا۔

"ہاں بیٹے... انھوں نے بھی بہت اچھی کرکٹ کھیلی ہے اور آج کل نیشنل فوڈز اور دیگر تین کمپنیوں کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے ایک بھائی پرویز سجّاد نے بھی ٹیسٹ کرکٹ کھیلی۔"

"انکل آپ فضل محمود کے بارے میں بھی کچھ بتائیے"۔ عاصم نے پوچھا۔

"بیٹے فضل محمود حال ہی میں پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ جبکہ انھوں نے پاکستان کی طرف سے چونتیس ٹیسٹ میچوں میں بولنگ کراتے ہوئے ۱۳۹ ٹیسٹ وکٹیں حاصل کیں۔ اور جس گراؤنڈ یعنی اوول پر "جاوید میانداد" نے حال ہی میں دو سو ساٹھ رنز اسکور کیے تھے اسی گراؤنڈ پر فضل محمود نے پاکستان کے اوّلین دورۂ انگلینڈ میں بارہ وکٹیں لے کر انگلینڈ کو ہرانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔"

"...اور ابّو، ظہیر عبّاس جنھوں نے اوول گراؤنڈ پر ۲۴۰ رنز بنائے تھے؟"... جمال بولے۔

"ہاں بیٹے... ظہیر عبّاس نے کراچی اسلامیہ کالج سے گریجویشن کی اور تقریباً اٹھارہ سال کے دوران پاکستان کی طرف سے ستّر سے زائد ٹیسٹ میچوں میں کھیلتے ہوئے پانچ ہزار سے زائد رنز اسکور کیے۔ اس اسکور میں بارہ سینچریاں شامل ہیں جن میں چار ڈبل سینچریاں ہیں...... فرسٹ کلاس کرکٹ میں سو سے زائد سینچریاں بنانے والے پہلے پاکستانی اور تیسرے غیر برطانوی ہیں... آج کل کراچی میں پراپرٹی ڈیلنگ کا کاروبار کر رہے ہیں۔"

"تو گویا ابّو، ہمارے کھلاڑی ہر شعبے میں موجود ہیں۔" جمال نے پوچھا۔

"ہاں... تقریباً ہر شعبے میں... ویسے بینکوں میں بھی ان کھلاڑیوں کی تعداد بہ نسبت دوسرے شعبوں کے قدرے زیادہ ہے... مثلاً ہمارے منٹو اوپنر رمیز راجہ نے بھی خاصی کرکٹ کھیل لی ہے، اور انھوں نے ایم بی اے کر رکھا ہے اور آج کل 'بی سی سی آئی' میں ذمّہ دار پوسٹ پر بھی فائز ہیں..." جاوید میانداد" حبیب بینک کے وائس پریزیڈنٹ ہیں اور انھوں نے چھیاسی ٹیسٹ میچوں میں کھیلتے ہوئے چھ ہزار سے زائد رنز اسکور کیے ہیں جن میں پندرہ سینچریاں اور چونتیس نصف سینچریاں شامل ہیں وہ ون ڈے انٹرنیشنل میچوں میں پانچ ہزار کے قریب رنز اسکور کر چکے ہیں... اسی طرح مدثر نذر جو کہ یونائیٹڈ بینک کی طرف سے کھیلتے ہیں۔ انھوں نے بھی ساٹھ ٹیسٹ میچوں میں تین ہزار سے زائد رنز اسکور کیے ہیں۔ اسی بینک میں 'منصور اختر اور توصیف احمد' بھی ملازم ہیں... حبیب بینک میں جاوید میانداد کے علاوہ سلیم ملک، اعجاز احمد اور عبدالقادر بھی ملازم ہیں۔ عبدالقادر نے ۶۴ ٹیسٹ میچوں میں ڈیڑھ سو سے زائد وکٹ لیے ہیں... اور ذرا پی آئی اے کی طرف نظر کریں، جن کی طرف سے ماضی میں "حنیف محمدؔ نے کرکٹ کھیلی جو کہ آج کل پی آئی اے کے شعبۂ کھیل کے انتظامی امور کی نگرانی بھی کر رہے ہیں... پی آئی اے... کی طرف سے آج کل شعیب محمدؔ، آصف مجتبیٰ، وسیم اکرم... کرکٹ کھیل رہے ہیں جب کہ ماضی میں حنیف محمدؔ کے علاوہ ماجد خان، عمران خان، ظہیر عباس، مدثر نذر، مشتاق محمدؔ، آصف اقبال اور وسیم باری بھی پی آئی اے سے وابستہ رہ چکے ہیں... تو یہ سب لوگ وہ ہیں جنھوں نے اپنے کھیل کے ساتھ ساتھ پڑھائی کا توازن قائم رکھا... تبھی تو اتنی ذمّہ داری سے زندگی کے ہر شعبے میں اپنی صلاحیتوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں... اب بتائیے ثاقی صاحب... یہ کافی ہیں یا اور مثالیں دُوں...؟"

"آپ کی باتوں سے میں تو خیر قائل ہوگیا... لیکن یہ بات سارہ اور عاصم بھی سُن ہی رہے ہیں لہٰذا انھیں بھی چاہیئے کہ کھیل اور پڑھائی میں توازن کا خیال رکھیں..." ثاقی صاحب بولے۔

"تو کل سے ہم بھی جمال بھائی کے ساتھ باہر کھیلنے جائیں گے..." سارہ خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔

"اور بالکل ٹھیک وقت پر واپس گھر آکر ہوم ورک بھی مکمل کرنا ہوگا..." ابّو بولے اور سب ہنسنے لگے۔

Orient Advertisers (Pvt) Ltd.

194-A, Sindhi Muslim Housing Society, Karachi.
Tel: 430133 (3 lines) 432844, 436052.Cable: "Publicity". Telex: 23997 ORIAD PK.

Lahore: Cement Building, Thornton Road, Tel: 61286, 60021.
Islamabad: Ghausia Plaza, Blue Area. Tel: 825909, 822874. Telex: 54041 ORIAD PK.
Quetta: C-28, Kabir Building, Jinnah Road, Phone: 72047
Peshawar: 2 - Arbab Road, Tel: 72697.

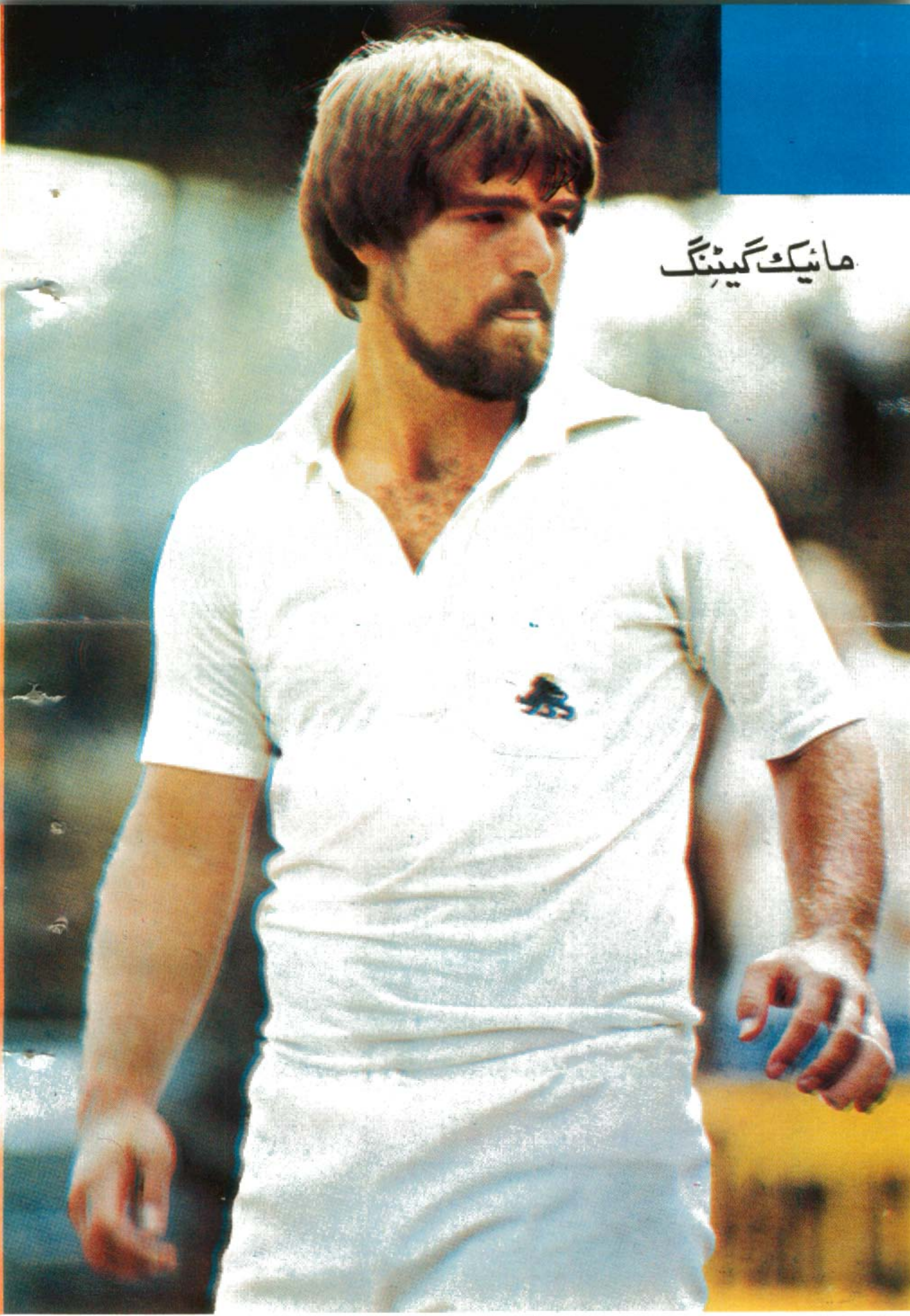

مائیک گیٹنگ

طارق محمود میاں

دنیا کے مایہ ناز

بے ایمان امپائر

کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ کسی بے ایمان امپائر سے پوچھوں کہ بھئی تم ہزاروں تماشائیوں، گیارہ عدد خونخوار فیلڈرز اور ٹی وی کے تین چار کیمروں کے سامنے بے ایمانی کیسے کر لیتے ہو۔ ایل بی ڈبلیو کیسے کھا جاتے ہو۔ اور وکٹوں کے پیچھے پکڑا جانے والا کیچ کیسے پی لیتے ہو" لیکن کوئی انجانی طاقت مجھے یہ بات پوچھنے سے اور ان امپائروں کو ایمانداری کرنے سے روکتی رہتی ہے۔ مثلاً گزشتہ دنوں جب انگلینڈ کا امپائر ڈیوڈ کانسٹنٹ اوول کے میچ میں مائیک گیٹنگ اور بوتھم کے ایل بی ڈبلیو پی رہا تھا تو میں اس سے کم از کم چار ہزار پانچ سو پانچ میل دور اپنے گھر میں بیٹھا ٹی وی پر میچ دیکھ رہا تھا کہ اچانک بجلی چلی گئی اور یوں ڈیوڈ کانسٹنٹ میرے ہاتھوں سے بچ گیا۔

انگریزوں کو دراصل اپنی ایمانداری پر بڑا فخر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ان کی چمڑی سفید ہے لہٰذا

ایمانداری کرنا بھی انہی کا حق ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے عالمی سیاست پر اجارہ داری کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کے خیال میں ان کی بے ایمانی پر کالی یا گندی جلد والوں کو اعتراض بھی نہیں کرنا چاہیے۔ اور انہیں چپکے سے زہر مار کر لینا چاہیے۔ شاید اس لئے جب پاکستانی ٹیم کے مینیجر حسیب احسن نے ایمپائر ڈیوڈ کانسٹنٹ کی سابقہ بے ایمانیوں کے پیش نظر پاکستان کے خلاف ٹیسٹ میچوں میں اس کی تقرری پر اعتراض کیا تو ان کا یہ اعتراض مسترد کر دیا گیا۔ دوبارہ اعتراض کیا تو پھر مسترد کر دیا گیا یوں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دو عدد ٹیسٹ میچوں میں اپنا ایک عدد نمونہ بے ایمانی بڑی شان سے پیش کرتے رہے۔

یہ پاکستانی ٹیم ہی تھی جو بعد میں اس بات کو خاموشی اور فراخ دلی کے ساتھ برداشت کر گئی ورنہ اگر ان کا واسطہ گریگ چیپل اور ڈینس للی کے دور والی آسٹریلوی ٹیم سے پڑا ہوتا تو مزہ آجاتا۔ وہ تو وکٹیں، ڈریسنگ روم کا فرنیچر اور ایمپائر کی دو چار پسلیاں توڑ تاڑ کے معاملہ ہی برابر کر دیتے۔ بلکہ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۸۴ء میں جب ویسٹ انڈیز اور انگلینڈ کے درمیان لارڈز کے مقام پر سیریز کا دوسرا ٹیسٹ میچ ہو رہا تھا تو ویوین رچرڈز نے دھنا دھن بالروں کی دُھنائی شروع کر دی۔ آپ کو پتہ ہی ہے کہ وہ کیسا ظالم بلے باز ہے۔ اگر جوش میں آجائے تو بالروں کو منٹوں میں چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا ہے۔ ابھی اس کا انفرادی اسکور ۲، ہوا تھا کہ بالروں سے بھی پہلے ایمپائر بیری میئر نے رچرڈز کو ایل بی ڈبلیو آؤٹ قرار دے دیا۔ ظاہر ہے کہ غلط ایل بی ڈبلیو آؤٹ دینے پر رچرڈز کو بہت غصہ آیا۔ غصے کے مارے اس کی سیاہ رنگت سرخی مائل سیاہ ہوگئی، ایمپائر کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے اس کی طرف گھور کر دیکھا، تھوڑا سا غرایا اور یوں منہ ہلایا جیسے کہہ رہا ہو ..... "اچھا بچو ذرا باہر نکلنا تمہیں دیکھ لوں گا"...... بس اس پر کھیل کے اختتام پر ایمپائر بیری میئر کی گھگھی بندھی رہی۔ شام کو وہ غالباً ٹاٹی کے ڈر سے ویوین رچرڈز کے پاس گیا اور سرکاری طور پر اس سے معافی مانگی کہ بھائی مجھے معاف کر دو میرے چھوٹے چھوٹے یتیم بچے ہیں آئندہ کم از کم تمہیں اس طرح غلط آؤٹ نہیں دوں گا۔ یہ کرکٹ کی تاریخ کا انوکھا واقعہ ہے کہ جب ایمپائر نے باقاعدہ طور پر معافی مانگ کر اپنی بے ایمانی تسلیم کی۔ یہاں آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ یہ بے ایمان ایمپائر انگلینڈ ہی کا تھا۔

ویوین رچرڈز سے تو خیر انہوں نے معافی مانگ کر جان بچائی لیکن پاکستانیوں کو شاید کمزور جان کر ان کے خلاف وہ جی کھول کر بے ایمانی کرتے ہیں۔ انہوں نے تو پاکستان کے قیام کے وقت بھی تقسیم ہند میں ڈنڈی ماری تھی۔ وہی سلسلہ اب تک جاری ہے۔ چھوٹی موٹی بے وقت کی شوقیہ بے ایمانیاں تو چلو قابل برداشت ہیں لیکن بعض اوقات انہوں نے ایسی بے ایمانی بھی کی ہے، جس سے ساری سیریز کا فیصلہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ ایک گزشتہ دورۂ انگلستان میں آخری ٹیسٹ میچ میں ان کے ایمپائر کین پامر نے عین اس

وقت سکندر بخت کو بیٹ اینڈ پیڈ کیچ آؤٹ دے دیا تھا جب وہ عمران خان کی شراکت میں بڑا جم کر کھیل رہا تھا۔ اور پوری امید تھی کہ پاکستان میچ ڈرا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مگر کین پامر کی بے ایمانی کے باعث پاکستان وہ میچ ہار گیا کیونکہ اس نے اپنے جذبۂ حب الوطنی کے تحت سکندر بخت کو ایک ایسی بال پر کیچ آؤٹ دے دیا تھا جس سے اس کا بیٹ واضح طور پر کم از کم چھ انچ دور تھا۔

بے ایمان ایمپائر صرف انگلینڈ میں ہی نہیں پائے جاتے بلکہ کرکٹ کھیلنے والے تمام ممالک ان کے معاملے میں خود کفیل ہیں۔ آسٹریلیا کے ایمپائر میل جانسن اور ٹونی رینڈل پر بھی بے ایمانی کا الزام لگایا جا چکا ہے۔ اور آسٹریلیا کا دورہ کرنے والی ہر ٹیم ان پر اعتراضات کی بارش کر کے لوٹتی ہے۔ ویسٹ انڈیز کا دورہ کئے ہوئے پاکستان کو ایک مدت گزر گئی ہے لیکن ان کے ایمپائر جے بی گائل، جیک آرچر اور ایل ایچ پارکر کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی لی ہوئی وکٹوں کی تعداد لانس گبز اور مائیکل ہولڈنگ کی وکٹوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ وہ بوقتِ ضرورت بالنگ کی رفتار اور پچ پر اس کی موومنٹ سے زیادہ اپنے بولرز کے لئے مددگار ثابت ہوتے ہیں اور جب ان کی ٹیم بیٹنگ کر رہی ہو تو بیٹسمین سے زیادہ فیلڈروں کی حرکات و سکنات پر توجہ دیتے ہیں تاکہ کسی کے آؤٹ ہونے نہ ہونے پر لاعلمی کا اظہار کر سکیں۔ دورہ کرنے والی ٹیم کے کھلاڑی ان کی ان حرکات یا غلط فیصلوں کا اس لئے برا نہیں مانتے کہ برا مان کے بھی وہ اتنے خوفناک ایمپائروں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ بے چارے سہم کے رہ جاتے ہیں۔ مارچ ۸۸ء میں پاکستانی ٹیم ویسٹ انڈیز کے دورے پر جا رہی ہے۔ دیکھیں وہاں کے ایمپائر کیا سلوک کرتے ہیں۔ ویسے مجھے تو لگتا ہے کہ عمران خان کی ریٹائرمنٹ میں ان وحشی ایمپائروں کا بھی حصہ ہے۔

نیوزی لینڈ کے ایمپائر بھی اپنی بے ایمانیوں کی لاجواب شہرت رکھتے ہیں۔ خصوصاً ویسٹ انڈیز اور آسٹریلیا کے خلاف کوئی میچ ہو رہا ہو تو ان کی بے ایمانی عروج پر ہوتی ہے۔ ان کے خلاف غلط فیصلے دیتے وقت ایمپائروں کے چہرے کھل اٹھتے ہیں اور آؤٹ دینے یا اپیل ٹھکرانے کے اسٹائل میں ایک حسن آ جاتا ہے۔ بے ایمانی کے اعتبار سے نیوزی لینڈ کے ایمپائر دنیا بھر میں دوسرے یا تیسرے نمبر پر آتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لئے یہ نمبر ون بھی رہے ہیں مگر اب یہ ناقابلِ فخر پوزیشن ان سے ایک اور ملک کے ایمپائروں نے چھین لی ہے جس کے بارے میں آپ کو میں اس مضمون میں آگے چل کر بتاؤں گا۔

بعض پاکستانی ایمپائروں نے بھی بے ایمانی کے معاملے میں آنے والی ٹیموں کو کبھی مایوس نہیں کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے اکثر غلط فیصلے انہوں نے جان بوجھ کر نہ دیئے ہوں بلکہ اپنی نالائقی کے باعث غلطی سے دے دیئے ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایسے ہی ایک فیصلے پر بھارتی کھلاڑی کپیل دیو نے بڑے

وحشیانہ ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ لاہور ٹیسٹ میں جب اسے ایل بی ڈبلیو آؤٹ قرار دیا گیا تو پہلے تو وہ وہیں کھڑے کھڑے بڑا سخت ناراض ہوا۔ پھر زمین کو ٹھوکریں وغیرہ مارتا ہوا واپس پویلین کو لوٹا اور پھر وہاں ڈریسنگ روم میں گھس کے توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ کچھ فرنیچر توڑا اور مکا مار کے کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ ایمپائر خوش قسمتی سے اس وقت گراؤنڈ میں تھا ورنہ کپیل دیو پتہ نہیں اس کا کیا حشر کرتا۔

ایسا ہی ایک واقعہ انگلینڈ کے کھلاڑی ڈیرک رینڈل کے ساتھ پیش آیا تھا جب لاہور ہی کے ٹیسٹ میچ میں ایمپائر شکور رانا نے اسے دونوں اننگز میں بیٹ اینڈ پیڈ کیچ آؤٹ دے دیا تھا حالانکہ سب لوگوں کے خیال میں اس وقت رینڈل کو شک کا فائدہ ملنا چاہیئے تھا۔

انہی شکور رانا نے جب ۱۹۸۰ء میں ویسٹ انڈیز کی ٹیم پاکستان آئی تھی تو ملتان کے میچ میں ظہیر عباس کو صاف بچا لیا تھا جبکہ اسٹیڈیم میں بیٹھے ہوئے ہر تماشائی نے یہ صاف دیکھا تھا کہ بیٹ کو لگنے کے بعد گیند تھی ہو کے سلپ پر گئی تھی جہاں کیچ ہو گئی۔ بہر حال بات چونکہ ملک کے فائدے کی تھی لہذا سب چپ رہے بلکہ دل میں شکور رانا کو داد دی کہ شاباش ان کی بے ایمانیوں کا کچھ تو حساب برابر کیا۔

پاکستانی ایمپائروں میں خضر حیات بھی بہت متنازعہ ایمپائر رہے ہیں۔ ان کی ڈسی ہوئی کئی ٹیمیں پاکستان سے روتی دھوتی واپس جا چکی ہیں۔ بھارت اور نیوزی لینڈ کو تو ان پر سخت اعتراض رہا ہے۔ بلکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اخبار میں خضر حیات سے منسوب ایک بیان بھی چھپ چکا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ فلاں میٹ میں مجھے بے ایمانی کرنے کے لئے سرکاری طور پر کہا گیا تھا لہذا میں اب ایمپائرنگ نہیں کروں گا.... وغیرہ وغیرہ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلط فیصلوں میں فقط ایمپائر کی نالائقی ہی کا دخل نہیں ہوتا بلکہ کچھ اور بھی گڑبڑ ہوتی ہے۔

اب آیئے کچھ بھارتی ایمپائروں کی بات ہو جائے۔ مجھے پتہ ہے کہ بھارت کا تو ہر ایمپائر آپ کو بُرا اور بے ایمان لگتا ہو گا۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ ان کے تمام ایمپائر بے ایمان نہیں ہیں بلکہ صرف نوّے فیصد بے ایمان ہیں باقی دس فیصد بے ایمانی کرنے کے قائل ہی نہیں۔ دھولی لال، امونمنت راؤ، گنگولی اور گوتھاسکر۔ یہ وہ نام ہیں جو ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کے حسین چہرے پر لاتعداد دھبے لگا چکے ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے میں ان کی ایمپائرنگ کا معیار قدرے بہتر ہوا ہے ورنہ اس سے قبل جو ٹیم بھی بھارت کے دورے پر آئی بلبلاتی ہوئی واپس گئی۔ بیشتر نے واپسی کے وقت ائیرپورٹ پر گھٹنے ٹیک دیئے۔ اور دعا کی "اے خداوند! ہمیں بے وقت کی بارش سے، آنے والی آفات سے اور بھارتی ایمپائروں سے اپنی پناہ میں رکھ اور ہماری قسمت میں اگر پھر سے بھارت کا دورہ کرنا لکھا ہے تو اسے کاٹ دے یا ہماری زندگی مختصر کر دے۔ (آمین)

پاکستان کی طرف سے جاوید میانداد بھارت کے بے ایمان ایمپائروں کا مرغوب کھلاڑی ہے۔ اس کے تو اگر کندھے پر بال بھی لگ جائے تو وہ اسے ایل بی ڈبلیو قرار دینے سے نہیں چوکتے۔ ۱۹۸۰ء کے دورے میں غالباً جب اُسے پانچویں بار ایل بی ڈبلیو آؤٹ دیا گیا تھا، تو اس نے وکٹوں پر بلاّ دے مارا تھا اور بڑا ہنگامہ ہوا تھا کیونکہ وہ لوگ اپنی بے ایمانی کو ہٹ دھرمی کے ساتھ منوانے کے عادی ہیں لہٰذا کسی قسم کا احتجاج پسند نہیں کرتے۔

کیتھ فلیچر، کم ہیوز، کلائیو لائیڈ اور آصف اقبال یہ تمام ایسے کپتان ہیں جو کھلے الفاظ میں بھارتی ایمپائروں کو بے ایمان ایمپائروں کا خطاب عطا کر چکے ہیں۔ گیارہ کی بجائے تیرہ کھلاڑیوں سے کھیلنے والا محاورہ بھارتی ایمپائروں کی بدولت ہی رائج ہوا ہے۔

اب باقی رہے سری لنکا کے ایمپائر تو جناب یہی وہ مایہ ناز نمبرون ایمپائر ہیں جو ٹیسٹ کرکٹ میں نمودار ہوتے ہی بے ایمانی کی دنیا پر چھا گئے ہیں۔ یوں جیسے سری لنکا کے ساحلوں سے گھنگھور گھٹائیں اٹھ اٹھ کے ہر وقت برستی رہتی ہیں یا تامل علیحدگی پسندوں کی علیحدگی پسندیاں اپنی بہار دکھاتی رہتی ہیں ان کی بے ایمانیاں بھی مہمان ٹیموں پر چھم چھم برستی ہیں۔ اتنا برستی ہیں کہ سیلاب آجاتا ہے اور مہمان ٹیم بے ایمانی میں غرق ہو جاتی ہے۔ تب یہ ساحل پہ کھڑے ہو کے مسکراتے ہیں اور بے ایمانی ان کی پیٹھ تھپتھپاتی ہے۔

سری لنکا کے نہ صرف ایمپائر ہی بے ایمانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے بلکہ ان کے کھلاڑی اور تماشائی بھی اپنے اپنے کردار میں ان سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس کے عوام ایمپائروں کی بے ایمانی پر دل کھول کر ان کا ساتھ دیتے ہیں، حوصلہ بڑھاتے ہیں اور اپنے محسنوں تک کو نہیں بخشتے۔ میرا مطلب پاکستان سے ہے کہ جس ملک نے ان کو ٹیسٹ میچ کھیلنے کا درجہ دلانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا اس کے ساتھ بھی ان کے ایمپائروں، کھلاڑیوں اور تماشائیوں نے گزشتہ دورے میں وہ سلوک کیا تھا کہ آئندہ کم از کم دس برس تک پاکستانی ٹیم کو سری لنکا کا دورہ کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔

پاکستان اور بھارت میں منعقد ہونے والے آئندہ ورلڈ کپ ٹورنامنٹ میں بھی دنیا بھر سے بہت سارے ایمپائر اکٹھے ہو رہے ہیں۔ ان میں مایہ ناز بے ایمان ایمپائروں کی اچھی خاصی تعداد بھی شامل ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگ اس ٹورنامنٹ میں ان کی بے ایمانیوں کا جلوہ دیکھنے سے محروم رہیں گے کیونکہ یہاں وہ لوگ عموماً نیوٹرل ایمپائرز کے طور پر کام کریں گے اور دو غیر ممالک کے درمیان ہونے والے میچوں کی ایمپائرنگ کریں گے۔ پھر بے ایمانی کا کیا فائدہ اور کیا مزہ۔ لیکن زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ورلڈ کپ کے فوراً بعد دنیا بھر میں بہت سارے ٹیسٹ میچ ہونے والے ہیں۔ آیئے بے ایمانیوں سے پیدا ہونے والی سنسنی خیزی کے لئے ان کا انتظار کریں۔

اِک نیا کمال
اِک نیا معیار
نئے دور کی نئی پینسل
Goldfish
DELUXE PENCIL
شاہ سنز لمیٹڈ
ڈی ۸۸ - الیس - آئی - ٹی - ای - کراچی
فون : ۲۹۳۴۵۱ ، ۲۹۳۴۵۲
Midas Khi

انیسویں صدی کا کھلاڑی کرکٹ کے لباس میں

کرکٹ کی کہانی

عین عین جعفری

کرکٹ کے کھیل کا باقاعدہ آغاز کب اور کس طرح ہوا۔ اس کے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ کرکٹ کے مؤرخین کا خیال ہے کہ کسی لڑکے نے کھیل ہی کھیل میں دوسرے لڑکے کی جانب پتھر اچھالنا شروع کر دیا ہوگا۔ جسے غالباً اس لڑکے نے کسی لکڑی سے روکا یا واپس کیا ہوگا۔ یوں کرکٹ کی ابتدا ہوئی ہوگی۔ اس کا اندازہ لفظ کرکٹ سے بھی ہوتا ہے۔ جو غالباً لفظ Crook سے نکلا ہے۔ Crook اُس لکڑی کو کہا جاتا ہے جس سے چرواہے بھیڑ بکریوں کو ہانکتے ہیں۔ غالباً یہی لکڑی کرکٹ کا اوّلین بیٹ رہی ہوگی۔

البتّہ کرکٹ کی ابتدا کے بارے میں ایک بات یقین سے کہی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ اس کھیل کا آغاز یورپ سے ہوا۔ ۱۲۳۰ء کی ایک پینٹنگ میں ایک نوجوان کو گیند پکڑے ہوئے اور ایک دوسرے شخص کو ڈنڈے سے اسٹروک لگاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ اوّل کے دور کی ایک یادداشت سے پتہ چلتا ہے کہ شہزادہ ایڈورڈ، Creag نامی کھیل میں نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے۔ بلکہ اس میں وہ خود بھی حصّہ لیا کرتے تھے۔ ۱۵۹۸ء کی ایک یادداشت سے پتہ چلتا ہے سرے کے علاقے گلڈ فورڈ میں اسکول کے بچّے یہ کھیل کھیلا کرتے تھے۔ ملکہ الزبتھ اوّل کے دورِ حکومت (۱۵۵۸ء تا ۱۶۰۳ء) میں کرکٹ عام لوگوں کا ایک مقبول کھیل بن چکا تھا مگر اُس کی وفات کے بعد اس کھیل پر زوال آیا اور شرفا اور خواص اس کھیل کو تضیعِ اوقات سمجھنے لگے۔ بعد ازاں کرکٹ کے شوقینوں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جانے لگیں۔

اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دی جانے لگیں۔ جن میں سے ایک پابندی یہ تھی کہ یہ کھیل اتوار کے دن نہیں کھیلا جائے گا۔ ۱۶۲۲ء، ۱۶۴۷ء اور ۱۶۵۴ء میں متعدد افراد کو اتوار کے دن کرکٹ کھیلنے کے جُرم میں سزائیں سُنائی گئیں۔

مگر جلد ہی حالات بدل گئے اور انگلستان میں اولیور کرامویل برسرِ اقتدار آ گئے جو خود مختلف کھیلوں کے دلدادہ تھے۔ اُن کے دور میں لندن کے بیشتر اُمرا اور نواب اپنی اپنی جاگیروں پر منتقل ہو گئے۔ جہاں فرصت ہی فرصت تھی۔ اُن کی سرپرستی حاصل ہونے کے باعث اس دور میں کرکٹ کو ایک بار پھر مقبولیّت حاصل ہونا شروع ہو گئی۔ بعض امرا اور رؤسا نے اپنے اپنے علاقوں کے اچھے کھلاڑیوں کو اچھے مشاہرے پر ملازم رکھنا شروع کر دیا۔ یوں پیشہ وارانہ کرکٹ کا آغاز ہوا۔ اس زمانے میں جو شہر کرکٹ کے اچھے مراکز بنے ان میں لندن کے علاوہ ہمپشائر، کینٹ، سرے اور سسکس کے نام خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ اُس زمانے کے جس پہلے کرکٹ میچ کا تذکرہ کتابوں میں محفوظ ہے وہ ۱۶۹۷ء میں سسکس کے مقام پر کھیلا گیا تھا۔ کرکٹ کا وہ پہلا میچ جس کا پورا اسکور کارڈ دستیاب ہے، ۱۸ جون ۱۷۴۴ء کو لندن کے آرٹیلری گراؤنڈ میں انگلینڈ اور کینٹ کی ٹیموں کے درمیان کھیلا گیا تھا۔ چار اننگوں پر مشتمل اس کھیل کا زیادہ سے زیادہ انفرادی اسکور ۱۸ رنز تھا۔ یہ میچ کینٹ نے ایک وکٹ سے جیتا تھا۔

کرکٹ کے قوانین

۱۷۷۴ء سے پہلے کرکٹ کے کوئی باقاعدہ قوانین موجود نہیں تھے۔ اور فریقین عموماً میچ شروع ہونے سے پہلے چند قواعد طے کر لیا کرتے تھے۔ جب کوئی ایسا واقعہ پیش آتا جن کا ذکر ان طے شدہ قواعد میں نہ ہوتا تو صورتِ حال کشیدہ ہو جاتی اور بعض اوقات نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی۔ چنانچہ ان مسائل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طے کرنے کے لیے ۲۵ فروری ۱۷۷۴ء کو لندن کرکٹ کلب نے پہلی مرتبہ کرکٹ قوانین میں کرکٹ کے بیٹ کی لمبائی چوڑائی، گیند کا وزن اور آؤٹ ہونے کے اصول شامل تھے۔ قوانین وضع کئے ان قوانین میں وکٹوں کی تعداد دو متعیّن کی گئی تھی۔ مگر مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ جب کسی کھلاڑی کو رَن آؤٹ کرنے کے لیے گیند وکٹوں پر ماری جاتی تھی وہ ان دونوں وکٹوں کے درمیان سے نکل جاتی تھی۔ چنانچہ ۱۷۷۶ء میں ان دونوں وکٹوں کے درمیان ایک نئی وکٹ کا اضافہ کیا گیا۔ ۱۷۸۵ء میں بیلز کی تعداد بھی ایک سے بڑھا کر دو کر دی گئی۔ ۱۷۸۷ء میں کرکٹ کا مشہورِ زمانہ کلب میریلبون کرکٹ کلب جسے عرفِ عام میں ایم سی سی کہا جاتا ہے، وجود میں آیا۔ ایک برس بعد ایم سی سی نے کرکٹ کے قوانین

کرکٹ کے بلّے کا پانچ مرحلوں میں ارتقا

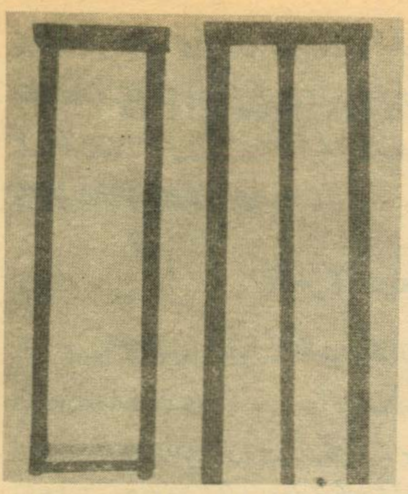

وکٹوں کی ابتدائی شکلیں

پر نظرِ ثانی کی تب سے اب تک کرکٹ کے قاعدے اور قوانین مرتب کرنے کی ذمّہ داری ایم سی سی ہی کے سپرُد چلی آئی ہے۔ چنانچہ جب ۱۸۳۵ء میں کرکٹ کے قوانین کا ازسرِ نو جائزہ لینے کا مرحلہ درپیش ہوا تو یہ ذمّہ داری ایم سی سی ہی کے سپرُد کی گئی۔ چنانچہ اِس برس کرکٹ کے بیٹ کی لمبائی ۳۸ اِنچ اور فالو آن کے قوانین متعین کیے گئے۔

بین الاقوامی کرکٹ

۱۸۴۴ء میں کرکٹ کا پہلا بین الاقوامی میچ امریکہ اور کینیڈا کے درمیان کھیلا گیا۔ اور پندرہ برس بعد ۱۸۵۹ء میں انگلستان کی ٹیم جارج پار کی قیادت میں کینیڈا پہنچی۔ یوں انگلستان کو کسی غیر ملک کی سرزمین پر کرکٹ کھیلنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۸۶۸ء میں آسٹریلیا کی ٹیم انگلستان آئی۔ ان واقعات سے کرکٹ کی بین الاقوامی طور پر مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا۔ جن جن ممالک میں انگلستان کی نو آبادیاں تھیں وہاں بھی کرکٹ کا کھیل برطانوی فوجیوں کے ذریعے پہنچا اور بہت مقبول ہوا۔

۱۸۷۶ء میں انگلستان کی ایک ٹیم، جے لِلّی وہائٹ کی قیادت میں آسٹریلیا پہنچی۔ جس نے ۱۵ر مارچ ۱۸۷۷ء سے ۱۷ر مارچ ۱۸۷۷ء تک ملبورن کے مقام پر دنیا کا پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا۔ انگلستان کے بالر الفریڈ شا نے ٹیسٹ کرکٹ کی پہلی گیند پھینکی اور آسٹریلیا کے بیٹسمین چارلس بینر مین نے ٹیسٹ کرکٹ کی پہلی گیند کھیلی۔

پہلا رَن بنایا اور پہلی سنچری بنائی۔ یہ تاریخی میچ آسٹریلیا نے ۴۵ رنز کی برتری سے جیت لیا۔ اس سلسلے میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اِس میچ کو اُس وقت ٹیسٹ میچ قرار نہیں دیا گیا۔ اِس کے سولہ سترہ سال بعد تک انگلستان، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے درمیان بہت سے بین الاقوامی میچ کھیلے گئے۔ ٹیسٹ کی اصطلاح پہلی بار ۹۵-۱۸۹۴ء میں استعمال ہوئی۔

ایشز کا استعمال

۱۸۸۲ء میں جب آسٹریلیا کی ٹیم انگلستان کے دورے پر آئی ہوئی تھی تو اوول کے میدان میں آسٹریلیا نے انگلستان کو سات رَن سے شکست دے دی۔ اس غیر متوقع شکست نے انگریزوں کے وقار کو سخت دھچکہ پہنچایا۔ اور لندن کے اخبار "دی اسپورٹنگ ٹائمز" نے سیاہ حاشیوں کے ساتھ انگلش کرکٹ کا ایک فرضی تعزیت نامہ چھاپ دیا۔ جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ "انگلش کرکٹ کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اس کا جسدِ خاکی نذرِ آتش کیا جا چکا ہے اور اب اس کی خاک Ashes آسٹریلیا لے جائی جا رہی ہے۔

اگلے سیزن میں جب انگلستان کی ٹیم آئی وُو بلائی کی قیادت میں آسٹریلیا روانہ ہوئی تو انھوں نے آسٹریلیا پہنچ کر اخبار نویسوں کو اس تعزیت نامے کے حوالے سے بتایا کہ وہ اور ان کی ٹیم کے ارکان یہاں اِس راکھ کے حصول کے لیے آئے ہیں جو گزشتہ سال آسٹریلیا کے کھلاڑی میچ جیت کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

یہ سیریز انگلستان نے جیت لی۔ میچ ختم ہونے کے بعد کرکٹ کی دو دلدادہ خواتین کسی طرح میچ میں استعمال ہونے والی ایک بیل Bail حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں اور اس بیل کو جلا کر اس کی راکھ کو مٹی کے ایک خوبصورت خاکدان میں بند کر کے ایک مخملیں غلاف میں لپیٹ کر انگلستان کے کپتان کو پیش کر دیا اور کہا "یہ وہ راکھ ہے جس کی تلاش میں آپ نے ہزاروں میل کا سفر اختیار کیا"۔ آئی وو بلائی نے یہ خاکدان شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ اور ان خواتین کی اس ادا سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان میں سے ایک خاتون فلارنس روز مورنی کو زندگی بھر کے لیے اپنا شریکِ سفر بنالیا۔ یہ خاکدان ساری زندگی آئی وو بلائی کے پاس رہا۔ ۱۹۲۷ء میں ان کی وفات کے بعد اُسے آئی سی سی کے صدر دفتر لارڈز میں رکھ دیا گیا۔ اِسی خاکدان کی یاد میں انگلستان اور آسٹریلیا کے درمیان ٹیسٹ سیریز کو ایشز کہا جاتا ہے۔

آئی۔سی۔سی کا قیام

۸۹-۱۸۸۸ء میں انگلستان کی ٹیم نے جنوبی افریقہ کا دورہ کیا اور وہاں دو ٹیسٹ میچ کھیلے یہ دونوں

ٹیسٹ انگلستان کی ٹیم نے جیت لیے اب انگلستان اور آسٹریلیا کے بعد جنوبی افریقہ بھی ٹیسٹ میچ کھیلنے والے ممالک میں شامل ہو چکا تھا اور ٹیسٹ کرکٹ کا دائرہ تین برّاعظموں تک وسیع ہو چکا تھا۔ چنانچہ جنوبی افریقہ نے میچوں کے انعقاد اور بین الاقوامی کرکٹ کا نظم ونسق سنبھالنے کے لیے ایک تنظیم کے قیام کی تجویز پیش کی چنانچہ ۱۵ جون ۱۹۰۹ء کو امپیریل کرکٹ کانفرنس (آئی سی سی) کا قیام عمل میں آیا اور انگلستان، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کو آئی سی سی کا بنیادی رکن بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۵ جولائی ۱۹۶۵ء کو آئی سی سی کا نام تبدیل کر کے انٹرنیشنل کرکٹ کانفرنس رکھ دیا گیا۔

غرب الہند، نیوزی لینڈ اور ہندوستان

انگلستان، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ تو آئی سی سی کے بنیادی ارکان بن ہی چکے تھے اور وہاں ٹیسٹ کرکٹ کا سلسلہ جاری تھا۔ دوسری طرف غرب الہند، نیوزی لینڈ اور ہندوستان کے ممالک تھے جہاں مقامی سطح پر تو کرکٹ کی تنظیمیں موجود تھیں مگر ابھی وہاں بین الاقوامی کرکٹ کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

ان ممالک کی کرکٹ کی تاریخ میں ۳۱ مئی ۱۹۲۶ء ایک یادگار تاریخ ہے جب انھیں آئی سی سی کی رکنیت کا اعزاز حاصل ہوا۔ مگر اب بھی ان ممالک کو ٹیسٹ میچ کھیلنے کے لیے چند برسوں کا انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں غرب الہند نے ۳۰-۱۹۲۹ء میں نیوزی لینڈ نے اور ۱۹۳۲ء میں ہندوستان نے اپنے پہلے ٹیسٹ میچ کھیلے۔ یہاں یہ بات خصوصاً قابلِ ذکر ہے کہ ان تینوں ملکوں نے اپنے پہلے ٹیسٹ میچ انگلستان کے خلاف کھیلے تھے ...

پاکستان

۱۹۴۷ء میں پاکستان آزاد ہوا تو کرکٹ کا شوق اُسے ورثے میں ملا۔ ۱۹۴۸ء میں یہاں کرکٹ کے فروغ کے لیے بورڈ آف کنٹرول فار کرکٹ ان پاکستان (بی سی سی پی) کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدائی تین چار سالوں میں ویسٹ انڈیز، ایم سی سی، کامن ویلتھ اور سری لنکا کی ٹیموں نے یہاں کا دورہ کیا اور متعدد میچ کھیلے۔

۲ دسمبر ۱۹۵۱ء کی تاریخ پاکستان کی کرکٹ کی ایک اہم تاریخ ہے۔ اُس دن کراچی جمخانہ گراؤنڈ پر پاکستان نے ایم سی سی کو چھ وکٹوں سے شکست دے کر آئی سی سی کی رکنیت کی بنیادی شرط پوری کر دی اور یوں ۲۱ جولائی ۱۹۵۲ء کو پاکستان آئی سی سی کا رکن بنا لیا گیا۔ اسی برس پاکستان نے بھارت کا دورہ کیا اور ۱۶ سے ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۲ء تک دہلی کے مقام پر پہلا ٹیسٹ میچ کھیل کر ٹیسٹ کرکٹ میں اپنے سفر کا آغاز کیا۔ یہ میچ بھارت نے

ایک اننگ اور ۷۰ رن سے جیت لیا۔ مگر اگلے ہی ٹیسٹ میچ میں جو لکھنؤ کے مقام پر کھیلا گیا پاکستان نے بھارت کو ایک اننگ اور ۴۳ رنز سے ہرا کر اس شکست کا بدلہ لے لیا۔

سری لنکا

۲۱ جولائی ۱۹۸۱ء کو سری لنکا کو آئی سی سی کی رکنیت ملی۔ سری لنکا نے یہ رکنیت بھارت کی ٹیم کو شکست دے کر حاصل کی۔ ۱۹۸۴ء میں سری لنکا نے اپنے پہلے دورۂ انگلستان میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور انگلستان کی ٹیم بڑی مشکل سے فالو آن کا شکار ہونے سے بچی۔

عالمی کپ

کرکٹ میں ایک روزہ میچوں کی پذیرائی کے بعد ۱۹۷۵ء سے ہر چار سال بعد کرکٹ کے عالمی کپ کے مقابلوں کا انعقاد شروع کیا گیا۔ ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۹ء کے عالمی کپ غرب الہند نے، ۱۹۸۳ء کا عالمی کپ ایک سنسنی خیز مقابلے کے بعد بھارت کی ٹیم نے جیتا۔ اب اکتوبر اور نومبر ۱۹۸۷ء میں چوتھے عالمی کپ کا انعقاد مشترکہ طور پر بھارت اور پاکستان میں ہو رہا ہے۔ دیکھئے قسمت اب کس ملک کو اس عالمی کپ کا حق دار بناتی ہے؟

میں کرکٹر بنوں گا

شہنواز فاروقی

بے کار کام ہے یہ ہرگز نہیں پڑھوں گا   کہتا ہے میرا بیٹا میں کرکٹر بنوں گا
کہتا ہے چیخ کرکے پڑھنے سے فائدہ کیا   تم ہی بتاؤ تم نے پڑھ کرکے کر لیا کیا؟

گھر میں ہمارے ٹی وی رنگین تک نہیں ہے   لنڈے کا بھی مکاں میں قالین تک نہیں ہے
چھوٹا سا اک فریج ہے وہ بھی بہت پرانا   سو بار سڑ چکا ہے جس میں غریب کھانا

اک ریڈیو ہے گھر میں صورت ہے جس کی رونی   سُن کرکے یاد جس کو آتا ہے مار کوئی
اک سائیکل ہے گھر میں جس پر سوار ہو کر   ہر آدمی مناسب سمجھے گا خود کو جوکر

جس کو چلا کر رسلر چیکرم بھی ہونکتا ہے   آواز جس کی سُن کر ہر کُتّ بھونکتا ہے
گھر میں غرض کہ کوئی شے کام کی نہیں ہے   صورت کوئی بھی یعنی آرام کی نہیں ہے

جاوید کو ہی دیکھو دسویں تلک پڑھا ہے   انبار زر میں لیکن پورا دبا پڑا ہے
دولت بھی پاس اس کے شہرت بھی پاس اس کے   عزّت بھی پاس اس کے عظمت بھی پاس اس کے

زیرو ہیں آپ اور وہ ہیرو میرے وطن کا   احساس کچھ تو کیجئے اس دَور کے چلن کا
مفہوم صرف یہ ہے ڈیڈی میرے سُخن کا   میں بھی کر دوں گا روشن یوں نام اب وطن کا

سو میں نے طے کیا ہے، میں کرکٹر بنوں گا   پڑھ لکھ کے آپ جیسا ہرگز نہ مسٹر بنوں گا

ایمپائر کے اشارے کو سمجھئے

کرکٹ
کا قاعدہ

فیاض اعوان

یہ لیجیے کرکٹرز کا قاعدہ تیار ہو گیا۔ آپ لوگوں کو گلہ رہتا تھا کہ شہر جائیں تو کسی بھی دکان پر کرکٹرز کا قاعدہ ہی نہیں ملتا۔ حالانکہ قاعدہ کہاں سے ملتا۔ آج تک کسی نے کرکٹرز کا قاعدہ ہی نہیں لکھا اور سب چیزوں کے قاعدے موجود ہیں اور کرکٹرز کا قاعدہ ہی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ فلم تک کا قاعدہ مل جاتا ہے، مگر کرکٹ کا قاعدہ نہیں ملتا۔ تو اب یہ ہم نے تیار کر دیا ہے۔

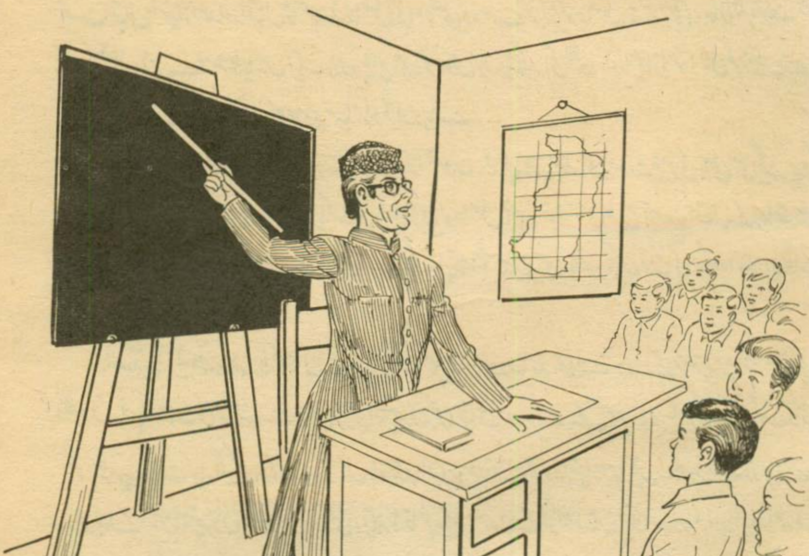

یہ قاعدہ 'الف' سے 'ے' کرَیٰ 'تک کے پاکستانی کرکٹرز کا ہے۔ان میں وہ کھلاڑی بھی شامل ہیں جو آپ کے ابو کی عمر کے ہیں اور اب دادا بن رہے ہیں۔یعنی ریٹائرڈ کرکٹر اور وہ کرکٹرز بھی ہیں جو آپ سے بس ذرا بڑے ہیں۔ میرا مطلب ہے عمران خان، جاوید میانداد، مدثر نذر، وسیم اکرم، سلیم ملک اور رمیز راجہ وغیرہ...آپ سمجھ گئے ہوں گے۔کرکٹرز کے اس قاعدے میں 'آج' کے کھلاڑی بھی شامل ہیں۔

الف : الف سے اللہ ہوتا ہے۔جو سب سے بڑا اور ہر چیز کا مالک ہے، الف سے احمد بھی ہوتا ہے۔ جو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نام ہے۔الف سے 'آنکھ مچولی' بھی ہے۔الف سے اسٹیڈیم بھی ہوتا ہے اور الف سے ایمپائر بھی ہوتا ہے۔وہ ہوتا تو ہماری آپ کی طرح انسان ہی ہے، لیکن اس کی انگلی میں عجب کرشمہ ہوتا ہے۔بڑے سے بڑا کھلاڑی بھی اس کی انگلی اُٹھتے ہی آؤٹ ہو جاتا ہے۔'الف' اردو قاعدے کا پہلا حرف ہے اور تمام حروف کا سردار ہے۔کرکٹرز میں بڑے بڑے نامی گرامی کرکٹر 'الف' سے ہوئے ہیں ان میں امیر الٰہی، آفاق حسین، اسرار علی، احتشام الدین، اعجاز بٹ، آفتاب گل، انٹاڈی سوزا، آصف مسعود، اظہر خان آغاز زاہد، آفتاب بلوچ، آغا سعادت علی، انور حسین اور اعجاز فقیہہ بھی شامل ہیں۔لیکن جو شہرت انتخاب عالم، آصف اقبال، امتیاز احمد اور اقبال قاسم نے حاصل کی وہ کسی دوسرے کرکٹر کو حاصل نہ ہو سکی۔حالانکہ آصف مجتبیٰ بھی کم نہیں جس نے آسٹریلیا میں ایک روزہ میچ میں دھواں دار بیٹنگ کی تھی۔اور اعجاز احمد بھی کم نہیں جسے دنیا کے عظیم کھلاڑیوں نے مستقبل کا جاوید میانداد قرار دیا ہے۔

انتخاب عالم کی وجۂ شہرت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے پہلے ہی ٹیسٹ میچ کی پہلی ہی گیند پر وکٹ حاصل کی تھی۔یہ اعزاز کسی دوسرے پاکستانی کھلاڑی کو حاصل نہیں ہوا۔اسی طرح آصف اقبال کے ساتھ مل کر نویں وکٹ کا عالمی ریکارڈ انھوں نے قائم کیا۔وہ ایک اچھے بیٹسمین بھی تھے۔لیکن اُن کی لیگ اسپن بولنگ اور گگلی تو دنیا بھر میں مشہور ہے۔

امتیاز احمد پاکستان کے پہلے وکٹ کیپر ہیں اور ساتھ ہی اپنے دور کے بہترین بیٹسمین بھی ہیں انھوں نے پاکستان کی جانب سے پہلی ڈبل سینچری بھی بنائی اور وکٹ کے پیچھے ۷۷ کیچ اور ۱۶ کھلاڑیوں کو اسٹمپ آؤٹ کیا۔اگر کسی وکٹ کیپر کو 'آل راؤنڈر' کہا جا سکتا ہے تو وہ امتیاز احمد ہیں۔انھوں نے دو ہزار سے زائد رنز بنائے، تین سینچریاں اسکور کیں اور کئی ریکارڈ قائم کیے۔'الف' کے کرکٹرز میں انتخاب عالم اور امتیاز احمد عالمی شہرت یافتہ کرکٹر ہیں لیکن...

اقبال قاسم بھی کم نہیں ہیں وہ سو سے زیادہ وکٹیں حاصل کر چکے ہیں۔اور پاکستان میں انڈین ٹیم

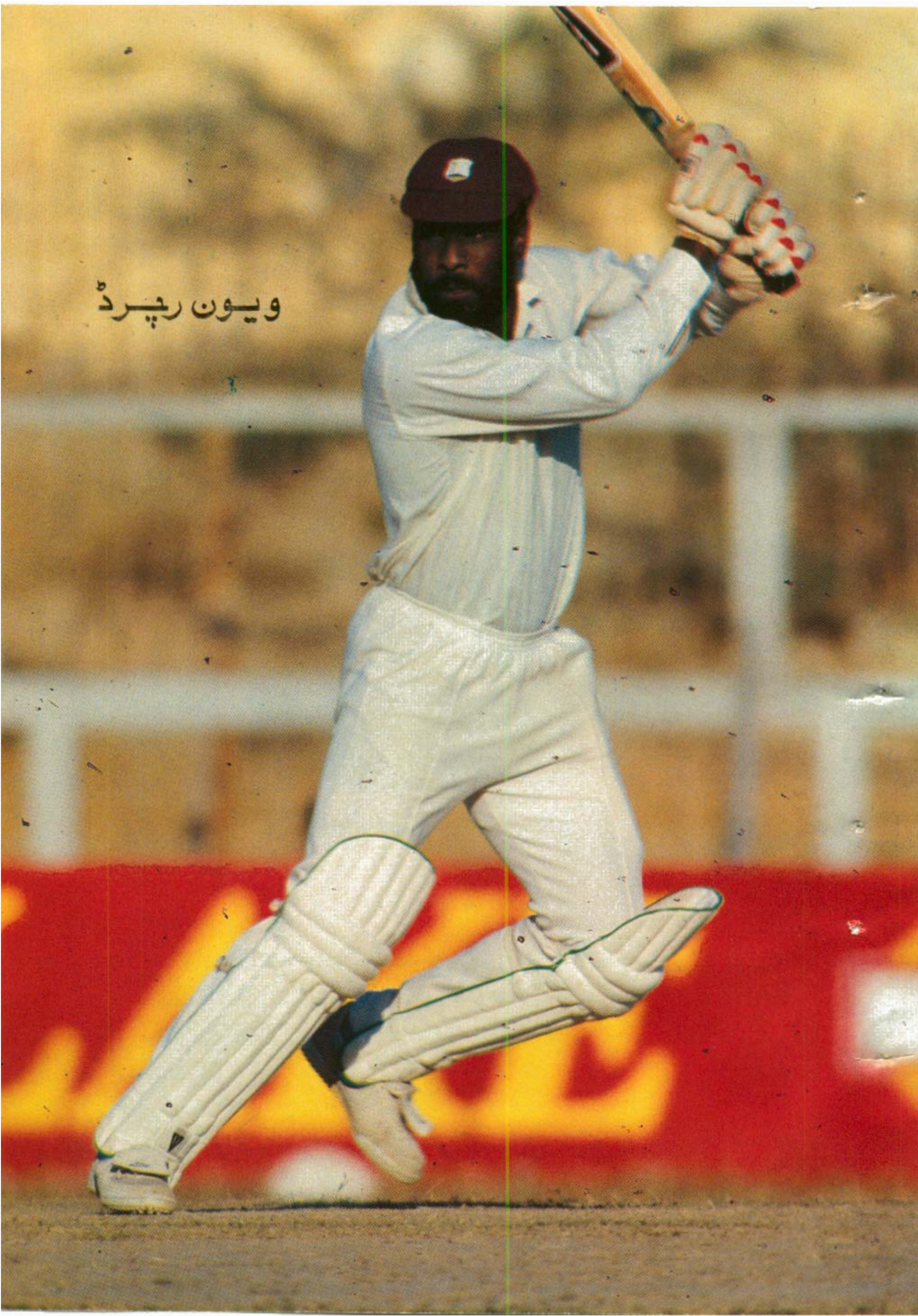

ویون رچرڈ

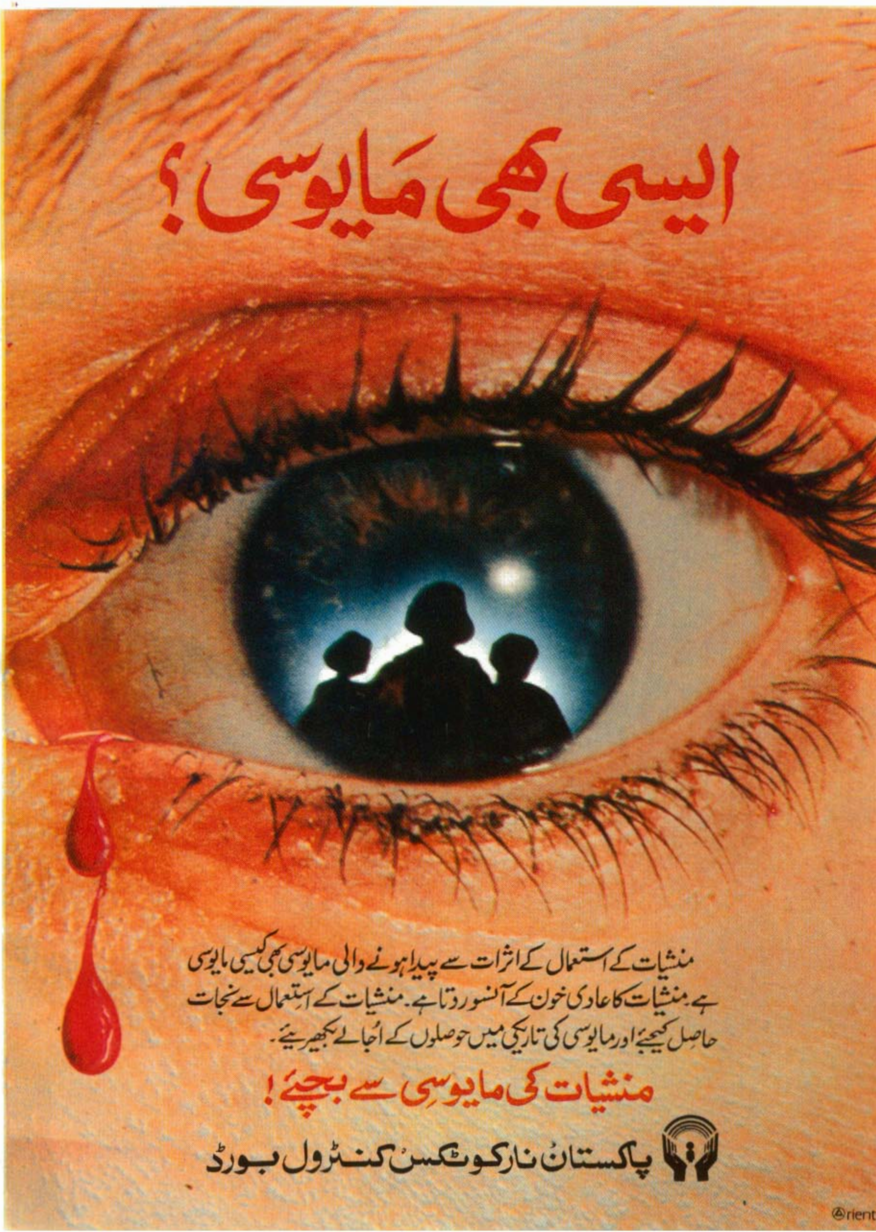

ایسی بھی مایوسی؟
منشیات کے استعمال کے اثرات سے پیدا ہونے والی مایوسی بھی کیسی مایوسی ہے۔ منشیات کا عادی خون کے آنسو روتا ہے۔ منشیات کے استعمال سے نجات حاصل کیجیے اور مایوسی کی تاریکی میں حوصلوں کے اُجالے بکھیریئے۔
منشیات کی مایوسی سے بچیئے!
پاکستان نارکوٹکس کنٹرول بورڈ
Orient

کو ہرانے اور پھر انڈین ٹیم کو کانپور ٹیسٹ میں ہرانے کے 'ہیرو' ہیں۔ 'الف' کے ایک اور کھلاڑی آصف اقبال بھی ہیں اور کہتے ہیں وہی 'الف' کے سب سے بڑے کھلاڑی ہیں۔ ان کی شہرت کی وجہ ان کا تیزی سے رنز بنانا بہترین فیلڈنگ کرنا تھا۔ انھوں نے ۳۵۷۵ رنز بنائے۔ گیارہ سینچریاں بنائیں اور ۵۳ وکٹیں لیں۔ گویا وہ ایک عظیم آل راؤنڈر تھے۔ اپنے آخری ٹیسٹ میں جو کلکتہ میں ہوا جب وہ رَن آؤٹ ہوئے تو پورا اسٹیڈیم کھڑا ہو گیا آج بھی جب وہ کہیں سے گزرتے ہیں تو لوگ ان کا اسی محبت سے استقبال کرتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کو یاد ہے کہ وہ کتنے اچھے اور تیز کھلاڑی تھے۔

ب : ب سے بچّے ہوتے ہیں جو بہت شرارتی ہوتے ہیں۔ 'ب' سے بے ایمان ہوتا ہے جو عموماً کرکٹر ایمپائر ہوتے ہیں۔

پ : 'پ' سے پاندان ہوتا ہے، جو دادی جان کے پاس ہوتا ہے۔ البتہ کرکٹرز میں 'پ' سے صرف ... **پرویز سجّاد** ہے۔ پرویز سجّاد نے یوں تو بحیثیت لیگ اسپنر ہر ملک کے خلاف بہت نام کمایا، لیکن جو حشر اُس نے نیوزی لینڈ کا کیا وہ نیوزی لینڈ والے بھی نہیں بھول سکتے۔ وہ ایک بہترین بولر تھا۔ لیکن پھر اچانک ٹیسٹ کرکٹ سے غائب ہو گیا۔ کچھ بھی ہو اپنے حرف 'پ' کا وہ واحد اور عظیم کھلاڑی ہے۔

ت : 'ت' سے توتلا ہوتا ہے۔ بچّو! آپ میں سے جو توتلا ہو وہ ہاتھ کھڑا کرے ہم اُسے کرکٹ کا ایمپائر بنا دیں گے۔ 'ت' سے کرکٹر میں دو نامور کھلاڑی ہیں ایک **تسلیم عارف** جو وکٹ کیپر تھے لیکن شہرت انھوں نے بحیثیت بیٹسمین کے پائی۔ جب فیصل آباد میں ڈبل سینچری بنائی۔ دوسرے کرکٹر **توصیف احمد** ہیں۔ جو کلب کرکٹ سے ڈائریکٹ ٹیسٹ کرکٹ میں آ گئے ہیں۔ توصیف کے دو کارنامے مشہور ہیں۔ ایک شارجہ کپ میں انڈیا کے خلاف جب انھوں نے ایک رن بنایا تھا اور دوسرے اینڈ پر جاوید میانداد کو پہنچایا تھا... جاوید میانداد نے پھر آخری بال پر چھکّا مار کر پاکستان کو تاریخی فتح سے ہمکنار کیا تھا، لیکن بچّو اگر توصیف ایک رن نہ بناتے تو نہ جاوید میانداد چھکّا مار سکتے اور نہ ہی پاکستان وہ فتح حاصل کر سکتے۔ اس لیے اصل اہمیّت توصیف احمد کے ایک رن کی ہے۔ دوسرا کارنامہ انڈیا ہی کے خلاف کانپور ٹیسٹ میں بہترین بولنگ کرنا ہے دوسری اننگ میں اقبال قاسم کے ساتھ مل کر انھوں نے انڈین ٹیم کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اور یوں دونوں نے پانچ پانچ وکٹیں لیں اور پاکستان نہ صرف ٹیسٹ میچ بلکہ ٹیسٹ سیریز جیت کر آیا۔

بچّو! ہمارے خیال میں توصیف احمد ہی 'ت' کے بہترین کھلاڑی ہیں۔

ٹ : 'ٹ' سے ٹوپی ہوتی ہے جو عموماً نماز پڑھتے وقت پہنی جاتی ہے۔ 'ٹ' سے ٹماٹر بھی ہوتے ہیں جو

خراب بیٹنگ یا بولنگ کرنے والی ٹیم کو مارے جاتے ہیں۔ 'ٹ' سے تختہ بھی ہوتا ہے، جو عموماً کرکٹر کا اُتر جاتا ہے۔
لیکن قاعدے میں 'ٹ' سے کوئی کرکٹر نہیں ہوتا۔ اس لیے بچّو 'ٹ' کو ٹالو۔

ث : 'ث' سے ثابت "ث" سے ثمر "ث" سے اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے، لیکن افسوس کہ اب تک اس نام سے کوئی ٹیسٹ کرکٹر نہیں ہوا۔

ج : بچّو! 'ج' کی ہم کیا تعریف کریں۔ ساری دنیا 'ج' سے **جاوید میانداد** کی تعریف کر رہی ہے ڈان بریڈمین، سوبرز، اور گاواسکر سب کو جاوید میانداد ہی سے خطرہ ہے کہ وہ کہیں ان کی سینچریوں یا رنز کے تمام ریکارڈ مات نہ کر دے۔ جاوید میاں داد ایسا کر بھی سکتا ہے۔ اپنے پہلے ٹیسٹ میں سینچری بنانے والا یہ عظیم کھلاڑی چھ ہزار رنز بنانے والا پہلا پاکستانی کھلاڑی ہے، سب سے زیادہ سینچریاں '۱۵' بنانے کا ریکارڈ بھی اسی کا ہے۔ مدثر نذر کے ساتھ مل کر '۴۵۱' رنز کی پارٹنر شپ کا عالمی ریکارڈ بھی اسی کا ہے۔ اب اس کی نظر سوبرز کے ۳۶۵ رنز اور گاواسکر کے دس ہزار سے زیادہ رنز پر ہے۔ وہ دونوں ریکارڈ توڑ دینا چاہتا ہے۔ اسی لیے دنیا کے عظیم کھلاڑی اس سے ڈرے ہوئے ہیں۔۔۔ 'ج' سے جاوید برکی بھی ہے۔ لیکن اس کی شہرت ایک 'ناکام کپتان' کی ہے۔ انگلستان کے دورے میں انھوں نے پانچ میں سے چار ٹیسٹ اس شان سے ہارے کہ آج تک نہیں بھولے۔

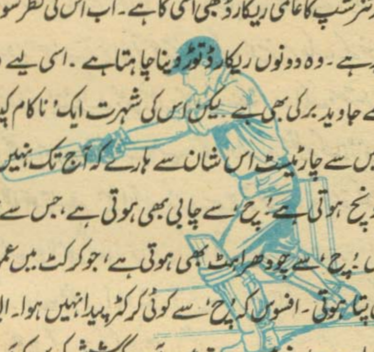

چ : 'چ' سے چونچ ہوتی ہے۔ 'چ' سے چابی بھی ہوتی ہے، جس سے چور قُفل کھول لیتے ہیں۔ اور مال لے کر رفوچکّر ہو جاتے ہیں۔ 'چ' سے چودھراہٹ بھی ہوتی ہے، جو کرکٹ میں عموماً اُن لوگوں کی ہوتی ہے جنھیں کرکٹ کی الف، ب بھی نہیں پتا ہوتی۔ افسوس کہ 'چ' سے کوئی کرکٹر پیدا نہیں ہوا۔ البتہ کرکٹرز کے بے شمار چمچے پیدا ہوتے ہیں۔ بچّو! چمچے ہر دور اور ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ آپ کوشش کریں کہ آپ میں سے کوئی کسی کا چمچہ نہ ہو۔ کیونکہ یہ بہت بُرا ہوتا ہے۔

ح : 'ح' سے حاتم ہے۔ جو سخاوت اور فیّاضی میں اپنی مثال آپ ہے۔ 'ح' سے حلال بھی ہوتا ہے اور حرام بھی ہوتا ہے۔ بچّو! حلوہ بھی 'ح' سے ہوتا ہے۔ جو بچے مزے مزے سے کھاتے ہیں 'ح' سے حاجی بھی ہوتا ہے۔ اور 'ح' سے حاسد بھی ہوتا ہے۔ 'ح' سے کرکٹر میں حسیب احسن ہیں۔ جو اپنے دور کے بہترین آف اسپنر تھے اور ان دنوں سلیکشن کمیٹی کے اہم رکن ہیں۔ 'ح' سے حنیف محمد بھی ہیں اور حفیظ کاردار بھی۔ ان میں حفیظ کاردار کی شہرت تو اس لیے ہے کہ وہ پاکستان کے پہلے کپتان تھے۔ آج تک ان کا شمار پاکستان کے بہترین کپتان کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ لیکن کرکٹ کی دنیا میں جو شہرت 'ح' سے حنیف محمد نے حاصل کی ہے۔ وہ شاید سوائے عمران خان کے کوئی نہ حاصل کر سکا۔ انھوں نے فرسٹ کلاس کرکٹ میں ۴۹۹ رنز بنانے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا جو آج تک قائم ہے انھوں نے

۹۷۰ منٹ مسلسل بیٹنگ کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ جو آج تک قائم ہے۔ دنیا کے صرف دو کھلاڑی سوبرز اور لین ہٹن کا حنیف محمد سے زیادہ ہے، باقی سب سے آگے حنیف محمد ہیں۔ کہتے ہیں ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ میں اگر گیارہ کھلاڑیوں کی ٹیم بنائی جائے تو حنیف محمد کا نام اس میں ضرور آئے گا۔ مجھ سے جاوید میاں داد اور ظہیر عباس نے ایک بار کہا تھا کہ پاکستان ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے بڑا نام حنیف محمد کا ہے جبکہ بولنگ میں عمران خان ہے۔ اس سے آپ 'ح' سے حنیف محمد کی عظمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

خ: 'خ' سے خرگوش ہوتا ہے۔ خالہ بھی 'خ' سے ہوتی ہے۔ 'خ' سے خالد عباد اللہ بھی ہے۔ جس نے اپنے پہلے ٹیسٹ میچ میں آسٹریلیا کی مضبوط ٹیم کے خلاف ۱۶۶ رنز اسکور کیا تھا۔ اس کے بعد اگرچہ جاوید میاں داد اور سلیم ملک نے بھی یہ اعزاز حاصل کیا۔ مگر زیادہ اسکور خالد عباد اللہ ہی کا رہا۔ لیکن 'خ' کے کھلاڑیوں میں سب سے بڑا نام **خان محمد** کا ہے۔ وہ میڈیم فاسٹ بولر تھے اور پاکستان کی ٹیسٹ ٹیم میں شامل تھے اگرچہ انھوں نے صرف ۱۳ ٹیسٹ کھیلے لیکن ان کی کارکردگی نہایت شاندار رہی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انھوں نے تیرہ میں سے چار میچوں میں پانچ پانچ سے زیادہ وکٹیں لیں۔ اور ۲۳٫۹۰ کی اوسط سے ۵۴ وکٹیں حاصل کیں۔

د: 'د' سے دال جو عموماً غریبوں کی قسمت میں ہوتی ہے۔ 'د' سے دوست جو سچا اور پکا تو کوئی کوئی ہوتا ہے۔

ڈ: 'ڈ' سے ڈاکو ہوتا ہے، جو دن دھاڑے بینک لوٹ کرلے جاتا ہے۔ 'ڈ' سے ڈھول بھی ہوتا ہے جو اَن پڑھ بجائے تو مراثی کہلاتا ہے اور اگر پڑھا لکھا بجائے تو فنکار کہلاتا ہے۔

ذ: 'ذ' سے ذات ہوتی ہے۔ 'ذ' سے ذرا ہوتا ہے، لیکن کرکٹ میں کوئی بھی 'ذ' سے نہیں ہوتا۔ اس لیے بچو! ہم آگے چلتے ہیں، مگر ٹھہریئے ابھی ابھی پتہ چلا ہے، 'ذ' سے تو مشہور کرکٹر **ذوالفقار احمد** ہے۔ جس نے نو ٹیسٹوں میں بیس وکٹیں لی تھیں ۔۔۔

ر: 'ر' سے ریچھ ہوتا ہے۔ 'ر' سے ربڑ ہوتا ہے۔ 'ر' سے راجہ بھی ہے۔ جو **رمیز راجہ** کا بڑا بھائی ہے۔ رمیز راجہ کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہماری موجودہ قومی کرکٹ ٹیم کا بہترین بیٹسمین ہے۔ جس کے بارے میں عمران خان نے کہا کہ وہ مستقبل کا بہترین اور عظیم کھلاڑی ثابت ہو گا اپنے بھائی وسیم راجہ سے بھی بڑا کھلاڑی

ڑ: چونکہ 'ڑ' سے کوئی بھی لفظ شروع نہیں ہوتا اس لیے اس سے کسی کھلاڑی کا نام بھی شروع نہیں ہوتا۔

ز: بچو! 'ز' سے زبان ہوتی ہے، جو عموماً بدتمیز بچوں کی بہت بڑی ہوتی ہے اسی لیے وہ زبان دراز کہلاتے ہیں۔ 'ز' سے زخم بھی ہوتا ہے جو اکثر گیند لگنے سے کھلاڑیوں کے حصے میں آتا ہے، لیکن جس طرح 'ڑ' سے کوئی کھلاڑی نہیں ہوتا۔ 'ز' سے بھی نہیں ہوتا۔

س : 'س' سے سورج 'س' سے سانپ اور 'س' سے سکندر بخت، جس نے انڈیا میں ایک میچ میں آٹھ وکٹیں لیں اور کئی بار عمدہ بولنگ کی۔ 'س' سے سلیم الطاف، سعادت علی بھی ہیں۔ لیکن کرکٹر میں 'س' سے **سعید احمد** **سرفراز نواز** اور اب **سلیم ملک** اور **سلیم یوسف** بڑے کھلاڑی ہیں۔ سعید احمد نے بحیثیت بیٹسمین دو ہزار سے زیادہ اسکور کیا۔ کئی سینچریاں بنائیں، جبکہ سرفراز نواز، عمران خان کے بعد سب سے زیادہ '۱۷۹' وکٹیں حاصل کرنے والے بولر ہیں۔ انھوں نے سڈنی ٹیسٹ میں آسٹریلیا کے خلاف ایک ٹیسٹ کی ایک اننگ میں 'نو' وکٹیں حاصل کیں۔ پاکستان ٹیسٹ کرکٹ میں اس طرح وہ ایک اننگ میں ریکارڈ وکٹیں حاصل کرنے والے بولر ہیں۔ عمران خان سے بھی بڑے بولر، سرفراز نواز صوبائی اسمبلی کے ممبر بھی ہیں۔ الغرض 'س' کے عظیم کھلاڑیوں میں سرفراز نواز، سرفہرست ہیں۔ ان کے بعد سعید احمد اور سلیم ملک کا نمبر آتا ہے۔

ش : 'ش' سے شرارت جو بچّے خوب کرتے ہیں۔ 'ش' سے شام جو خوشگوار ہوتی ہے۔ 'ش' سے شرافت بھی ہوتی ہے۔ جو اب بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ کرکٹرز کے قاعدے میں 'ش' سے شفیق احمد ہیں، جو فرسٹ کلاس کرکٹ میں خوب کھیلتے ہیں، لیکن ٹیسٹ کرکٹ میں اگر بیمار بیمار سے ہو جاتے ہیں۔ 'ش' سے شکور رانا بھی ہیں جو مشہور ایمپائر ہیں۔ وہ کراچی ٹیسٹ میں ایک بار اپنی کیپ اور ڈریس بھول آئے تھے۔ اور اس طرح کرکٹ بک میں انھوں نے اپنا نام درج کروالیا تھا۔ 'ش' سے شفقت رانا بھی ہیں، جو کبھی بڑے تیز کھیلنے والے کرکٹر تھے۔ موجودہ قومی ٹیم میں '**شعیب محمد**' اہم نام ہے جن سے مستقبل کے لیے بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

ص : 'ص' سے صنوبر، 'ص' سے صبر اور 'ص' سے اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے، لیکن کرکٹر میں صلاح الدین اور صادق محمد ہیں۔ ان میں صادق محمد بڑے کھلاڑی ہیں۔ انھوں نے کئی بار پاکستانی ٹیم کو بھنور سے نکالا کئی سینچریاں بنائیں اور وکٹ پارٹنرشپ میں کئی ریکارڈ بنائے۔ وہ مشہور کرکٹر، حنیف محمد، مشتاق محمد اور وزیر محمد کے چھوٹے بھائی ہیں، لیکن ان کی شہرت کی وجہ ان کا بہترین اوپننگ بیٹسمین ہونا ہے۔ ان کے بعد اب تک پاکستانی ٹیم کو ان جیسا اوپننگ بیٹسمین نہیں مل سکا۔

ض : 'ض' سے کرکٹر کے قاعدے میں کچھ بھی نہیں، کیونکہ 'ض' سے کوئی ٹیسٹ کرکٹر ہی نہیں ہوا۔

ط : 'ط' سے طوطا ہوتا ہے۔ بچو! انسانوں میں بھی بہت سے لوگ طوطے ہوتے ہیں۔ کرکٹرز میں 'ط' سے **طلعت علی** ہیں، لیکن یہ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

ظ : 'ظ' سے ظلم اور ظ سے **ظہیر عباس**، بچو! اس کا مطلب ہے پاکستان ٹیسٹ کرکٹ کے تین عظیم بیٹسمینوں میں آخری کا ذکر آچکا ہے، پہلے حنیف محمد اور جاوید میاں داد ہیں، لیکن فرسٹ کلاس اور ون ڈے

کرکٹ میں ظہیر عباس کا نام سب سے بلند ہے۔ وہ واحد ایشیائی ہیں جنھوں نے سو سے زیادہ سینچریاں بنائیں۔۔ ون ڈے کرکٹ میں پاکستان کی جانب سے سب سے زیادہ 'سات' سینچریاں بنانے کا اعزاز بھی اُن کے پاس ہے۔ جب کہ ٹیسٹ کرکٹ میں چار ڈبل سینچریوں کا ریکارڈ بھی انھی کے پاس ہے۔ ریکارڈز کے اعتبار سے ظہیر عباس پاکستان کے نمبر ون بیٹسمین ہیں۔ اور ہاں بچّو! انگلینڈ کی ٹیم کو پاکستان میں شکست دینے والے کپتان بھی۔۔۔ ظہیر عباس ہیں۔

ع : یوں تو 'ع' سے عینک اور عقل بھی ہوتی ہے۔ لیکن کرکٹرز کے قاعدے میں ع سے علیم الدین، عارف بٹ' اور عظمت رانا ہوتے ہیں، لیکن ایک عظیم نام **عبدالقادر** کا ہے وہ پاکستان کے ہی نہیں دُنیا کے بہترین لیگ بریک بولر ہیں۔ انھوں نے اب تک سو سے زیادہ وکٹیں حاصل کی ہیں۔ اور انگلینڈ، آسٹریلیا، انڈیا اور دُنیا کی ہر ٹیم کے خلاف اپنی بولنگ کا لوہا منوایا ہے۔ لیکن جب نام **عمران خان** کا آجائے تو۔۔۔ عبدالقادر جیسے عظیم بولر بھی چھوٹے لگنے لگتے ہیں۔ جی ہاں بچو! اب ذکر 'ع' سے عمران خان کا ہوتا ہے۔ جنھوں نے ایشیا میں بولنگ کے تمام ریکارڈ مات کر دیے ہیں، تین سو گیارہ وکٹیں اور ایک سیریز میں ۴۰ وکٹیں، انگلینڈ سری لنکا، انڈیا اور آسٹریلیا جیسی ٹیموں کو سیریز میں شکست دینا، دنیا کے ہر نامور بیٹسمین کو آؤٹ کرنا، غرض عمران خان کے کارنامے اتنے ہیں کہ بیان نہیں کیے جا سکتے۔ رچی بینو، حنیف محمد، گاواسکر اور دنیا کے سب ہی نامور کھلاڑی عمران خان کو موجودہ عہد کا عظیم ترین بولر تسلیم کرتے ہیں۔

غ : بچّو! 'ع' کے بعد 'غ' ہوتی ہے۔ 'غ' سے غبارہ ہوتا ہے جس میں ہوا بھری ہوتی ہے۔ کرکٹرز میں 'غ' سے صرف غلام عباس یا غزالی ایم ای زیڈ کا نام ملتا ہے۔ بس 'غ' اتنی ہی اہم ہے۔

ف : 'ف' بہت اہم حرف ہے۔ اس سے فوج ہوتی ہے جو جنگ لڑتی ہے۔ جبکہ کرکٹرز میں 'ف' سے فاروق حمید اور فرخ زمان شامل ہیں لیکن اس حرف کے عظیم کرکٹر **فضل محمود** ہیں۔ وہ پاکستان کی پہلی کرکٹ ٹیم کے ساتھ بھارت گئے تھے اور پھر سات برس تک کرکٹ کھیلتے رہے۔ اس مختصر عرصہ میں انھوں نے جو ریکارڈ قائم کیے وہ بیس برس تک قائم رہے اور بعد میں عمران خان نے وہ ریکارڈ توڑ دیے لیکن ان کے بہت سے ریکارڈ اب بھی قائم ہیں۔ جن میں ایک عالمی ریکارڈ بھی ہے۔ ان کا ایک عالمی ریکارڈ ایک جائزے میں ظاہر ہوا۔ جب دنیا بھر کے سو وکٹیں لینے والے بولروں کی ایوریج معلوم کی گئی۔ اسی میں اندازہ ہوا کہ فضل محمود نے سب سے کم رنز دے کر اور بہترین اوسط کے ساتھ سو وکٹیں لی ہیں۔ فضل محمود کے کئی ریکارڈ اب تک قائم ہیں۔

ق : 'ق' سے قلم جو لکھنے کے کام آتا ہے۔ 'ق' سے قینچی۔ 'ق' سے قوم، کرکٹ میں 'ق' سے صرف قادر ہے۔

لیکن بہت سے بچے چلا اُٹھیں گے کہ اُسے تو ہم 'ع' سے عبدالقادر میں شامل کر چکے ہیں۔

ک : 'ک' سے کتّا جو بہت وفادار ہوتا ہے۔ 'ک' سے کراچی جو پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے، 'ک' سے کاردار بھی ہے جس کا ذکر ہم 'ح' میں کر چکے ہیں۔

گ : 'گ' سے گوبھی، 'گ' سے گاجر اور 'گ' سے گل محمد۔ جی ہاں یہی وہ واحد کرکٹر 'گ' میں پائے جاتے ہیں لیکن وہ اس اعتبار سے اہم کھلاڑی ہیں کہ نہ صرف پاکستان سے بلکہ بھارت کی جانب سے بھی ٹیسٹ میچ کھیل چکے ہیں… ظاہر ہے یہ منفرد اعزاز ہے۔

ل : بچو! 'ل' سے لاہور جو پاکستان کا دِل ہے، 'ل' سے لومڑی جو جانوروں میں سب سے چالاک سمجھی جاتی ہے۔ 'ل' سے لنگور بھی ہوتا ہے، لیکن کرکٹرز میں 'ل' سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

م : 'م' سے مقصود احمد، منیر ملک، میران بخش، محمود حسین، محمد مناف گزرے ہیں۔ موجودہ ٹیم میں محسن حسن خان بھی ہیں جو اِن دنوں ناراض ہیں، لیکن منصور اختر اور مدثر نذر، منظور الٰہی اور محسن کمال بدستور ٹیم میں کھیل رہے ہیں۔ ان میں **مدثر نذر** بہت بڑا نام ہے۔ انھوں نے میانداد کے ساتھ '۴۵۱' رنز کی پارٹنر شپ کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ ایک میچ میں سست ترین سینچری کا ریکارڈ بنایا۔ اور ایک بار کیری بیک کیا یعنی شروع سے کھیلتے گئے اور آخر تک آؤٹ نہیں ہوئے۔ وہ اب تک دس سینچریاں اور ایک ڈبل سینچری بھی بنا چکے ہیں۔ کئی اور ریکارڈ بھی انھوں نے بنائے لیکن بہر حال اب تک 'م' نام کے کھلاڑیوں میں جو شہرت **مشتاق محمد** اور **ماجد خان** کو حاصل ہوئی۔ شاید مدثر نذر کو ابھی حاصل نہیں ہوئی۔ مشتاق محمد کو پاکستان کرکٹ کا بہترین آل راؤنڈر بھی کہا جاتا ہے۔ اپنے زمانے میں وہ سب سے کم عمر ٹیسٹ کھلاڑی بھی تھے۔ اور سب سے اہم کپتانوں عبدالحفیظ کاردار اور عمران خان سے بھی کم نہ تھے۔ انھوں نے آسٹریلیا، ویسٹ انڈیز اور بھارت کو شکست دی۔ انھوں نے دس سینچریاں بنائیں۔ ساڑھے تین ہزار رنز بنائے۔ وزڈن کا انعام جیتا اور بقول آصف اقبال…! "مشتاق محمد جیسا کپتان کوئی نہیں ثابت ہوا۔ **ماجد خان** : 'م' نام کے اہم ترین کھلاڑیوں میں سے ہیں۔ لنچ سے پہلے سنچری بنانے والے دنیا کے چوتھے کھلاڑی ہیں۔ گلیمورگن نامی ٹیم کے خلاف ایک اوور کی چھ بالوں میں سے پانچ پر چھکے مارنے کا کارنامہ انجام دیا۔ بحیثیت فیلڈر سب سے زیادہ کیچ لیے۔ ساڑھے تین ہزار اسکور کیا، جن میں آٹھ سینچریاں شامل ہیں۔ کرکٹ میں تمام حروف میں 'م' سب سے بڑا حرف ہے۔ کسی ایک حرف میں اتنے زیادہ بڑے اور شہرہ آفاق کرکٹر پیدا نہیں ہوئے۔

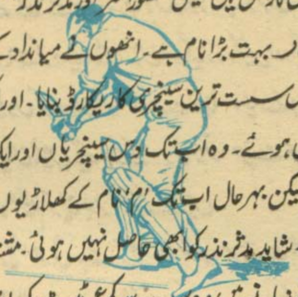

ن : 'ن' سے نام۔ جو ہر چیز کی شناخت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ 'ن' سے نظر جو نہ ہو تو کرکٹر کا قاعدہ نہیں

پڑھا جا سکتا۔ 'ن' سے 'نونی پا'، جو بہت سے بچّوں کو ہنساتا رہا ہے۔ کرکٹر میں 'ن' سے نیاز احمد، نوشاد علی، **نذر محمد** اور **نذیر جونیئر** ہیں۔ ان میں نذر محمد پاکستان کے پہلے سنچری بنانے والے کھلاڑی کا اعزاز رکھتے ہیں۔ جبکہ نذیر جونیئر وہ کھلاڑی ہے جس نے پہلے ہی میچ میں سات وکٹیں لیں، لیکن پھر دس برس تک غائب کر دیا گیا۔ بعد میں بھی اچھا کھیلا لیکن اب پھر کئی برس سے غائب ہے۔ شاید اب کے بیس برس بعد واپسی ہو۔

و : بچّو! اب باری 'و' کی ہے۔ جس سے واہ واہ ہوتی ہے۔ اگر واہ واہ نہ ہو تو نہ ہمارے شعرا شاعری کر سکتے ہیں اور نہ کرکٹرز سنچریاں اور چھکّے مار سکتے ہیں، اسی سے اندازہ کر لیں کہ 'و' سے واہ واہ کتنی اہم ہوتی ہے۔ کرکٹرز میں 'و' سے والس میتھائس، وزیر محمد، وسیم باری، وسیم راجہ، وقار حسن اور اب وسیم اکرم ہوتے ہیں۔ ان میں یوں تو ہر کھلاڑی اپنی جگہ خوب ہے۔ مثلاً وسیم راجہ اپنی تیز اور دھواں دار بیٹنگ میں 'ہیرو' ہیں۔ ویسٹ انڈیز کے خلاف خصوصاً وہ بہت کام آتا ہے۔ اسی طرح **وقار حسن** اپنے دور کے نامور کرکٹر ہیں۔ انھوں نے کئی کارنامے انجام دیے ہیں۔ پھر وہ مقبول بھی بہت تھے۔ انھیں گول گپّے بھی پسند ہیں۔ لیکن 'و' کے سب سے اہم کرکٹر **وسیم باری** ہیں جو وکٹ کیپنگ میں شہرہ آفاق شہرت کے حامل ہیں۔ انھوں نے دو سو کھلاڑیوں کو وکٹ کے پیچھے سے شکار کیا۔ ایک اننگ میں آٹھ کھلاڑیوں کو کیچ آؤٹ کرنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ تقریباً تمام ممالک کے خلاف اننگز، میچ اور سیریز میں زیادہ سے زیادہ کھلاڑیوں کو کیچ آؤٹ کرنے کا اعزاز بھی وسیم باری کے پاس ہے۔ وہ اپنے دور کے عظیم وکٹ کیپروں، ایلن ناٹ اور راڈنی مارش کے ہمعصر تھے۔ اور بلاشبہ پاکستان کرکٹ میں وسیم باری کے مقابلے کا کوئی وکٹ کیپر پیدا نہیں ہوا ہے۔

ھ : بچّو! 'ھ' سے ہاتھ ہوتا ہے۔ 'ہ' سے ہارن بھی ہوتا ہے اور 'ہ' سے کرکٹ کا کھلاڑی ہارون رشید بھی ہے۔ کہتے ہیں دنیا میں اتنی بار کوئی کھلاڑی بارہواں کھلاڑی نہیں بنا جتنا ہارون رشید بنا ہے۔

ی : یہ لیجیے کرکٹرز کا قاعدہ، اب اختتام کو پہنچا۔ کیونکہ حرف 'ی' آ گیا ہے۔ 'ی' سے ویسے تو یکّہ بھی ہوتا ہے، لیکن کرکٹر میں صرف **یونس احمد** ہے۔ جو مشہور کرکٹر سعید احمد کا چھوٹا بھائی ہے یونس احمد نے زیادہ شہرت انگلینڈ میں کمائی۔ جہاں کئی سال وہ کاؤنٹی میچوں میں بہترین کھلاڑی ثابت ہوا۔ لیکن ٹیسٹ کرکٹ میں وہ بدقسمت ثابت ہوا۔ آخری بار وہ انڈین ٹیم کے خلاف گزشتہ برس کھیلا، لیکن جب وہ دورۂ انگلینڈ میں اُسے شامل نہ کیا گیا۔ تو عمران خان کے خلاف بیان بازی شروع کر دی۔ کچھ بھی ہو، کرکٹ میں ایسا ہوتا رہتا ہے، لیکن بڑے اور نامور کھلاڑی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

جہاں قالین وہیں صفائی

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری، کراچی

ہیڈ آفس :
عبداللہ ہارون روڈ فون : ۵۱۱۷۱۱

شاخیں :

- بہادر آباد فون : ۴۱۳۶۹۵
- جمشید روڈ 〃 ۴۱۱۳۰۲
- کھارادر 〃 ۲۲۵۸۰۳
- گارڈن روڈ 〃 ۷۲۲۴۳۳
- برنس روڈ 〃 ۲۰۲۳۳۶
- ڈیفنس فیز V فون : ۵۲۶۵۳۹
- امیر خسرو روڈ 〃 ۴۱۳۶۹۵
- راشد منہاس روڈ 〃 ۴۱۱۳۰۲
- حسن اسکوائر 〃 ۵۲۶۵۳۹

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری

ہیڈ آفس : عبداللہ ہارون روڈ . کراچی فون ۵۱۱۷۱۱ ۵۲۶۵۳۹

زونل آفس : صدر بازار ۔ راولپنڈی فون ۶۷۹۸۸ ۶۳۲۵۰

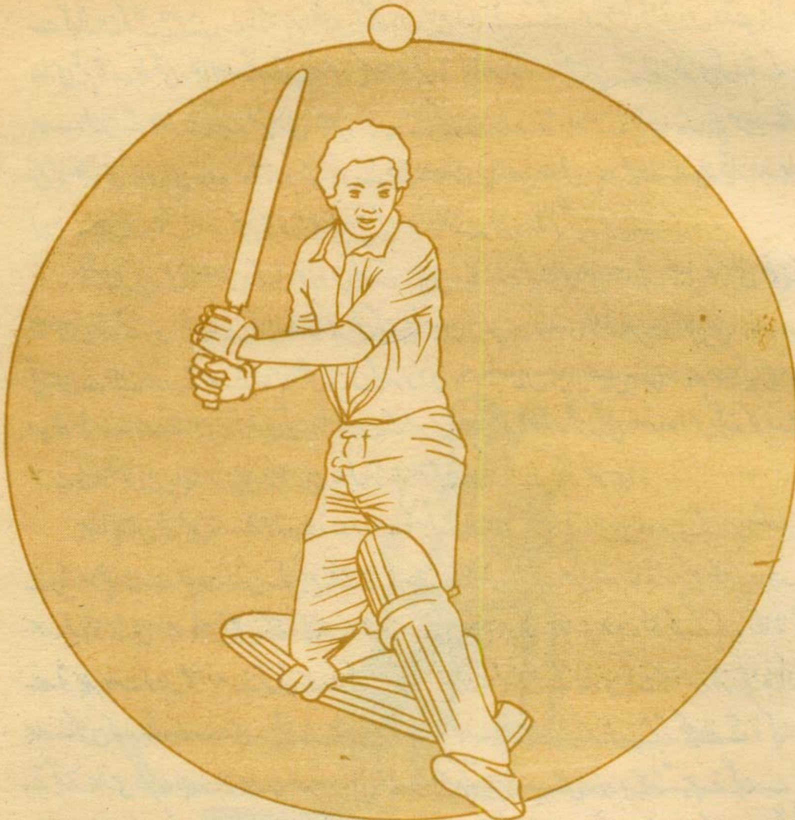

آل راؤنڈر

علی عمران

ہمارے کزن کوئٹہ سے آئے تو ان سے یہ سُن سُن کر ہمارے تو کان پک گئے کہ وہ آل راؤنڈر ہیں۔ ہم خود بھی کرکٹر ہیں مگر خدا کے فضل و کرم سے آل راؤنڈر نہیں ہیں۔ صرف گیندیں پھینکتے ہیں، یعنی بولر ہیں۔ دوسرے روز ہم اپنے کزن کو خوشی خوشی اپنے کپتان کے پاس لے گئے اور ان کی تعریف کرتے ہوئے فخریہ بتایا کہ اِن کا دعویٰ ہے کوئی غیر معمولی بیٹسمین ہی اِن کی گیند کھیل سکتا ہے۔ ہمارا ایک فاسٹ بولر بیمار تھا۔ چنانچہ کپتان نے ہم

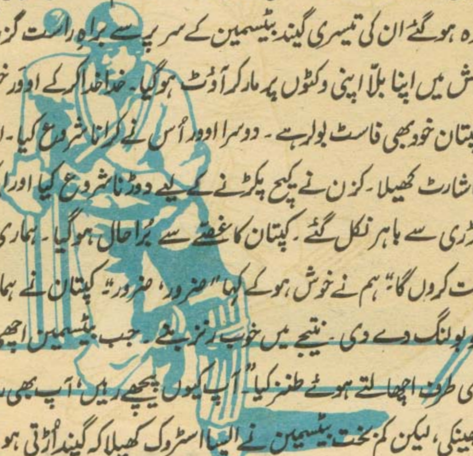

سے کہا کہ ان کو کل میچ میں لے آؤ۔ ہم انھیں اگلے دن میچ کھلانے لے گئے۔ اور بڑی خرابی اس وقت ہوئی جب ہماری ٹیم ٹاس ہار گئی۔ مخالف ٹیم نے پہلے خود کھیلنے کا فیصلہ کیا اور ہمارے کپتان نے فیلڈ کھڑی کرنے کے بعد ہمارے کزن کے ہاتھ میں گیند تھما دی۔ پہلی سلپ میں کپتان موجود تھا۔ دوسری سلپ میں ہم موجود تھے۔ اُن کا افتتاحی کھلاڑی خاصا موٹا تازہ تھا۔ اُس نے فیلڈ کا جائزہ لیا اور اسٹائل سے کھیلنے کے لیے تیار ہوا۔ ہمارے کزن نے بھی پوز بنا کر آہستہ آہستہ دوڑنا شروع کیا اور یکلخت نعرہ لگا کر گیند پھینک دی۔

بیٹسمین پوری کوشش کے باوجود اس گیند کو نہ کھیل سکا۔ (یہ گیند اسی صورت میں کھیلی جاسکتی تھی کہ بیٹسمین خود تیسری سلپ میں کھڑا ہوتا) خیر اگلی گیند بیٹسمین کی کمر سے کوئی دو گز اُدھر سے نکل گئی۔ ہمارے کپتان نے ہمیں گھورتے ہوئے کہا "واقعی ان کی گیند کو کوئی عام بیٹسمین نہیں کھیل سکتا"! ہم بھلا کیا جواب دیتے، شرمندہ ہو گئے۔ ان کی تیسری گیند بیٹسمین کے سر پر سے براہِ راست گزر گئی۔ اور وہ اس گیند کو ہٹ کرنے کی کوشش میں اپنا بلّا اپنی وکٹوں پر مار کر آؤٹ ہو گیا۔ خدا خدا کر کے اوور ختم ہوا۔

ہمارا کپتان خود بھی فاسٹ بولر ہے۔ دوسرا اوور اُس نے کرانا شروع کیا۔ اس کی دوسری گیند پر بیٹسمین نے ایک اونچا شارٹ کھیلا۔ کزن نے کیچ پکڑنے کے لیے دوڑنا شروع کیا اور ایک شاندار کیچ پکڑ کر دوڑتے ہوئے باؤنڈری سے باہر نکل گئے۔ کپتان کا غصّے سے بُرا حال ہو گیا۔ ہماری طرف مُنہ کر کے کہنے لگا "تم سے تو پھر بات کروں گا" ہم نے خوش ہو کے کہا "ضرور، ضرور" کپتان نے ہماری بات کا اِس قدر بُرا مانا کہ پھر ہمارے کزن کو بولنگ دے دی۔ نتیجے میں خوب رنز بنے۔ جب بیٹسمین اچھی طرح جم کر کھیلنے لگے تو کپتان نے گیند ہماری طرف اچھالتے ہوئے طنز کیا "آپ کیوں پیچھے رہیں، آپ بھی رنز دیجئے"۔ ہم نے گیند لے کر احتیاط سے پھینکی، لیکن کم بخت بیٹسمین نے ایسا اسٹروک کھیلا کہ گیند اُڑتی ہوئی تمام فیلڈرز کے سر پر سے گزر گئی غضب خدا کا کیا زبردست چھکّا تھا۔ ہم نے دوسری گیند کرائی۔ بیٹسمین نے اس گیند کو بھی اسی انداز میں کھیلنے کی کوشش کی مگر اس مرتبہ گیند بلّے کے کنارے کو چھو کر سیدھی وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ پہنچ گئی یوں کہ وکٹ کیپر نے پکڑنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ اس سے اگلی گیند پر نیا آنے والا بیٹسمین بھی کیچ آؤٹ ہو گیا۔ اس کا کیچ کپتان نے لیا تھا۔ اس کے بعد مخالف ٹیم نہ سنبھل سکی اور ۱۴۰ رنز پر آؤٹ ہو گئی۔ اس طرح ہمیں ۲۵ اوور میں ۱۴۱ رنز کی ضرورت تھی۔ کپتان چونکہ بہت غصّے میں تھا اس نے میرے پیارے کزن کو تیسرے نمبر پر بیٹنگ کے لیے رکھا۔ ہمارا ابتدائی کھلاڑی پہلی ہی گیند پر وکٹ آؤٹ ہو گیا۔ اب ہمارے کزن کھیلنے گئے اور کئی اوور گزر گئے۔ مگر ان کے بلّے کے نزدیک سے گزرنے والی گیندیں ان کے بلّے پر نہ لگیں۔ اس چکر میں دوسرا

ابتدائی کھلاڑی تیز ہِٹ مارنے کی کوشش میں کیچ آؤٹ ہوگیا۔ اس وقت ہمارا اسکور ۱۵ رنز تھا۔ اور ہمیں فتح کے لیے ۱۲۶ رنز درکار تھے۔ ۷ اوور گزر چکے تھے اور رنز کی اوسط ۷ رنز فی اوور درکار تھی۔ اُن کے اس انداز میں کھیلنے کی وجہ سے مخالف ٹیم نے ان کو آؤٹ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جبکہ دوسرے بیٹسمین مُسلسل آؤٹ ہوتے رہے۔ ۱۳ اوور جب ختم ہوئے تو ہمارا اسکور کل ۴۰ رنز تھا اور چھ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ ۱۴ ویں اوور کی پہلی ہی گیند پر ہمارے وکٹ کیپر آؤٹ ہو گئے۔ اب کپتان نے ہم سے کہا "تم جاؤ"۔ ہم کریز پر پہنچے پہلی گیند کو واپس بولر کی طرف کھیلا۔ دوسری گیند پر اسٹروک کھیل کر رنز بنانے دوڑے۔ جب ہم دوسری طرف دوڑے تو کزن وہاں بدستور موجود تھے۔ ہم واپس اپنی کریز کی طرف دوڑے۔ اس مرتبہ کزن بھی ہمارے ہمراہ دوڑ پڑے۔ ہم جب اپنی کریز میں واپس آئے تو دیکھا کہ کزن بھی آ رہے ہیں۔ چنانچہ ہم تیسری مرتبہ دوڑ پڑے۔ کزن نے پھر ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش کی اور رن آؤٹ ہو گئے۔ اور اس طرح دوڑنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ صرف ایک رن ملا۔ ہمارا اسکور ۴۱ رنز ہو گیا۔ اب ہمیں پورے ۱۰۰ رنز کی ضرورت تھی، لیکن اگلی دو گیندوں پر ہمارے باقی دونوں بیٹسمین آؤٹ ہوئے اور ہم میچ صرف ۹۹ رنز سے ہار گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ کزن گھر میں کھیلتے ہیں۔ کپتان نے میدان سے واپس آتے ہوئے ہمارے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے مشورہ دیا کہ ہم بھی آئندہ اپنے آل راؤنڈر کزن کے ساتھ گھر ہی میں کھیلا کریں کہ یہی ہمارے اور ٹیم کے حق میں بہتر ہے۔! ●●●

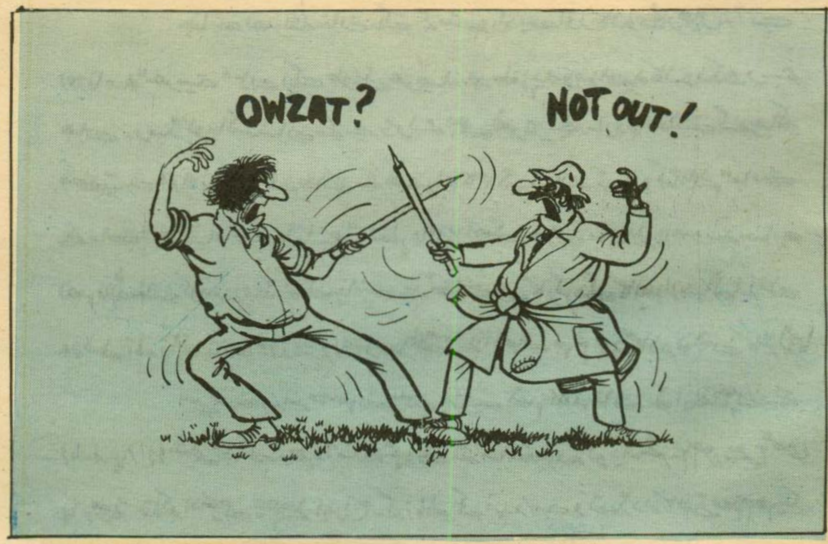

میرے بچپن کا زمانہ

نصراللہ خاں

جناب نصراللہ خاں ملک کے مشہور ادیب اور کالم نگار ہیں۔ آپ روزنامہ "حریت" میں ایک طویل عرصہ سے طنزیہ و مزاحیہ کالم لکھ رہے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے لیے ڈرامے بھی تحریر کیے۔ اردو صحافت کی بیباک شخصیت مولانا ظفر علی خاں کے ہمراہ کام کیا۔ ان کی دو کتابیں "بات سے بات" اور "کیا قافلہ جاتا ہے" منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ پچھلے برسوں جناب نصراللہ خاں کو صدر مملکت کی جانب سے تمغۂ حسن کارکردگی کا اعزاز دیا گیا۔ اس سے قبل آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی نے انھیں بہترین کالم نویس کا ایوارڈ دیا

اس مختصر سے مضمون میں جناب نصراللہ خاں نے اپنے بچپن کے زمانے پر روشنی ڈالی ہے۔ آنکھ مچولی کے ساتھیوں کو یہ تحریر غور سے پڑھنی چاہیے تاکہ انھیں پچھلے اور آج کے زمانے کی تہذیب و تمدّن کا فرق معلوم ہو سکے۔

مجھے اپنا بچپن اپنے بڑھاپے سے زیادہ یاد ہے۔ کیونکہ بڑھاپے میں آدمی پھر بچّہ ہو جاتا ہے۔
مجھے اپنی بسم اللہ کی رسم اس طرح یاد ہے جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ میرے لیے ریشمی شیروانی سلوائی گئی تھی جو میں نے اپنے بسم اللہ کے دن پہنی تھی۔ میرے سر پر کارچوبی ٹوپی تھی۔ گرمی کا زمانہ تھا اور میرے بچپن کے زمانے میں نہ بجلی تھی اور نہ بجلی کے پنکھے تھے۔ میں بسم اللہ کے اس لباس میں پسینے میں شرابور ہو گیا اور رونے لگا، لیکن میرے والد مجھے چمکارتے اور ساتھ ساتھ آنکھیں بھی دکھاتے ہوئے اپنی گود میں اُٹھا کر مہمانوں میں لے آئے۔ اور پھر مجھے اُن مولوی صاحب کی گود میں بٹھا دیا گیا جنھیں بسم اللہ پڑھانا تھی۔ مولوی صاحب کی شکل دیکھ کر میں اور رونے لگا۔ کیونکہ مولوی صاحب کی شکل دیکھ کر مجھ سے بھی بڑے اور اچھے خاصے بچّے رونے لگے تھے۔ پھر مولوی صاحب کی آواز ایسی تھی کہ جسے سُن کر ہنستے ہوئے لوگوں کو بھی رونا آجاتا تھا۔ بہرحال مولوی صاحب نے مجھ سے وہی سلوک کیا جو لوگ میاں مٹھّو سے کرتے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے مجھ سے بسم اللہ پڑھوائی اور پھر وہ کلام پاک کی آیات پڑھتے اور مجھ سے دہرواتے۔ اور آخر میں انھوں نے پھر ایک بار بسم اللہ پڑھوائی اور میں نے وہ بھی پڑھ دی۔ جب مولوی صاحب نے شاباشی دیتے ہوئے میری پیٹھ ٹھونکی اور میں نے پہلے سے زیادہ زور و شور سے رونا شروع کر دیا۔ میں یہ سمجھا کہ جیسے مولوی صاحب نے میری پیٹھ نہیں ٹھونکی ہے، بلکہ مجھے مارا ہے اور پھر مبارک سلامت کا شور اُٹھا اور میرے ابّا کے دوستوں اور میرے رشتہ داروں نے مجھے تحفے دیے، اور میری خالہ نے مجھے لڈّو کھلایا اور پیار کیا اور آخر میں سب مہمانوں میں بسم اللہ کے لڈّو تقسیم ہوئے۔ مہمانوں میں سے بہت سوں نے مجھے پیار بھی کیا اور دعائیں بھی دیں اور میں یہ سمجھا کہ جیسے اس مجمعے میں میرے اور مولوی صاحب کے سوا کسی کو بسم اللہ پڑھنا نہیں آتی۔ میرے بچپن کے زمانے میں صرف بڑے بڑے شہروں میں بجلی تھی وہ بھی اُن شہروں کے کچھ علاقوں میں صرف صاحب لوگوں یا بڑے بڑے رئیسوں کے بنگلوں میں تھی۔ اسی طرح ان بڑے بڑے شہروں کی کسی کسی سڑک پر بجلی کے قمقمے بھی نظر آتے تھے۔ باقی شہروں میں بجلی نہیں تھی اور بعض بڑے بڑے شہروں میں بھی یہ نہیں تھی۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشنوں میں گیس کی بتّیاں یا دیوار سے لگے ہوئے لیمپ نظر آتے تھے۔ عام لوگوں کے گھروں میں جو غریب ہوتے تھے دِیا جلایا جاتا تھا۔ اس دیے میں سرسوں کا تیل ہوتا اور ایک روئی سے بٹی ہوئی بتّی ہوتی اور یہ بتّی ساری رات جلتی رہتی۔ البتّہ امیروں کے گھروں میں دیوار سے لگے ہوئے لیمپ ہوتے، جنھیں دیوار گیریاں کہا جاتا تھا۔ اور جب بجلی ہی نہیں تھی تو بجلی کے پنکھے کہاں ہوتے، نہ ٹی وی تھا نہ ریڈیو تھا اور نہ ریفریجریٹر تھے اور نہ ایئر کنڈیشن تھے، لیکن پھر

بھی لوگ بڑے آرام اور سکون اور اطمینان سے رہتے تھے۔ پنکھوں کی جگہ عام گھروں میں ہاتھ کے پنکھے ہوتے امیر لوگ اپنے کمروں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے ان کمروں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگاتے تھے ان پر خوب پانی چھڑکا جاتا اور جب ان میں سے گرم ہوا گزرتی تو یہ ٹھنڈی اور خوشبودار ہو کر گزرتی۔ بجلی کے پنکھے کی جگہ چھت سے ایسے پنکھے لٹکتے جو اوپر سے لکڑی کے بنے ہوتے۔ اور ان کے نیچے لکڑی کے ساتھ ٹاٹ کا ٹکڑا لگایا جاتا جس کے دونوں طرف لٹھا لگا ہوتا پھر اس پنکھے کو ایک ڈوری سے باندھ کر اس ڈوری کو دروازے سے باہر نکال دیا جاتا اور پنکھے کی ڈوری ہلانے کے لیے ایک نوکر رکھ لیا جاتا۔ یہ نوکر عام طور سے غریب لوگوں کے بچے ہوتے، ان کی تنخواہ چار یا پانچ روپے ماہانہ سے زیادہ نہ ہوتی اور یوں گھر والے پنکھے کی ہوا میں آرام کرتے اور یہ بچہ اس ڈوری کو ہلاتا رہتا۔ اسی طرح میں نے ریلوے اسٹیشنوں کے کمروں میں بھی ایسے ہی پنکھے دیکھے اور وہاں بھی پنکھے کی ڈوری ہلانے کا کام بچوں ہی سے لیا جاتا تھا۔ یہ بڑا ظلم تھا، لیکن یہ ظلم تو ہر زمانے میں اپنی شکل بدلتا ہی رہا ہے۔

میرے بچپن کے زمانے میں صحن کچے ہوتے، گرمی کے زمانے میں شام ہوتے ہی لوگ اپنے صحنوں میں چھڑکاؤ کرتے، مٹی میں سے کیسی سوندھی خوشبو آتی، زمین سستی تھی، آبادی کم تھی۔ لہٰذا آج کل کے گھروں سے اس زمانے کے گھر بڑے ہوتے۔ ہر گھر میں نیم کا درخت یا ایسا ہی کوئی بڑا درخت ہوتا، اس درخت کی وجہ سے خوب ہوا چلتی۔ غرض کہ یہ درخت پنکھا بن جاتا۔ ان گھروں میں پھل دار درخت بھی ہوتے اور پھولوں کی کیاریاں بھی ہوتیں۔ مورسلی، چنبیلی اور موگرے کے پودے بھی ہوتے۔

اس زمانے میں لوگ پانی ٹھنڈا کرنے کے لیے صراحیاں اور مٹکیاں صحن میں لا کر گھڑونچیوں پر رکھ دیتے اور ڈھکن کی جگہ ان پر ململ کا کپڑا باندھ دیتے۔ صبح کے وقت یہ مٹکیاں اور صراحیاں صحن سے اٹھا کر ایسی جگہ رکھ دی جاتیں جہاں سورج کی روشنی ان تک نہ پہنچتی اور پھر کیا بتاؤں کہ ان مٹکیوں اور صراحیوں کا پانی کتنا ٹھنڈا ہوتا۔

میں جس بستی میں رہتا تھا، وہاں نوابی تھی۔ نواب صاحب کے محل میں پانی اس طرح ٹھنڈا کیا جاتا تھا کہ ایک خاص ٹھنڈے کمرے میں جس کی کھڑکیوں میں خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی ہوتی تھیں، تو اس کمرے کی زمین پر بالو یا ریت بچھا دی جاتی اور یہ ریت ہر وقت پانی میں ڈوبی رہتی، اس ریت میں جست کی پتی کی بڑی بڑی بہت سی صراحیاں رکھ دی جاتیں اور ان صراحیوں کے نیچے ایک تہہ قلمی شورے کی بچھا دی جاتی تھی اور جست کی صراحیوں میں جو پانی ہوتا تو وہ برف کے پانی کی طرح ٹھنڈا ہو جاتا۔

میرے بچپن کے زمانے میں گلاسوں کا رواج نہیں تھا، لوگ چاندی تانبے یا کانسی کے نقشین کٹورے میں پانی پیتے تھے۔ کٹورے میں پانی پینے میں بڑا مزا آتا تھا۔ میں اب بھی کٹورے میں پانی پیتا ہوں۔ کٹورے گلاسوں سے زیادہ آسانی سے صاف ہو جاتے ہیں اور پھر ان میں پانی پینے سے ناک اور مُنہ سے ہوا بھی ہمارے جسم میں داخل ہوتی رہتی ہے۔

میرے بچپن کے زمانے میں شہر میں بہت کم موٹریں ہوتی تھیں، لوگ میلوں پیدل چلتے تھے۔ اور جن لوگوں کے پاس بائیسکلیں ہوتی تھیں تو انھیں دولت مند سمجھا جاتا تھا اس زمانے میں بائیسکل کی قیمت ڈیڑھ سو روپے۔ سے لے کر ڈھائی سو روپے تک ہوتی۔ بڑی عمر کے لوگ جب بائیسکل پر سوار ہوتے تو اس طرح ہوتے کہ بائیسکل کے پہیے کے ساتھ ایک لوہے کی کھونٹی تھوڑی سی آگے کی طرف لگی ہوتی تھی۔ وہ اس پر اپنا ایک پاؤں رکھ کر تھوڑے فاصلے تک سائیکل کو گھسیٹتے اور پھر اُچھل کر اپنی ایک ٹانگ بڑھا کر اس کی گدی پہ بیٹھ جاتے اور پھر پیڈل پر اپنے دونوں پاؤں رکھ کر اُسے چلاتے۔ ہم نے ایک بزرگ سے اس طرح بائیسکل پر چڑھنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ "بڑی عمر کے لوگ بندروں کی طرح پیڈل پہ پاؤں رکھ کر اُچھلنے کو معیوب سمجھتے ہیں"۔

میرے بچپن کے زمانے میں گاؤں والوں نے سائیکل نہیں دیکھی تھی تو اُس زمانے میں یہ لطیفہ مشہور ہوا تھا کہ ایک شہری جب بائیسکل پر ایک گاؤں سے گزر رہا تھا تو گاؤں والوں نے یہ سوچا کہ شاید اس بیچارے کی ٹانگوں میں کوئی مشین پھنس گئی ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ چاہیئے کہ اسے اس مشین سے چھٹکارا دلوادیں۔ چنانچہ یہ سب اس کے پیچھے دوڑے اور انھوں نے اُسے سائیکل سے اُتار دیا۔ اور اس کی ٹانگوں میں سے بائیسکل نکال دی۔ اس بات پر اُسے بہت غصّہ آیا اور اُس نے گاؤں والوں کو بُرا بھلا کہا۔ تو ایک گاؤں والے نے کہا کہ "یہ شہری واقعی بہت ناشکرے ہوتے ہیں"۔

میرے بچپن میں سینما بھی نہیں تھے۔ کیونکہ اس کے لیے بھی بجلی کی ضرورت ہوتی ہے البتہ تھیٹر اور نوٹنکیاں بہت تھیں۔ سرکس بھی آتے رہتے تھے۔ جس میں کام کرنے والے اپنے کرتب دکھاتے اور شیر اور بکری ایک ساتھ پانی پیتے اور بندر سائیکل چلاتا۔ اُس زمانے میں امیر لوگوں کے گھروں میں گراموفون ضرور ہوتا تھا جسے فونوگراف یا توے کا باجا کہا جاتا تھا۔ اس پر ایک بھونپو لگا ہوتا تھا۔ ریکارڈ یا توے پر ایک کتّے کی تصویر بنی ہوتی جس کے نیچے انگریزی میں " ہز ماسٹرز وائس " لکھا ہوتا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس ریکارڈ میں اس کُتّے کے مالک کی آواز ہے اور یہ کتّا اپنے مالک کی آواز سُن رہا ہے، حالانکہ یہ ریکارڈ بنانے والی کمپنی کا نام تھا

جب میں نے پہلی مرتبہ گراموفون پر ایک گانا سُنا تو میں حیران رہ گیا اور یہ سوچنے لگا کہ اتنے سے ڈبّے میں گانے والے کو کس طرح بند کیا ہوگا۔ میری سمجھ میں تو کیا بڑے بڑے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس زمانے میں گانے والے اُردو میں گانا گاتے لیکن آخر میں اپنا نام انگریزی میں اس طرح بتاتے کہ مائی نیم از کملا جھریّا۔ یا اندو بالا۔ ایک صاحب محمّد حسین نگینے والے بھی تھے ہم بچّے ان کے گانے بہت شوق سے سنتے تھے۔ مجھے ان کے ایک گانے کے یہ بول یاد رہ گئے ہیں۔

بیٹا جُمّن جُمّن تھوڑی آگ لانا

پھر ایک گیت ایسا تھا کہ ریل گاڑی چل رہی ہے اور یہ جب کسی اسٹیشن پر ٹھہرتی ہے تو مُسلم پانی ہندو پانی۔ ہندو پوری کچوری اور مسلمان گوشت روٹی، غرض کہ اسٹیشن کے سارے خوانچے والوں کی آوازیں سُنائی جاتیں۔ بچّے بار بار یہ ریکارڈ بڑے شوق سے سُنتے۔

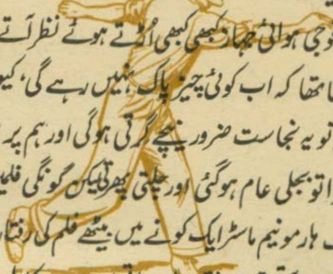

ہوائی جہاز اور وہ بھی فوجی ہوائی جہاز کبھی کبھی اُڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ بعض لوگ انھیں چیل گاڑی کہتے تھے اور کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اب کوئی چیز پاک نہیں رہے گی، کیونکہ ہوائی جہاز میں بیٹھنے والے پیشاب وغیرہ کرتے ہوں گے تو یہ نجاست ضرور نیچے گرتی ہوگی اور ہم پر پڑتی ہوگی۔

پھر جب میں بڑا ہوا تو بجلی عام ہوگئی اور چلتی پھرتی لیکن گونگی فلمیں سینما گھروں میں دکھائی جانے لگیں۔ ایک طبلے والا اور ایک ہارمونیم ماسٹر ایک کونے میں بیٹھے فلم کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہارمونیم اور طبلہ بجاتے۔ جب کسی منظر میں تیزی آتی تو یہ رفتار بڑھ جاتی اور جب مکالمے وغیرہ ہوتے تو یہ رفتار گھٹ جاتی فلم پر انگریزی میں یہ لکھا ہوتا کہ کون کس سے کیا کہہ رہا ہے۔

جب ہم بچّے فلمیں دیکھ کر گھر آتے تو ہم بھی ان گونگی فلمی اداکاروں کی طرح بڑی تیزی سے بھاگتے دوڑتے اور اُچھلتے کودتے۔ پھر کچھ مُدّت کے بعد بولتی ہوئی فلمیں شروع ہوگئیں۔

میرے بچپن کے زمانے میں ریل کے سفر میں بڑا مزا آتا تھا۔ گارڈ اور ٹکٹ کلکٹر سفید بُرّاق لباس پہنتے تھے۔ پلیٹ فارم اور ویٹنگ روم صاف سُتھرے ہوتے۔ ہم ریلوے میں کام کرنے والوں کو بڑے رَشک سے دیکھتے اور ہم میں سے بہت سے بچّوں کے والدین اپنے دوستوں کو یہ بتایا کرتے تھے کہ ان کا ارادہ اپنے بچّے کو تعلیم دلوانے کے بعد گارڈ یا ٹکٹ کلکٹر بنوانے کا ہے۔ ریلوے میں کام کرنے والے بابو کہلاتے تھے اور بابوؤں کو اس زمانے میں بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ وہ ٹُوٹی پھُوٹی انگریزی مُنہ ٹیڑھا کر کے انگریزوں کی طرح بولتے تھے۔ اور ہمیں ان پر یوں رَشک آتا کہ وہ ہر وقت جگہ جگہ کی سیر کرتے ہیں پھر جب میں میٹرک میں پہنچا

اِتنے سارے پھلوں کا
تازہ نِکھرا روپ
احمد
مِکسڈ فروٹ جام
TASTE AHMED PRESERVES IT
AHMED'S
JAM
MIXEDFRUIT

PATENT No. 7469-7470-7471

تو ریڈیو آگیا اور ہم سب کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ سوئی گھمانے سے کبھی بمبئی آجاتا ہے تو کبھی کلکتہ اور دلی اور لاہور، ہم سوچتے تھے کہ ممکن ہے کہ سائنس دان آگے چل کر ہم میں بھی ایسی کوئی سوئی لگادیں کہ جب ہم اُسے گھمائیں تو کبھی لندن پہنچ جائیں تو کبھی نیویارک ۔

اُس زمانے میں ڈاکٹروں کے پاس کوئی نہیں جاتا تھا۔ بیچارے مکھیوں کا آپریشن کرتے رہتے تھے۔ ان کی دوائیں اتنی کڑوی ہوتیں کہ مریض مرض کو دوا سے اچھا سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر بھی تھوڑے تھے اور اسپتال بھی کم تھے۔ البتہ جو مریض لاعلاج ہوتا تو ڈاکٹر کو بلوالیا جاتا۔ اور جب ڈاکٹر کے علاج سے بھی مریض اچھا نہ ہوتا اور دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹوا لیتا تو ڈاکٹر بے چارہ مفت میں بدنام ہوتا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر کے آنے کو موت کا آنا سمجھا جاتا تھا۔ یہ زمانہ حکیموں کی میٹھی اور ٹھنڈی دواؤں کا تھا۔

میرے بچپن کے زمانے میں انگریزی بال رکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لوگ یا تو اپنے سروں پر اُسترا پھروا لیتے۔ اور یا اپنے بال خشخشی کروا لیتے اور طالب علموں پر تو اس سلسلے میں بڑی سختی تھی۔ بعض اُستاد اپنی جیب میں قینچی رکھا کرتے تھے جو طالب علم اپنے بالوں میں مانگ نکالتا تو اُس کے بال کُتر لیے جاتے ننگے سر رہنے کو بھی بُرا سمجھا جاتا تھا۔ سب ٹوپیاں پہنتے تھے۔ یہاں تک کہ جو ننگے پاؤں ہوتے تو ان کے سر پر بھی ٹوپی ہوتی میری طرح آپ لوگ بھی اپنے بڑھاپے میں اپنے ساتھ ساتھ زمانے کو بھی اسی طرح بدلا ہوا دیکھیں گے۔ اور جب زمانہ جوان ہوگا تو آپ پھر سے میری طرح بچّے ہو جائیں گے اور اِس بچپن میں آپ کو بھی میری طرح اپنا گزرا ہوا بچپن یاد آئے گا۔

●●●

سمندر کی ذہین ترین مخلوق

ڈولفن مچھلی سمندر کی ذہین ترین مخلوق ہے۔ اس کا دماغ انسانی دماغ کی طرح ہوتا ہے۔ یہ انسانوں کی طرح قہقہے لگا سکتی ہے چیخ سکتی ہے۔ شکار کا پیچھا کرتے ہوئے غرّاتی ہے۔ اگر شکار پکڑنے میں کامیاب ہو جائے تو "میاؤ" کی مختصر آواز سے خوشی کا اظہار کرتی ہے۔ دشمن کو ڈرانے یا احتجاج کرنے کے لیے تڑاخ تڑاخ کی آوازیں نکالتی ہے۔ ایسے موقعے پر یوں لگتا ہے: جیسے اس کے مُنہ سے پٹاخے چھوٹ رہے ہوں۔ انسان کے بعد یہ دُنیا کی واحد مخلوق ہے، جو نمونیہ اور دِل و دماغ کی بیماریوں میں مُبتلا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض ڈولفن مچھلیاں ہارٹ اٹیک سے بھی مرجاتی ہیں اور بہت سی پاگل بھی ہو جاتی ہیں۔

جاؤ نہ انکل عمران!

شوکت عابد

چھوڑ کے کرکٹ کا میدان
جاؤ نہ انکل عمران
ہندوستان کو تم نے ہرایا جا کر ہندوستان میں
اور انگلینڈ بھی آخر ہارا اپنے ہی میدان میں

کون ہے تم جیسا کپتان
چھوڑ کے کرکٹ کا میدان
جاؤ نہ انکل عمران
پاکستان میں کرکٹ کی یہ ساری رونق تم ہی سے ہے
بڑے بڑے بلّے بازوں کا رنگ بھی فق تم ہی سے ہے

لیکر اپنے تیر کمان
چھوڑ کے کرکٹ کا میدان
جاؤ نہ انکل عمران
ویسٹ انڈیز کو ویسٹ انڈیز میں ابھی ہرانا باقی ہے
آسٹریلیا کے سینے پر بھی زخم لگانا باقی ہے

کرو نہ کرکٹ کو ویران
چھوڑ کے کرکٹ کا میدان
جاؤ نہ انکل عمران
بولنگ میں یہ بجلی کی رفتار تمہارے دم سے ہے
چوکوں اور چھکوں کی یلغار تمہارے دم سے ہے

تم ہو کرکٹ کی پہچان
چھوڑ کے کرکٹ کا میدان
جاؤ نہ انکل عمران

شیخ سعدیؒ کی حکایت

ثمرہ

شیخ سعدیؒ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم و فاضل اور درویش تھے۔ آپ کا جائے وطن شیراز (ایران) تھا۔ آپ کا شمار فارسی زبان کے شعراء اور ادیبوں میں ہوتا ہے مہذب دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں آپ کی تصانیف "گلستان" اور "بوستان" نہ پہنچی ہوں۔ آپؒ نے گلستان میں بڑی نصیحت آموز حکائتیں بیان کی ہیں۔

ایک کہانی میں یوں کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی دانشور (دانا) سے اپنے مقدّر (قسمت) کے موافق نہ ہونے کی شکایت کر رہا تھا کہ اگر مجھے کسی جگہ کوئی کام کرنے کا موقعہ مل بھی جاتا ہے تو تھوڑے عرصے بعد ملازمت سے الگ کر دیا جاتا ہوں حالانکہ میں اپنا کام بڑی ایمانداری اور محنت

سے کرتا ہوں۔

"اے میرے محترم! یہ وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے غربت میرا پیچھا نہیں چھوڑتی اور نصیب جاگتا نہیں آخر میں نے اب یہ ارادہ کرلیا ہے کہ میں اپنے عزیز واقارب اور دوستوں کو چھوڑ کر یہاں سے کہیں دور جاکر قسمت آزمائی کروں۔ اگر میں پردیس میں بھوکا بھی رہوں گا تو کسی کو پتہ نہ چلے گا کیوں کہ یہاں پر میرے عزیز واقارب اور دوست مجھے تسلی دینے اور میری ہمت بڑھانے کی بجائے اُلٹا مجھے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی بخوبی علم ہے کہ جب میں اپنا مستقبل سنوارنے کی خاطر اپنے بال بچوں کو یہاں چھوڑ کر جاؤں گا تو یہی لوگ مجھے بے غیرت بھی کہیں گے محترم! میں علم الحساب میں کافی سوجھ بوجھ رکھتا ہوں میں اس وقت آپ کی خدمتِ اقدس میں آپ کو اپنا آخری وسیلہ خیال کرتے ہوئے حاضر ہوا ہوں کہ خدارا آپ اپنے اثرورسوخ کے ذریعے مجھے دربارِ شاہی کے ادارۂ محاسب (محکمہ مال / خزانہ) میں ملازمت دلوا دیں۔ خدا آپ کا بھلا کرے گا۔"

دانشور نے اس کے تمام حالات کو غور سے سُنا اور یہ نصیحت کی کہ اے بندۂ خدا! داناؤں کا قول ہے کہ بادشاہوں کی ملازمت سمندر کے سفر کی طرح خطرناک ہوتی ہے یا تو وہ شخص ملازمت کے دوران اچھی خاصی دولت پیدا کرلیتا ہے یا بادشاہی عتاب کا شکار ہوجاتا ہے۔ دانشور کی باتوں کو سُن کر غرض مند شخص بڑا افسردہ خاطر (مایوس) ہوا آخر دانشور نے اس کی افسردگی پر ترس کھا کر اپنے ایک واقف کار وزیرِ دربار کو کہہ سُن کر اسے اچھی ملازمت دلوا دی۔

غرض مند نے اپنی ملازمت کے دوران بڑی دیانت داری اور محنت سے کام کیا جس کو دیکھ کر اُس مخلص وزیر نے خوش ہوکر اُسے ترقی دے دی۔ پھر ایک روز یہی شخص ترقی کرتے ہوئے بادشاہ کا مشیرِ خاص بن گیا۔

چونکہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا دشمنوں نے اس پر خیانت وغبن کا الزام لگایا جس کی وجہ سے بادشاہ نے اسے زنداں (قید خانے) میں ڈال دیا۔ چونکہ انسان فطرتاً چڑھتے سورج کا پجاری ہوتا ہے لہٰذا اس کے تمام ہم نشینوں (ساتھیوں) نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

تھوڑے دنوں بعد ہی جب بادشاہ کو اس کے سچے ہونے کے تمام ثبوت مل گئے تو اس نے اُسے باعزت بری کرکے پہلے سے بھی اچھی ملازمت دے دی۔ یہ ثمرہ اسے صداقت (سچائی) کا ملا تھا۔

●●●

• آپ کا تصوّر کیا ہے۔؟ یہ خاکہ کسی بوڑھی عورت کا ہے یا یہ ایک خوبصورت لڑکی کا اسکیچ ہے

کیا آپ ناراض ہیں ؟

اگر آپ

- اس لئے ناراض ہیں کہ آنکھ مچولی میں بھیجی ہوئی تحریر شائع نہیں ہوئی تو ذرا سوچیئے کہ ایسا کیوں ہوا؟
- کیا آپ کی تحریر نقل شدہ تھی ۔؟
- پہلے شائع ہو چکی تھی ؟
- صفحے کے دونوں طرف اور لائن چھوڑے بغیر لکھی گئی تھی ۔
- پنسل سے یا اتنے مشکل رسم الخط میں لکھی گئی تھی کہ پڑھی نہیں جارہی تھی ؟
- چھوٹے پُرزوں پر لکھی گئی تھی ؟
- ایک ہی صفحے پر بہت سی تحریریں لکھی گئی تھیں ؟
- آپ کی تحریر کا اندازِ بیان، خیال اور اسلوب بچوّں کی نفسیات سے ہٹ کر تھا ؟
- آپ کی تحریر مشکل اور گنجلک تھی ؟
- آپ کی تحریر میں مقصدیت کا فقدان تھا ۔ ؟
- تو پھر سوچیئے کہ آپ کی تحریر کیونکر شائع ہو سکتی تھی ۔
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہو تو اوپر بیان کی گئی تمام باتوں سے بچیں ۔
- یاد رکھیئے ! بڑا ادیب بننے کے لئے مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے ۔

(ادارہ)

مشاغل کی کہانی — سید عقیل عباس جعفری

فوٹوگرافی

دنیا کی پہلی تصویر

دنیا بھر کے بچوّں اور بڑوں کا ایک دلچسپ مشغلہ فوٹوگرافی بھی ہے۔ آج کے دور میں فوٹوگرافی کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اخبارات، رسائل کتابیں روزمرّہ استعمال کی اشیا، اشتہارات، سائن بورڈز، غرض کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں تصویر یا فوٹوگرافی کا عمل دخل موجود نہ ہو۔ جو بات الفاظ میں سمجھانے کے لیے کئی کئی جملوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہی بات فقط ایک تصویر سے بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اخبارات میں بسا اوقات کوئی بڑی خبر بھی

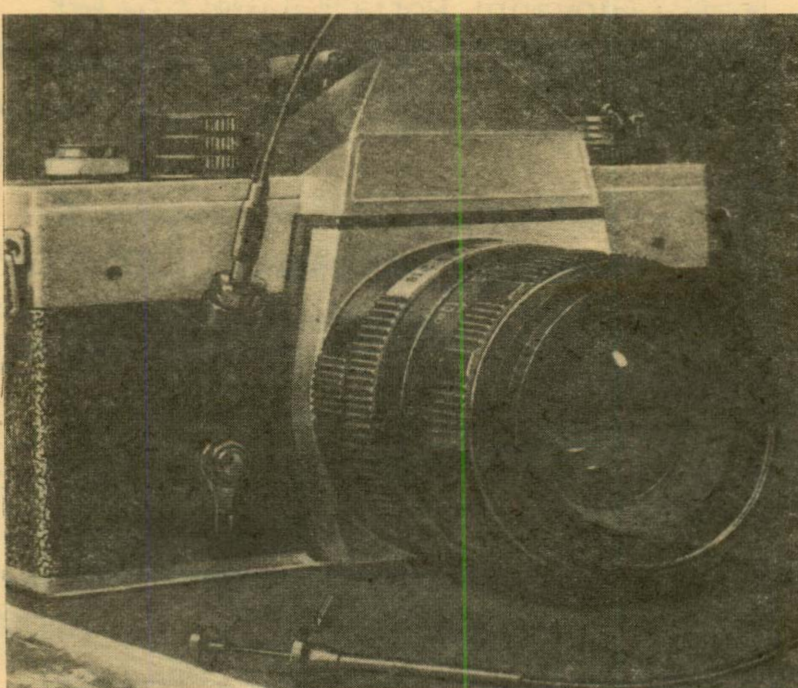

وہ تاثر پیدا نہیں کر پاتی جو ایک مختصر سی تصویر سے پیدا ہو جاتا ہے۔ عام زندگی میں بھی تصویریں تفریح کے لمحات اور گھریلو واقعات ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں، بعض تاریخی واقعات بھی تصویروں ہی کے باعث تاریخ کے صفحات میں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

فوٹوگرافی کی تاریخ

کاغذ پر قدرتی مناظر کا عکس محفوظ کرنے کی خواہش بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسانی تاریخ اب سے کوئی ڈھائی ہزار برس پہلے چین کے ایک باشندے موتائی نے مشاہدہ کیا کہ پن ہول کی مدد سے کمرے کی دیوار پر باہر کی دنیا کا عکس حاصل کیا جا سکتا ہے۔ غالباً یہ کیمرے کی بالکل ابتدائی شکل تھی۔

دسویں صدی میں مسلمان ماہرِ فلکیات ابن الہیثم نے اسی اصول کو مزید ترقی دی اور ایک اندھیرے کمرے میں اِسی اصول کی مدد سے سورج گرہن کا مشاہدہ کیا۔ یہیں سے "کیمرہ اوبسکیورا" کی اصطلاح کا آغاز ہوا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے "اندھیرا کمرہ"۔

سولہویں صدی میں اطالوی سائنسدان Giovanni Porta نے اپنی کتاب نیچرل میجک میں تحریر کیا کہ اگر پن ہول پر ایک عدسہ لگا دیا جائے تو اس کی مدد سے جو عکس حاصل ہوگا وہ زیادہ صاف اور واضح ہوگا۔ یہ اصول مصوروں میں بہت مقبول ہوا اور انھوں نے مصوری میں بھی اس اصول کی مدد حاصل کرنا شروع کر دی۔

یہ تخیل اٹھارہویں صدی میں اُبھرنا شروع ہوا کہ بعض کیمیاوی مرکبات پر دھوپ کے اثر سے تصویریں اُبھر سکتی ہیں چنانچہ جرمن پروفیسر جون ہینرخ شُلز نے اس سلسلے میں بڑے اہم تجربات کیے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں سلور مرکبات کی کچھ خاصیتیں سائنسدانوں کے علم میں آئیں ان سائنسدانوں میں ایک فرانسیسی جوزف نیپسے کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔

نیپسے نے ۱۸۱۶ء میں مختلف کیمیاوی مادوں پر تجربے کیے۔ ۱۸۲۲ء میں اس نے دریافت کیا کہ اگر کسی چیز پر بانٹومن یا ایسفالٹ کی تہہ لگا دی جائے تو اس پر کسی چیز کا عکس محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۲۷ء کے موسم گرما میں اُس نے اپنے کیمرے کی مدد سے دنیا کی پہلی تصویر کھینچنے کا اعزاز حاصل کیا۔ یہ تصویر اُس نے اپنے گھر کی بالائی منزل پر واقع اپنے مطالعے کے کمرے کی کھڑکی سے کھینچی تھی۔ اس تصویر میں چند مکانوں کی چھتیں اور ایک درخت کے عکس کو محفوظ کیا گیا تھا۔ یہ تصویر کھینچنے میں نیپسے کے آٹھ گھنٹے خرچ ہوئے تھے۔
نیپسے کے بعد، ۱۸۳۷ء میں لوئی ڈیگورے نے سلور آیوڈائیڈ کی مدد سے مزید واضح عکس حاصل کرنے

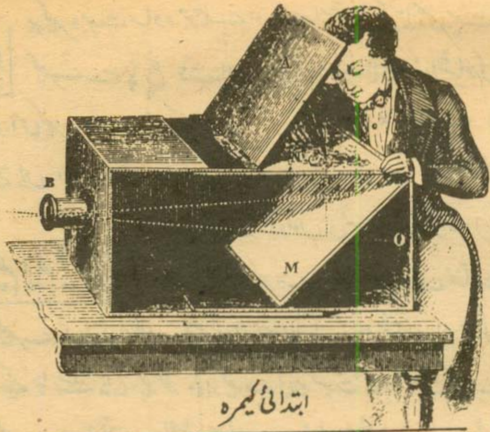

ابتدائی کیمرہ

کا طریقہ دریافت کیا یہ عکس نیپسے کے عکس کی بہ نسبت بہت جلد حاصل ہوجاتا تھا۔ ڈیگورے کا طریقہ بہت جلد فرانس بھر میں مقبول ہوگیا۔ پھر ایک انگریز ولیم ہنری فوکس ٹالبوٹ نے نیگیٹیو پازیٹیو کا طریقہ دریافت کیا جس کی مدد سے فوٹوگرافی اور بھی آسان ہوگئی۔

اب فوٹوگرافی یورپ سے نکل کر امریکہ تک جا پہنچی تھی۔ ۱۸۸۸ء میں جارج الیسٹ مین نے فوٹو گرافی کا رول ایجاد کیا۔ جس کی مدد سے فوٹوگرافی محض کیمرے کا بٹن دبانے کا نام رہ گئی۔

اب فوٹوگرافی کے شائقین کو تصویروں کے رنگین عکس حاصل کرنے کی دُھن سمائی۔ اور ۱۹۳۶ء میں امریکہ کے دو باشندوں لیوپولڈ مینز اور لیوپولڈ گوڈوسکی نے رنگین فوٹوگرافی ایجاد کی۔ جس کی مدد سے تصویروں کو ان کے قدرتی رنگوں میں محفوظ کرنا ممکن ہوگیا۔ ۱۹۶۳ء میں پولارائیڈ کیمرہ بازار میں آیا۔ جس کی مدد سے صرف ایک منٹ میں تصویر کھینچنا اور اس کا عکس حاصل کرنا ممکن ہوگیا۔

کیمرہ

کیمرہ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں "کمرہ" سائنسی طور پر کیمرہ چھوٹے سائز کے ایک ایسے ڈبے کا نام ہے جس میں کسی جانب سے روشنی کا گزر ممکن نہیں۔ اس میں جو بنیادی اجزا ہوتے ہیں۔ انھیں لینس، اَپرچر، شٹر اور ویو فائینڈر کہاجاتا ہے عام طور پر جو کیمرے فوٹوگرافی کے لیے استعمال ہوتے ہیں ان کی چھ سات قسمیں ہوتی ہیں۔ مگر فوٹوگرافی کے شوق کی ابتدا کرنے والوں میں تین کیمرے بہت مقبول ہیں جنھیں ۱۱۰، ۳۵ ایم ایم اور پولارائیڈ کیمرہ کہا جاتا ہے۔

۱۱۰ کیمرہ یہ کیمرہ بہت سادہ ہوتا ہے اور اسے استعمال کرنا بھی بہت آسان ہوتا ہے۔ اس کیمرے سے پانچ فٹ یا اس سے ذرا زیادہ فاصلے کی اشیاء کی بہت خوبصورت تصویر کشی کی جاسکتی ہے۔ اس کیمرے میں رول کی بجائے CARTRIDGE استعمال ہوتا ہے یہ کیمرے خاصے سستے ہوتے ہیں۔ اس لیے نو آموزوں کے لیے ۱۱۰ کیمرہ ہی سب سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔

۳۵ ایم ایم کیمرہ شوقین اور پیشہ ور، دونوں ہی قسم کے فوٹوگرافروں میں سب سے مقبول کیمرہ ۳۵ ایم ایم کیمرہ ہے۔ اس کیمرے میں مختلف رفتار کی فلمیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کیمرے میں اپنی مطلوبہ رفتار کی فلم استعمال کرکے اور شٹر اور اپرچر کی رفتار، گھٹا بڑھا کر بہت اچھے نتائج برآمد کیے جاسکتے ہیں۔ چونکہ ۱۱۰ کیمرے کی بہ نسبت ۳۵ ایم ایم کیمرے کا نیگیٹو زیادہ بڑا ہوتا ہے اس لیے اس کیمرے سے جو تصویر حاصل ہوتی ہے وہ زیادہ مفصّل اور زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔

پولارائیڈ کیمرہ پولارائیڈ کیمرے سے مراد ایک ایسا کیمرہ ہے جس سے کھینچی جانے والی تصویر کا عکس ایک منٹ ہی میں حاصل ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ کیمرہ سب سے پہلے پولارائیڈ نامی کمپنی نے بنایا تھا اس لیئے اس قسم کے تمام کیمروں کا نام پولارائیڈ ہی پڑ گیا۔

یہ کیمرے ایجاد ہونے کے فوراً بعد بہت زیادہ مقبول ہوئے اور پارٹیوں اور پکنکوں اور عام سماجی تقریبات میں اس قسم کے کیمرے بہت بڑی تعداد میں استعمال ہونے لگے۔ اس کیمرے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی تصویر میں کوئی غلطی ہو جائے تو فوراً ہی دوسری تصویر کھینچ کر اس کا اِزالہ کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ دوسرے کیمروں سے کھینچی ہوئی تصویروں میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

آج کل اس قسم کے کیمروں کا استعمال خاصا کم ہوگیا ہے۔

کیمرے کے اجزأ۔ (لینس) یہ ایک شیشہ ہوتا ہے جو کیمرے کی اگلی جانب لگا ہوتا ہے۔ بعض پیشہ ور یا پریس فوٹوگرافر عام لینس کے علاوہ کچھ خاص قسم کے لینس بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کسی قریب کی چیز یا کسی شخص کے چہرے کی تصویر اتارنے کے لیے پورٹریٹ لینس، دور کی تصویر اتارنے کے لیے ٹیلی فوٹو لینس، جلسے جلوس، مجمع کی تصویر اتارنے کے لیے وائیڈ اینگل لینس اور کسی اجتماع میں کسی خاص آدمی کی تصویر اُتارنے کے لیے زوم لینس استعمال کیا جاتا ہے۔ رنگین فوٹوگرافی میں صحیح رنگوں کے حصول کے لیے مختلف رنگوں کے فلٹرز بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

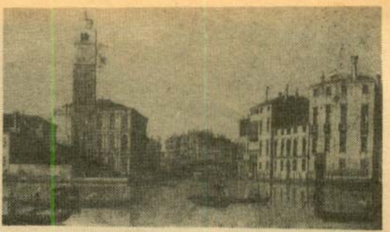

کیمرے کا موجد، جوزف نیپسے

بلّی کا ایک پوز

اپرچر اپرچر کے ذریعے لینس کے سوراخ کو حسبِ ضرورت کم یا زیادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کو سیٹ کرنے کے لیے لینس کے اوپر مختلف نمبر لکھے ہوتے ہیں۔

شٹر یہ عام طور پر کسی دھات کا بنا ہوا ایک بلیڈ ہوتا ہے جو لینس کے بالکل پیچھے لگا ہوتا ہے۔ جب فوٹوگرافر کیمرے کا بٹن، جسے شٹر ریلیز کہا جاتا ہے، دباتے ہیں تو شٹر کا سوراخ کھُل جاتا ہے اور روشنی لینس اور اس سوراخ میں سے ہوتی ہوئی فِلم پر پڑتی ہے اور یوں عکس فِلم پر محفوظ ہو جاتا ہے۔ اچھے کیمروں میں شٹر ریلیز کے قریب شٹر کی اسپیڈ فِکس کرنے کے لیے ڈائل لگا ہوتا ہے۔ جس کی مُدد سے شٹر کو حسبِ ضرورت مختلف اسپیڈز پر فکس کیا جاسکتا ہے۔

ویو فائنڈر ایک شیشہ ہوتا ہے جس میں تصویر کھینچنے سے قبل کا تمام منظر دیکھا جاسکتا ہے۔ جس چیز کی تصویر کھینچنا مقصود ہوتی ہے اُسے سبجیکٹ کہتے ہیں۔ سبجیکٹ کو فوکس کرتے وقت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ درمیان میں ہو تاکہ اس کی تصویر ٹھیک طرح سے اُتاری جاسکے۔

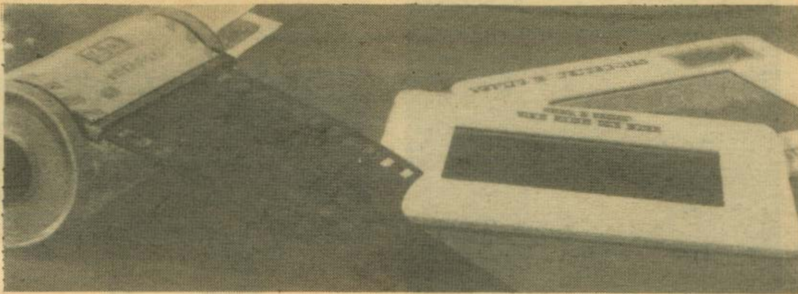

فلم

فلم خریدتے وقت سب سے پہلے اس کی Expiry Date یعنی وہ فلم کس تاریخ تک کارآمد ہے چیک کرنا چاہیئے اگر یہ تاریخ گزرچکی ہو یا بہت ہی نزدیک ہو تو وہ فلم نہ خریدیں، بلکہ ایسی فلم خریدیں، جس کی Expiry Date میں کم ازکم ایک سال باقی ہو فِلموں کا انتخاب کرتے وقت ان کی رفتار بھی مدِّنظر رکھیں۔ اگر کم روشنی میں یا تیز رفتار اشیاء کی تصویر کھینچنی ہو تو زیادہ رفتار والی فلمیں اور اگر تیز روشنی میں اور غیر مُتحرّک اشیاء کی تصویر کھینچنی ہو تو کم رفتار والی استعمال کریں۔ تاہم درمیانی رفتار والی فلمیں عام طور پر زیادہ بہتر تسلیم کی جاتی ہیں۔ شوقیہ فوٹوگرافروں کو چاہیئے کہ وہ ابتدا میں اسی نوعیت کی فلمیں استعمال کریں۔

کیمرے میں فلم ڈالنا

کیمرے کے پچھلے حصّے میں فلم کا رول ڈالنے کا خانہ بنا ہوتا ہے جس میں بائیں ہاتھ پر فلم کا رول فِکس کر کے اس کا اگلا سرا دائیں جانب لگی ہوئی چرخی کے سوراخوں میں پھنسا کر شٹر کا بٹن دبا کر یا لیور کی مدد سے آگے بڑھا دیا جاتا ہے حتّٰی کہ فلم بالکل درست طریقے سے چرخی پر لپٹ جاتی ہے۔ اس کے بعد کیمرے کا پچھلا ڈھکنا بند کر دیتے ہیں۔ اب آپ کا کیمرہ تصویر کھینچنے کے لیے بالکل تیار ہے۔

تصویر کھینچنا

یوں تو تصویر کھینچنا ایک بہت آسان کام معلوم ہوتا ہے۔ یعنی کیمرے کے ویوفائنڈر میں آبجیکٹ کو دیکھا اور اُسے مرکز میں رکھ کر بٹن دبا دیا۔ مگر درحقیقت فوٹوگرافی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اچھی فوٹوگرافی بھی ایک باقاعدہ فن ہے اور اس میں بھی بہت سی باریکیوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

تصویر کھینچنے کے سِلسلے میں سب سے اہم چیز روشنی کا درست انتخاب ہے۔ اگر آپ دن کے وقت سورج کی روشنی میں تصویر کھینچنے کے خواہش مند ہیں تو اس بات کا خیال رکھیئے کہ نہ ہی آپ کے آبجیکٹ

پر سورج کی روشنی براہِ راست پڑ رہی ہو اور نہ ہی کیمرے کا رُخ سورج کی جانب ہو، بلکہ سورج کی روشنی دائیں یا بائیں سمت سے آ رہی ہو۔ ایسے موقعوں پر شٹر کی اسپیڈ تیز کر دیں اور اپرچر کم کر دیں۔ اگر شام کا وقت ہو یا موسم ابر آلود ہو تو شٹر کی اسپیڈ کم کر دیں اور اپرچر زیادہ کھول دیں۔ رات کے وقت یا کسی مکان یا کمرے کے اندر دن کے وقت تصویر کھینچنے کے لیے فلیش یا بجلی کی روشنی کا انتظام کریں۔ اگر بلب کم قوّت کا ہو تو شٹر کی اسپیڈ کم کر دیں اور اپرچر زیادہ کھول دیں اگر بلب زیادہ قوّت کا ہو یا آپ فلیش کی روشنی میں تصویر کھینچنا چاہتے ہوں تو شٹر کی اسپیڈ بڑھا دیں اور اپرچر کم کر دیں تھوڑی سی مشق کے بعد آپ خود بخود اچھی تصویر کھینچنے کے ماہر ہو جائیں گے۔

تصویر کھینچنے میں دوسرا اہم مرحلہ دُرست فوکسنگ ہے۔ کیمروں میں لینس کے اوپر فاصلے کی مناسبت سے فوکس کرنے کا سسٹم موجود ہوتا ہے۔ آپ جس چیز کی تصویر کھینچنا چاہتے ہوں اُسے اس کے پس منظر اور کیمرے سے فاصلے کی مناسبت سے فوکس کریں بعض کیمروں میں یہ نظام خودکار ہوتا ہے اور اگر کوئی تصویر آؤٹ آف فوکس ہوتی ہے تو ویو فائنڈر میں اس کا سگنل نمودار ہو جاتا ہے۔ اگر کیمرہ خودکار نہ ہو تو فاصلے کا خیال ضرور رکھیں۔ مختلف فاصلوں سے مختلف مقاصد کے لیے تصویر کشی کے لیے خاص قسم کے لینس بھی استعمال کیے جاتے ہیں، جن کا تذکرہ اوپر لینس کے عنوان کے تحت کیا جا چکا ہے۔

اچھی تصویر کشی میں روشنی اور فوکسنگ کے درست انتخاب کے بعد اہم ترین چیز میدان کی گہرائی یا Depth Of Field ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ کوئی ایسی تصویر کھینچنا چاہتے ہوں۔ جس میں آپ پس منظر کو بھی عکس بند کرنا چاہتے ہوں تو ایسی صورت میں آپ اپرچر جتنا زیادہ کھولیں گے پس منظر یا میدان کی گہرائی اُتنی ہی واضح ہوگی۔ اگر آپ صرف کسی شخص کے چہرے یا کسی خاص چیز کی تصویر کھینچنا چاہتے ہوں اور آپ اس کا پس منظر دھندلا رکھنا چاہتے ہوں تو اپرچر بالکل کم کر دیں۔ آپ کو اپنی مطلوبہ تصویر پوری وضاحت کے ساتھ حاصل ہو جائے گی۔ اس کو فوٹو گرافی کی اصطلاح میں سیلیکٹو فوکسنگ Selective Focusing کہتے ہیں۔

پورٹریٹ فوٹوگرافی

فوٹوگرافی میں پورٹریٹ فوٹوگرافی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگر آپ فوٹوگرافی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ آپ پورٹریٹ فوٹوگرافی سے اپنے مشغلے کا آغاز کریں۔ پورٹریٹ فوٹوگرافی میں بعض اوقات بہترین تصویریں، فطری انداز میں تصویر کھینچنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ یعنی اگر کوئی بچّہ کوئی شرارت کر رہا ہے، یا کوئی جانور کھیل رہا ہے یا کوئی طالب علم

کتاب پڑھ رہا ہے تو اگر آپ اُسے متوجہ کیے بغیر تصویر کھینچ لیں گے تو بعض اوقات اس طرح بہت اچھی تصویریں حاصل ہوتی ہیں۔

لیکن بعض اوقات پورٹریٹ فوٹوگرافی کے لیے خاصا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اور روشنی کے زاویے اور آسمان پر سورج کا رُخ دیکھ کر تصویرکشی کرنی پڑتی ہے۔ دن میں پورٹریٹ فوٹوگرافی کے لیے بہترین وقت سہ پہر کا وقت یا ایسا وقت سمجھا جاتا ہے جب آسمان پہ بادل چھائے ہوئے ہوں۔ اگر سورج کی روشنی میں تصویر کھینچنا ہو تو کوشش کریں کہ آپ کے آبجیکٹ پہ روشنی دائیں یا بائیں کسی ایک ہی جانب سے یا کسی دیوار سے منعکس ہو کر پڑ رہی ہو۔ پورٹریٹ فوٹوگرافی میں عام طور پہ بازوؤں اور چہرے کی تصویرکشی کی جاتی ہے۔

مناظرِ قدرت

کھلے میدانوں یا مناظرِ قدرت کی عکس بندی روشنی اور موسم دونوں ہی پر منحصر ہے۔ مناظرِ قدرت کی عکس بندی کے لیے بہترین وقت صبح یا شام کا سمجھا جاتا ہے۔ جب ان پر سورج کی روشنی اوپر سے نہیں بلکہ کسی زاویے سے پڑ رہی ہو۔ مناظرِ قدرت میں پورے منظر کی عکس بندی کی بجائے بہتر یہ ہوتا ہے کہ کسی خاص ٹکڑے کی تصویر کھینچی جائے۔

مناظرِ قدرت کی تصویرکشی میں ایک عام غلطی یہ بھی کی جاتی ہے کہ منظر کے ساتھ ساتھ آسمان کے ایک بڑے حصے کو بھی تصویر میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ جس کے باعث اصل منظر کی خوبصورتی نسبتاً کم ہو جاتی ہے۔ کوشش یہ کریں کہ ایسی تصاویر میں آسمان کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہی شامل ہو۔ تاکہ منظر کی اصل خوبصورتی اُبھر کر سامنے آسکے۔

متحرک یا ایکشن فوٹوگراف

متحرک اشیاء کی تصویرکشی میں تین باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے اوّل شے کی رفتار، دوم حرکت کی سمت اور سوم کیمرے سے متحرک شے کا فاصلہ۔ جس چیز کی رفتار جتنی زیادہ ہوتی ہے شٹر کی رفتار اتنی ہی زیادہ رکھنی ہوگی۔ کاروں، موٹر سائیکلوں، ہوائی جہازوں اور اسی رفتار کی دوسری اشیاء کے لیے شٹر کی رفتار کم از کم ۵۰۰/۱ سیکنڈ ہوگی۔ اسی طرح اگر فاصلہ کم ہوگا تو بھی شٹر کی رفتار تیز رکھنی ہوگی۔

تیز رفتار اشیاء کی تصویرکشی میں شٹر کی اسپیڈ کے علاوہ صحیح فوکسنگ بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔۔۔ فوکسنگ کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ متحرک شے کے ساتھ ساتھ کیمرے کو فوکس کر کے اُسے بھی ساتھ ساتھ گھمایا جائے۔ بعض تجربہ کار فوٹوگرافر کیمرے کو ایک خاص نکتے پر فوکس کر دیتے ہیں اور جب متحرک شے اس مقام

پر پہنچتی ہے تو اسی لمحے بٹن دبا کر وہ لمحہ کیمرے میں مقیّد کر لیتے ہیں۔

یادگار لمحے

سالگرہ، شادی، عید اور ایسے دوسرے متعدّد مواقع ہر انسان کی زندگی میں یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ان لمحات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تصویروں کی صورت میں محفوظ کر لے۔ جب کبھی آپ ایسے کسی موقع کو عکس بند کرنا چاہیں تو ایک دن پہلے ہی اپنا کیمرہ اور دوسری چیزیں تیار کر لیں۔ فلموں کے دو تین رول خرید لیں اور ان تمام اشیاء کو ایک ایسے مقام پر رکھ دیں، جو آپ کو باآسانی یاد رہ سکے۔

ایسے موقعوں پر اکثر گروپ تصویریں بھی کھینچی جاتی ہیں۔ گروپ تصویر کھینچتے وقت خیال رکھیں کہ تمام افراد نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوں تاکہ ان میں سے ہر شخص کا کیمرے سے فاصلہ برابر ہو۔ بچوں کو زمین پر اور بزرگوں کو کرسیوں پر بٹھا کر اور نوجوانوں کو ان کے پیچھے کھڑا کر کے تصویر کھینچنے سے نہ صرف یہ کہ تصویر بہتر آتی ہے بلکہ چھوٹے اور بڑوں میں احترام کا رشتہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

احتیاطیں

فوٹوگرافی کے دوران اگر حسبِ ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے تو آپ بہت جلد ایک اچھے فوٹوگرافر بن سکتے ہیں۔

- تصویر کھینچتے وقت کبھی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کریں بلکہ ہمیشہ پُرسکون ہو کر تصویر کھینچیں۔
- کیمرے کو کبھی گرم جگہ پر نہ رکھیں نہ ہی گاڑی میں چھوڑیں۔ فلم ڈالتے وقت کسی سایہ دار جگہ کا انتخاب کریں۔ فلم کیمرے سے نکالنے کے بعد ٹھنڈی اور خشک جگہ پر رکھیں اور بہترین نتائج کے لیے جلد از جلد ڈیولپ کروائیں۔
- ایک تصویر اُتارنے کے فوراً بعد کیمرے میں موجود فلم رول کو ایڈوانس کر دیں۔ اس طرح اُتری ہوئی تصویر محفوظ بھی ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی کیمرہ اگلی تصویر کھینچنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے ورنہ جب نئی تصویر کھینچنے کا موقع آتا ہے تو اس وقت رول کو وائنڈ کرنا یاد نہیں رہتا اور تصویر کھینچ لی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی نیگیٹو پر ڈبل تصویر آجاتی ہے اور تصویر کے دونوں مواقع ضائع ہو جاتے ہیں۔
- اونچی عمارات یا میناروں کی تصاویر لینے کے لیے ان کی بنیادوں کے پاس کھڑے ہو کر تصویر نہیں لینی چاہیئے۔ کیونکہ اس طرح وہ عمارت یا مینار ٹیڑھی معلوم ہوگی۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس سے مناسب فاصلے پر جا کر تصویر اتاری جائے تاکہ اگر ممکن ہو تو ساری کی ساری عمارت فوکس میں آجائے۔
- پورٹریٹ فوٹوگرافی میں پس منظر کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ کوشش کریں کہ آبجیکٹ کے

پس منظر میں صاف پردہ یا پھر آسمان ہو۔ اس طرح پورٹریٹ میں اُبھار اور کشش بڑھ جائے گی۔

★ تصویر کھینچتے وقت ویو فائنڈر میں تصویر کو اچھی طرح سیٹ کریں اور آبجیکٹ کو مرکز میں رکھیں۔ ورنہ جلدی میں آبجیکٹ کی ٹوپی یا ئرکٹ جاتا ہے اور تصویر کا حُسن غارت ہوجاتا ہے۔

★ تصویر کھینچتے وقت کیمرے کا ساکن حالت میں رہنا ضروری ہے۔ ورنہ اس کے حرکت کر جانے سے تصویر دُھندلی اور مدّھم آئے گی۔

★ اگر آپ نے شٹر اسپیڈ کا انتخاب ۱/۳۰ سے کم کیا ہے تو کیمرے کو اسٹینڈ یا کسی ساکت چیز پر رکھ کر تصویر کھینچنا ضروری ہے۔

★ کیمرے کے لینس کو ہمیشہ بُرش سے صاف کریں۔ ہاتھ سے صاف کرنے کی کوشش نہ کریں اور نہ ہی رومال استعمال کریں۔

★ تصویر کھینچتے وقت خیال رکھیں کہ کہیں گھبراہٹ میں آپ کی انگلیاں لینس کے سامنے نہ آجائیں۔ ورنہ تصویر کے بعض حصّے سائے میں چھُپ جائیں گے۔

★ جو کیمرہ آپ کے پاس ہو۔ اس کے میکنزم سے پوری طرح آگہی حاصل کریں اور اس کے سائز اور اُس کی مناسبت کی فلم ہی اس میں ڈالیں، ورنہ نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔

★ رنگین فلم، ڈیولپنگ اور پرنٹنگ کے لیے اُسے ہمیشہ معیاری لیبارٹری میں دیں۔ کسی اسٹوڈیو میں ہرگز نہ دیں کیونکہ وہ یہ کام خود نہیں کرتے بلکہ لیبارٹری سے ہی کرواتے ہیں۔ اسٹوڈیو والے پیسے بھی بہت زیادہ لیتے ہیں اور وقت بھی زیادہ لگاتے ہیں۔ اس لیے پیسے اور وقت کی بچت کے لیے لیبارٹریز یا ان کے پِک اَپ پوائنٹس سے براہِ راست رابطہ قائم کریں۔

منگول

تموجن جسے دنیا چنگیز خان کے نام سے جانتی ہے، کا خیال تھا کہ اُسے دنیا کو فتح کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اُس زمانے میں اُس کا یہ خیال مضحکہ خیز تھا۔ مگر منگول بہترین جنگجو تھے اس لیے ان کے مفتوحہ علاقے دنیا کی سب سے بڑی مملکت سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۲۵۰ء تک ان کی سلطنت مشرقی یورپ سے لے کر ہندوستان اور چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ بعد میں چنگیز خان کا پوتا قبلائی خان چین کا شہنشاہ بنا۔ اس کی نسل میں آگے چل کر بابر نے شمالی ہندوستان میں ۱۵۲۶ء میں مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

Montgomery
tea time
Montgomery
Montgomery
Montgomery
The Height of Delight!

کوئِس ®

مصنوعات بنانے والے پیش کرتے ہیں

- **کوئِس مشروبات :**
مشروبِ کوئِس کے اضافے کے ساتھ اب
چھ مختلف مزیدار ذائقے ۔
مشروبِ کوئِس ، آئسکریم ، اناس ، سنترہ ،
ویمٹو اور لیمن ۔

- **کوئِس اچار :**
مینگو اور مِکس ۔ لذیذ ، چٹ پٹے ، مزیدار ۔

- **کوئِس فیرنی مِکس :**
زعفرانی اور سادہ ۔
ایک لیٹر ابلتے ہوئے دودھ میں ایک پیکٹ
فیرنی مِکس ملا کر پانچ منٹ سے دس منٹ
تک پکائیں ۔ فیرنی تیار ۔

- **کوئِس کسٹرڈ پاؤڈر :**
تین مزیدار ذائقے ۔ آپکے ذوق کے عین مطابق

انڈس فروٹ جوس کمپنی

پوسٹ بکس 8026 ، کراچی ۔ 29 ، پاکستان ۔ فون : 440361-438869

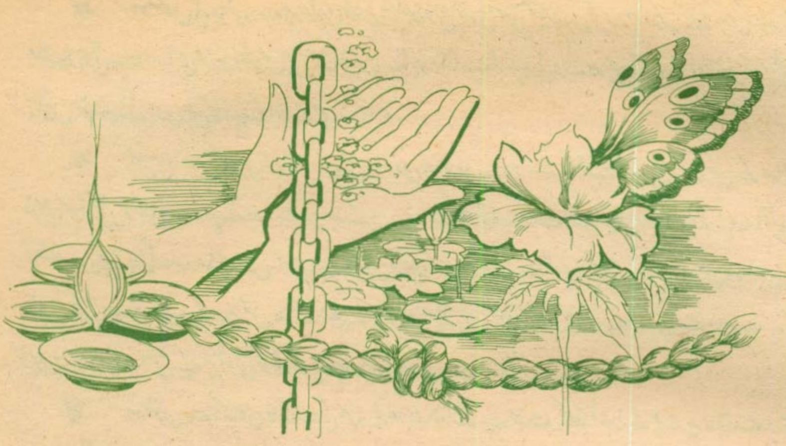

آدابِ زندگی

ع۔ا۔ صدیقی

دوستی کے آداب

اچھّا دوست خدا کی نعمتوں میں سے بہترین نعمت ہے، وہ لوگ انتہائی خوش نصیب ہیں جن کے بہت سے دوست احباب ہوں اور وہ سب انھیں عزیز رکھتے ہوں، اور اس کی زندگی میں ویرانی ہی ویرانی ہے جس سے لوگ بیزار رہتے ہوں اور وہ بھی لوگوں سے دُور بھاگتا ہو، اچھے لوگوں سے دوستی کرنے، اچھّے دوست بنانے اور بُرے لوگوں کی دوستی سے بچنے کے لیے چند رہنما اصول ذہن میں رکھیئے۔ کیونکہ بچّہ، بڑا، جوان، بوڑھا ہر ایک اپنے دوستوں سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ اچھّا دوست زندگی کی زینت، سفرِ حیات کا سہارا اور خدا کا انعام ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے، "مومن سراپا اُلفت و محبّت ہے اور اس آدمی میں سرے سے کوئی خیر و خوبی ہی نہیں جو نہ تو دوسروں سے محبّت کرے اور نہ دوسرے اس سے محبت کریں۔"

★ دوستوں کے ساتھ مل جُل کر میل محبّت کی زندگی گزاریئے اور ان سے مخلصانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کیجیۓ۔ اچھے دوستوں کے سامنے خود کو لیے دیئے رہنے سے پرہیز کیجیے کہ اس سے آپ کے بارے میں اچھّی رائے قائم نہیں ہوگی۔

★ دوستوں کی جانب سے غیر ارادی طور پر پہنچنے والی چھوٹی موٹی تکلیفوں کو برداشت کیجئے۔ اِس سے دوستی مضبوط ہوتی ہے اور باہمی محبت وخلوص میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی وجہ سے بھی آپ کے دوستوں کو اس قسم کی زحمتیں اٹھانا پڑتی ہوں جن کا آپ کو اندازہ بھی نہ ہُوا ہو۔

★ محلّے میں، درس گاہ میں اور خاندان میں ہزاروں ہم عمروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان میں سے جن کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی ہو جاتی ہے وہ پکّے دوست بن جاتے ہیں۔ دوست کا انتخاب کرتے وقت خیال رہے ہمیشہ ایسے ساتھیوں کو منتخب کیجئے جو نیک اور صالح ہوں۔ اس بات کا خیال رکھیے کہ جن لوگوں سے آپ تعلق بڑھا رہے ہیں وہ دین و اخلاق کے پہلو سے آپ کے لیے کس حد تک مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔ اس لیے ہر آدمی کو غور کر لینا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے"۔

★ دوستوں سے دُنیاوی فائدے کی بجائے صرف خدا کے لیے محبّت کیجئے، خدا کے پسندیدہ بندے وہی ہیں جو خدا کے دین کی بنیاد پر آپس میں ملتے ہیں۔

★ دوستوں پر اعتماد کیجئے، ان کے درمیان ہشّاش بشّاش رہیئے، خُشک مزاجی، مُردہ دلی، افسُردہ رہنے اور دوستوں کو بھی رنجیدہ کرنے سے پرہیز کیجئے۔ دوستوں کی صحبت میں بے تکلّفی اور خُوش مزاجی اختیار کیجئے۔ تیوری چڑھانے اور لیے دیئے رہنے سے بچئے تاکہ آپ کے دوست آپ کی صحبت سے اکتا نہ جائیں بلکہ مسّرت، زندگی اور کشش محسوس کریں، لیکن یہ احتیاط رکھئے کہ آپ کی خوش طبعی اور ظرافت حد سے نہ بڑھنے پائے۔ خوش مزاجی اور تفریح کے ساتھ دینی وقار، حمیت وغیرت اور توازن واعتدال کا بھی لحاظ رکھیئے کہ کام وہی اچھّا ہوتا ہے جس میں اعتدال کا خیال رکھا گیا ہو۔

★ آپ جن ساتھیوں سے قربت محسوس کرتے ہوں ان سے اس کا اظہار ضرور کیجیے تاکہ انھیں بھی قربت کا احساس ہو۔ اِس طرح کے جذبات و احساسات کے تبادلوں سے محبّت وخلوص میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے اور فریقین کو روحانی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ باہمی محبّت و قربت بڑھانے کا یہ تیر بہدف نسخہ ہے۔ لیکن اس میں بھی میانہ روی اختیار کیجئے اور جوشِ محبّت میں اتنا آگے نہ بڑھ جایئے کہ دوستی جنُون کی شکل اختیار کرلے اور آپ کے دوست آپ کی شکل سے ہی بیزار ہو جائیں۔

★ دوستوں کے ساتھ وفاداری اور خیر خواہی کیجئے۔ دوست کے ساتھ سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی اخلاقی تربیت کی فکر کی جائے اور اس سے اپنی ذات کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ کسی کو بُرائی کے گڑھے میں گرتے دیکھ کر نیکی کی راہ دکھانا بہت نیکی کا کام ہے۔ خیر خواہی کا اصل معیار یہ ہے کہ آپ اپنے دوست کے لیے بھی وہی

پسند کریں جو اپنے لیے پسند کرتے ہوں کیونکہ آدمی اپنا بُرا کبھی نہیں چاہ سکتا۔

★ دوستوں کے دُکھ درد میں شریک رہیئے۔ ان کی خوشیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیجئے۔ دوستوں کے غم میں شریک ہوکر مسرتوں میں اضافہ کی کوشش کیجئے تاکہ آپ کی ضرورت کے وقت آپ کو بھی ان کی رفاقت حاصل ہو۔

★ دوستوں کی محفل میں کسی ساتھی سے کسی بات پر اختلاف ہوجائے تو بات کو آگے نہ بڑھنے دیجئے اور جلد ہی صلح صفائی کر لیجئے اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معافی طلب کرنے اور قصور کا اعتراف کرنے میں پیش قدمی کیجئے۔ اس میں تاخیر نہ کیجئے کیونکہ دوستوں کے درمیان صلح صفائی میں جتنی تاخیر ہوتی جاتی ہے اتنا ہی خرابی جڑ پکڑتی جاتی ہے۔ اور بعض اوقات معمولی سی بات دشمنی کا سبب بن جاتی ہے۔

★ دوستوں کی جانب سے اگر کوئی بات طبیعت اور ذوق کے خلاف بھی ہوجائے تو آپ اپنی زبان پر قابو رکھئے اور جواب میں کبھی سخت کلامی یا بدزبانی نہ کیجئے بلکہ حکمت اور نرمی کے ساتھ بات کو ٹال جائیے۔ اس سے دوست کے دِل میں آپ کی عظمت پیدا ہو جائے گی اور محبّت میں اضافہ ہوگا۔

★ دوستوں سے خلوص و محبّت کا اظہار کرنے اور محبّت کو اور زیادہ بڑھانے کے لیے ہدیوں اور تحائف کا تبادلہ بھی کیجئے۔ تحفوں کے لین دین سے دِل قریب آتے ہیں اور محبّتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ تحفہ بہت قیمتی ہو، آپ کی حیثیت کے مطابق کوئی بھی تحفہ دوست کے دِل میں آپ کی محبّت پیدا کرنے کے لیے کافی ہے اور تحفے کے بدلے تحفہ ضرور دیجئے، اس سے تحفہ بھیجنے والے کو اپنے تحفے کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے حضورؐ کے نزدیک پسندیدہ تحفہ خوشبو تھی۔ آج کل کے حالات میں کوئی اچھی سی کتاب بھی بہترین تحفہ ہے۔

★ اجتماعی اخلاق میں ایسی وسعت، ہمہ جہتی، تحمّل اور کشش پیدا کیجئے کہ ہر ذوق و طبیعت اور ہر طرح کی فکر و رجحان رکھنے والا آپ کی ذات میں غیر معمولی کشش محسوس کرے اور ہر دوست کی ذہنی و فکری سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے برتاؤ کریں۔

★ دُعا کا خصوصی اہتمام کریں خود بھی دوستوں کے لیے دُعا کیجیے اور ان سے بھی دُعا کے لیے درخواست کیجئے۔ دُعا دوستوں کے سامنے بھی کیجئے اور ان کی عدم موجودگی میں بھی، ان کا نام لے کر ان کے لیے دُعا کیجیے ایک حدیث کے مطابق جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لیے غائبانہ دُعا کرتا ہے تو خدا اس کو قبول فرماتا ہے اور دُعا کرنے والے کے سرہانے ایک فرشتہ مقرر رہتا ہے کہ جب وہ شخص اپنے بھائی کے لیے اچھی دُعا کرتا ہے تو وہ فرشتہ آمین کہتا ہے اور کہتا ہے کہ تیرے لیے بھی وہی کچھ ہے جو تُو اپنے بھائی کے لیے مانگ رہا ہے۔

کرکٹ کا گیت

امان اللہ خاں دل

کرکٹ کی یہ ٹیم ہماری عظمت کی پہچان ہے

اس میں ہے جاوید ہمارا اس میں اب عمران ہے

آؤ دیکھو نیا کھلاڑی یہ اپنا اعجاز ہے

اس کے عمدہ کھیل پہ یارو کتنا ہم کو ناز ہے

اس کے ہر انداز پر اب جان بھی قربان ہے

کرکٹ کی یہ ٹیم ہماری عظمت کی پہچان ہے

یوسف، محسن، ملک یہ سارے اونچے نام ہمارے

وقت پڑا تو خوب انھوں نے چوکے چھکے مارے

ان کے دم سے اونچا پرچم اونچا پاکستان ہے

کرکٹ کی یہ ٹیم ہماری عظمت کی پہچان ہے

ایک اُوور میں چھ چھکّوں کی بارش جس نے برسائی

یہ خوبی منظور الٰہی کے حصّے میں بھی آئی

اپنا یہ منظور الٰہی ون ڈے کھیل کی جان ہے

کرکٹ کی یہ ٹیم ہماری عظمت کی پہچان ہے

لوہا اپنے کھیل کا بالر اکرم نے منوایا ہے

قادر کا ہر ٹیم پہ دنیا بھر میں خوف سمایا ہے

بالنگ میں توصیف بھی اپنا کتنا عالیشان ہے

کرکٹ کی یہ ٹیم ہماری عظمت کی پہچان ہے

ہمت ہو تو کوئی ٹیم بھی اپنے مدِ مقابل ہو

اس ہمت میں جیت کا جذبہ ہر منزل پر شامل ہو

دِل پھر جیت ہماری ہوگی یہ اپنا ایمان ہے

امّ رباب جعفری

دائرۂ معلومات

ہر سوال کا جواب ذیل میں دیئے گئے ۴۰ اشاروں کی مدد سے دینا ہوگا۔ آپ کی سہولت کے لیئے ہم نے ہر سوال کے دُرست جواب کو دائرہ ہی میں کہیں لکھ دیا ہے اور کچھ اضافی نام بھی ساتھ ہی لکھ دیئے ہیں، جن کا سوال سے کوئی تعلّق نہیں۔ مقابلے میں شرکت کا طریقہ یہ ہے کہ آپ دائرے میں اپنے مطلوبہ جواب پر سوال نمبر لکھ دیں۔ اور اصل دائرہ کاٹ کر ۲۰ اکتوبر تک ہمیں بھجوا دیں، دائرے کے بغیر جواب قابلِ قبول نہیں ہوں گے

نوٹ:۔ اس مرتبہ کرکٹ اسپیشل کے حوالے سے سارے سوالات کرکٹ ہی سے متعلق ہیں۔

(۱) ٹیسٹ کرکٹ میں پاکستان کی جانب سے پہلی وکٹ حاصل کرنے کا اعزاز کس کھلاڑی نے حاصل کیا تھا؟

(۲) دنیا کی سب سے سست رفتار سنچری بنانے کا ریکارڈ ایک پاکستانی کھلاڑی نے ۵۵۷ منٹ میں سنچری بنا کر قائم کیا ہے۔ اس کھلاڑی کا نام بتا دیجئے؟

(۳) کرکٹ کے ریکارڈ کی مستند ترین کتاب وزڈن کرکٹرز المانک پہلی مرتبہ کس سن میں شائع ہوئی تھی؟

(۴) ٹیسٹ میچ میں ڈبل سنچری بنانے والے دنیا کے سب سے کم عمر کھلاڑی کا نام بتا دیجئے؟

(۵) اگر کسی کھلاڑی نے اپنے ٹیسٹ کیریر میں سو وکٹیں لی ہوں۔ ایک ہزار رنز بنائے ہوں اور ایک سو سے زیادہ کیچ پکڑے ہوں تو اسے کرکٹ کی اصطلاح میں "ٹریل" کہا جاتا ہے۔ اب تک دنیا میں صرف دو کھلاڑی یہ اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے پہلے کھلاڑی تو سر گارفیلڈ سوبرز تھے۔ کیا آپ یہ اعزاز حاصل کرنے والے دوسرے کھلاڑی کا نام بتا سکتے ہیں؟

(۶) سر ڈان بریڈمین اپنے ٹیسٹ کیریر کی آخری اننگز میں کس باؤلر کی گیند پر صفر پر آؤٹ ہو گئے تھے؟

(۷) اس پاکستانی وکٹ کیپر کا نام بتائیے جس نے ۱۹۶۲ء میں انگلستان کے خلاف وکٹ کیپنگ کرتے ہوئے پوری اننگ میں بائی کا ایک رن بھی نہیں دیا تھا۔ اس اننگ میں انگلستان نے ۵ وکٹوں کے نقصان پر

۴۴۵ رنز بنائے تھے۔؟

(۸) اب تک (اکتوبر ۱۹۸۷ء تک) ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ رنز بنانے کا اعزاز سنیل گواسکر نے ۱۰۱۲۲ رنز بناکر قائم کیا ہے۔ بتائیے انہوں نے یہ اعزاز کتنے ٹیسٹ میچوں میں حاصل کیا ہے؟

(۹) غرب الہند کے اس کھلاڑی کا نام بتائیے جس نے ۱۵ اپریل ۱۹۸۶ء کو صرف ۵۶ گیندیں کھیل کر ٹیسٹ کرکٹ کی تیز ترین سنچری بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔؟

(۱۰) پاکستان کے اس پہلے کھلاڑی کا نام بتائیے جس کا شمار وزڈن کرکٹرز المانک نے سال کے پانچ بہترین کھلاڑیوں میں کیا ؟

(۱۱) کیا آپ پاکستان کے اس پہلے کھلاڑی کا نام بتا سکتے ہیں۔ جو ٹیسٹ کرکٹ میں ۹۹ کے اسکور پر آؤٹ ہوئے؟

(۱۲) کیا آپ دنیائے کرکٹ کے اس پہلے کھلاڑی کا نام بتا سکتے ہیں جنہیں سر کے خطاب سے نوازا گیا ؟۔

(۱۳) پاکستان نے اپنا پہلا ٹیسٹ میچ تو بھارت کے خلاف کھیلا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پاکستان نے اپنا سواں ٹیسٹ میچ کس ملک کے خلاف کھیلا تھا ؟۔

(۱۴) حنیف محمد ٹیسٹ کرکٹ میں اپنا سب سے بڑا اسکور ۳۳۷ رنز بناکر اٹکنسن کی گیند پر کس کھلاڑی کے ہاتھوں کیچ آؤٹ ہوئے تھے۔؟

(۱۵) انگلستان ۵۰۰ سے زائد ٹیسٹ میچ کھیلنے والا واحد ملک ہے۔ بتائیے اس نے اپنا پانچسواں ٹیسٹ میچ کس کے خلاف کھیلا تھا۔؟

(۱۶) کیا آپ اس پہلے کھلاڑی کا نام بتا سکتے ہیں۔ جس نے پاکستان کے خلاف پاکستان میں ڈبل سنچری بنائی۔ اشارۃً ہم اتنا بتا سکتے ہیں کہ اس کھلاڑی کا تعلق غرب الہند سے تھا؟

(۱۷) فرسٹ کلاس کرکٹ میں اب تک صرف دو کھلاڑی ایسے گزرے ہیں۔ جنہوں نے ایک اوور کی ہر گیند پر چھکا مارا۔ ان میں سے پہلے کھلاڑی تو سر گار فیلڈ سوبرز ہیں۔ کیا آپ دوسرے کھلاڑی کا نام بتا سکتے ہیں۔؟

(۱۸) سر ڈان بریڈمین نے سوائے ایک میدان کے ہر اس میدان پر جہاں انہوں نے ٹیسٹ میچ کھیلا، سنچری بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔ کیا آپ اس واحد میدان کا نام بتا سکتے ہیں۔ جہاں سر ڈان بریڈمین یہ کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔؟

(۱۹) انتخاب عالم نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کی پہلی ہی گیند پر وکٹ حاصل کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا، بتائیے انہوں نے یہ وکٹ کس کھلاڑی کو آؤٹ کرکے حاصل کی تھی۔؟

(۲۰) ۱۸ر جولائی دُنیائے کرکٹ کے تین مشہور کھلاڑیوں کی تاریخ پیدائش ہے۔ ان میں سے دو کھلاڑی تو ڈبلیو جی گریس اور گارفیلڈ سوبرز ہیں۔ کیا آپ ۱۸ جولائی کو پیدا ہونے والے تیسرے کھلاڑی کا نام بتا سکتے ہیں ؟

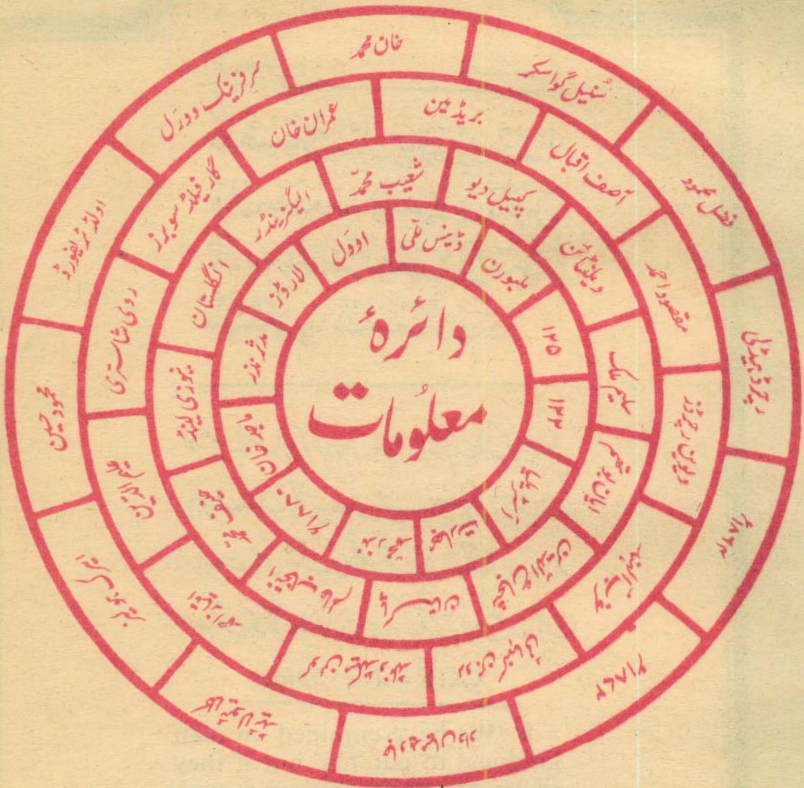

جوابات

۱، حضرت عیسیٰؑ ۔ ۲، حضرت ابوایوب انصاریؓ ۔ ۳، طارق بن زیاد ۔ ۴، شیر شاہ سوری

۵، مولانا محمد علی جوہر ۔ ۶، ڈاکٹر عبدالقدیر خان ۔ ۷، لاہور ۔ ۸، انورالساداتؔ

۹، الجزائر ۔ ۱۰، ڈھاکہ ۔ ۱۱، ماؤزے تُنگ ۔ ۱۲، نیلسن

۱۳، ہیلن کیلر ۔ ۱۴، ابن الہیثم ۔ ۱۵، آئن اسٹائن ۔ ۱۶، ڈبلیو جی گریس

۱۷، جان کیٹس ۔ ۱۸، شبلی نعمانیؒ ۔ ۱۹، رحمٰن بابا ۔ ۲۰، چارلی چپلن

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ
وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ
لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ
فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝٨

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنیکا حکم
دیا ہے (اے مخاطب) اگر تیرے ماں باپ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی کو
شریک بنائے جسکی حقیقت کی تجھے واقفیت نہیں۔ تو انکا کہنا نہ مانیو۔ تم
(سب) کو میری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ پھر جو کچھ تم کرتے تھے میں تمکو جتادونگا ۝٨

XXIX—*The Spider*

---

8. We have enjoined on man kindness to parents, but if they strive to make thee join with Me that of which thou hast no knowledge, then obey them not. Unto Me is your return and I shall tell you what ye used to do.

درست جوابات ارسال کرنے والے ذہین ساتھیوں کے نام اور تصاویر

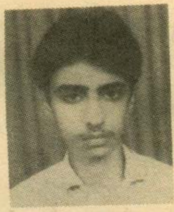

۱
اسماعیل عبدالرحمٰن
میٹھادر، کراچی

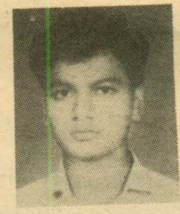

۲
جاوید اسلام
کورنگی، کراچی

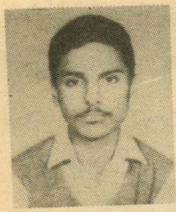

۳
متاع الرحمٰن
اسلام آباد

۴
محمد آصف النظر
لاوہ، چکوال

۳ خوش نصیب ساتھی جو بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حقدار قرار پائے

(۱) شہانہ شمشاد ——— شو مارکیٹ نمبر ۳ کراچی
(۲) فیصل مختار صدیقی ——— کیڈٹ کالج پٹارو۔ دادو
(۳) شکیل احمد ——— جمرود۔ خیبر ایجنسی

- عظمیٰ مسعود، ہری پور، ہزارہ
- فیصل محمد صدیق، میٹھادر، کراچی
- شائستہ افسر، پشاور
- رخشندہ تابندہ ریاض، باغبانپورہ لاہور
- حبیب علی عارف، لطیف آباد حیدرآباد
- محمد منیب اسلام، اسلام آباد
- خاور جعفری، امیرآباد، حیدرآباد
- عامر رضا، جہلم
- نیر توحید، شیخوپورہ
- منصور احمد، گڑھی شاہو، لاہور
- سید محمد علی رضوی، لطیف آباد حیدرآباد
- تصویر زہرہ، راولپنڈی
- رؤف عباس آرائیں، کوٹ غلام محمد
- ندیم میمن، فقیر کا پڑ، حیدرآباد،
- محمد عمران قادر، ٹنڈو آدم
- ساجد جمیل، لانڈھی، کراچی
- کاشف شکور غزل، سانگھڑ
- محمد سعد فیصل، رحیم یار خان
- آصفیہ یاسین، لطیف آباد حیدرآباد
- خرم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال کراچی
- محمد سلمان حمزہ، رحیم یار خان
- محمد ماہر علی احمد، بفرزون، کراچی
- مرزا توصیف بیگ، شاہی بازار حیدرآباد
- محمد انجم آرائیں، سانگھڑ
- عبدالباسط محمد انور، فیڈرل بی ایریا کراچی
- مرتضیٰ علی خان، پی ای سی ایچ ایس کراچی
- سیف اللہ صدیقی، کورنگی کراچی
- اسد رضا باقری، فیڈرل بی ایریا، کراچی،
- سیدہ شاہدہ فردوس، سمن آباد، لاہور
- لیاقت علیخان، لاوہ، چکوال

ایک غلط جواب ارسال کرنے والے ساتھی

- مسعود احمد، گلبرگ، کراچی
- چوہدری ساجد حسین، رتن تلاؤ، کراچی
- محمد غلام حسین میمن، کھائی روڈ، حیدرآباد
- نجیب الدین محمد، پشاور
- غلمی عقیل فاروقی، سکھر
- سید نجم احمد، سندھی ہوٹل، کراچی
- ساجدہ مغل، گھوٹکی، ضلع سکھر
- محمد سلمان غنی، عامل کالونی، حیدرآباد
- ضیا آگرو، سول لائنز، حیدرآباد
- شبانہ کلیم، راولپنڈی
- آصف موتگ، عزیزآباد، کراچی
- بابر شاہ، جتیاں، اٹک
- عبدالعزیز شیخ، سکھر
- وجیہہ شیریں، فردوس کالونی، کراچی
- سہیل صدیق، گوجرانوالہ
- شہاب الدین، فیڈرل بی ایریا، کراچی
- سیدہ نسرین اعجاز، نیو کراچی
- خواجہ عمر فاروق، النور سوسائٹی، کراچی
- سلطان بشیر، اسلام آباد
- امنیٰ ناہید، ناظم آباد، کراچی
- محمد راشد الہدیٰ، قصبہ کالونی، کراچی
- ولید یعقوب، گڑھی شاہو، لاہور
- صارم ظفر، واہ کینٹ
- سید حیدر شاہ، شیلائٹ ٹاؤن، کراچی
- عاصم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال، کراچی
- سید یوسف نصر اللہ، ڈیفنس، کراچی
- حافظ آصف سہیل، گوجرانوالہ
- مقصود احمد صدیقی، اورنگی ٹاؤن، کراچی
- شاہ کریم عطار، دستگیر، کراچی
- سید فخر الحسن، ریلوے کالونی، سکھر
- عاصمہ گل، پشاور
- حمیرا فلک ناز، دستگیر، کراچی
- محمد اشرف جاوید، اوکاڑہ
- محمد امین سیف الملوک، سانگھڑ
- سلمیٰ عمر عطار، دستگیر، کراچی
- راحیل سلمان، عزیزآباد محمدی کالونی
- غازی صلاح الدین، سانگھڑ
- سید بلال اطہر، کھوکھراپار، کراچی
- محمد فہیم سلطانی، نیو کراچی

قطب جنوبی پر سب سے پہلے کون پہنچا؟

۱۹۱۱ء میں انٹارکٹک کے برفانی علاقے میں دو تحقیقی جماعتوں کے مابین ایک خطرناک ریس جاری تھی۔ اُس وقت تک کوئی بھی قطب جنوبی پر نہ پہنچا تھا۔ ناروے کے کیپٹن رولڈ ایمنڈزن اور برطانیہ کے کیپٹن رابرٹ فیلکن اسکاٹ کے ماتحت مُہم جُو جماعت کی کوشش تھی کہ دوسروں سے پہلے وہاں پہنچے۔ ۱۴ دسمبر کو کیپٹن ایمنڈزن سب سے پہلے یہاں پہنچا۔ اس کے مقابلے میں کیپٹن اسکاٹ کو تربیت یافتہ کتّوں کی سہولت بھی حاصل تھی۔ کیپٹن اسکاٹ کی پارٹی ۱۷ر جنوری ۱۹۱۲ء کو یہاں پہنچی اور اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ ایمنڈزن کی پارٹی ان سے ایک ماہ پہلے یہاں پہنچ چکی ہے۔ اسکاٹ کی جماعت واپسی کے سفر میں ایک المیے سے دوچار ہوگئی۔ ۱۷ فروری کو پیٹی افسر ایونز کا انتقال ہوگیا۔ ایک ماہ بعد کیپٹن اوٹس برفباری کی وجہ سے جسم پر زخم آنے سے ہلاک ہوگیا۔

باقی بچ رہنے والے کیپٹن اسکاٹ، ڈاکٹر ولسن اور لیفٹیننٹ بوورز کوان کے فوڈ ڈپو سے گیارہ میل کے فاصلے پر برف کے طوفان نے آلیا اور وہ بھی فاقہ کشی سے ہلاک ہوگئے۔

انکل آئی کیو روبوٹ

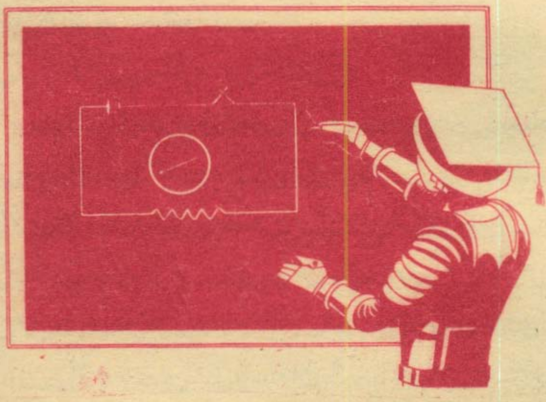

سوالاً جواباً

ہمیں نیند کیوں آتی ہے ؟

ارشد عمران مسلم ٹاؤن پنڈی گھیب

نیند دراصل ہمارے جسم کو آرام پہنچانے کے لیے آتی ہے۔ سارا دن آپ کام کرتے ہیں اور جب رات کو سونے کے لیے لیٹتے ہیں تو آپ کو نیند فوراً ہی آجاتی ہے۔ سوتے ہوئے آپ کے جسم کا ہر عضو آرام کرتا ہے حتّٰی کہ دل کی دھڑکن کی رفتار بھی کم ہو جاتی ہے۔ تھکاوٹ کا شمار ایک قسم کے زہر میں ہوتا ہے۔ جب ہمارے جسم کا کوئی عُضلہ ----- Muscle کام کرتا ہے تو وہ لیکٹک ترشہ Lactic Acid تیار کرتا ہے اگر ہم کسی تھکے ہوئے عضو سے لیکٹک ترشے کو نکال دیں تو وہ عضلہ دوبارہ کام کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ جسم کے اندر عضلاتی سرگرمیوں کے نتیجے میں دوسرے مادّے بھی پیدا ہوتے ہیں، جن کو ہم تھکاوٹی زہر کہہ سکتے ہیں یہ مادّے خون کے ذریعے سارے جسم میں سرایت کر جاتے ہیں۔ خصوصاً ہمارا دماغ تھکاوٹ کو محسوس کرتا ہے۔

سائنس دانوں نے تھکاوٹ کا ایک نہایت دلچسپ تجربہ کیا انھوں نے ایک بہت تھکے ہوئے کتے کا جو سو رہا تھا خون دوسرے کتے کو جو چاق و چوبند تھا منتقل کر دیا۔ چاق و چوبند کتا فوراً ہی تھک گیا اور سو گیا پھر تھکے ہوئے کتے کو چاق و چوبند کتے کا خون منتقل کر دیا گیا۔ تھکا ہوا کتا جاگتا رہا۔ لیکن تھکاوٹ کوئی کیمیائی عمل نہیں ہے یہ خالصتاً حیاتیاتی عمل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے جسم کے خلیات کو آرام پہنچائیں۔ اسی لیے جب ہم سوتے ہیں تو ہمارے خون کی گردش کی رفتار بھی کم ہو جاتی ہے۔ سوتے میں ہمارے جسم کا درجۂ حرارت بھی کم ہو جاتا ہے۔ نیند ہمارے جسم کو آرام پہنچانے کے لیے بہت ضروری ہے۔

شہابِ ثاقب کیا ہوتے ہیں کیا یہ واقعی زمین پر گرتے ہیں؟

عبدالرزاق اسماعیل کھتری، یوسف ہارون روڈ بغدادی،

شہابِ ثاقب مُردہ ستاروں کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ دُم دار ستاروں کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ جب یہ دُم دار ستارے کروڑوں میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹوٹتے ہیں تو ان کے ٹکڑے تمام خلا میں پھیل جاتے ہیں اور خلا میں ایک طوفان مچا دیتے ہیں۔ یہ ٹکڑے ایک خاص مدار میں گردش بھی کرتے ہیں کچھ ٹکڑے خلا میں سفر بھی شروع کر دیتے ہیں۔ ان ٹکڑوں کا وزن کئی ٹن کے قریب ہوتا ہے، لیکن یہ زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی رگڑ کھا کر خلا میں ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ کوئی ایک آدھ ہی شہابِ ثاقب زمین تک پہنچ پاتا ہے۔ جو ٹکڑے زمین تک پہنچتے ہیں انہی کو شہابِ ثاقب کہا جاتا ہے۔ سب سے بڑا شہابِ ثاقب جس کا وزن ۶۰ سے ۷۰ ٹن کے درمیان ہے افریقہ میں گرا تھا۔ شہابِ ثاقب کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو زیادہ تر نکل اور لوہے پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کو دھاتی شہابیے کہا جاتا ہے۔ دوسرے وہ جو معدنیات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جو حرارت کی وجہ سے بن جاتے ہیں ان کو پتھریلے شہابیے کہا جاتا ہے۔ شہابِ ثاقب کی اوپری سطح سیاہ ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کرۂ ہوائی میں داخل ہونے کے بعد رگڑ سے گرم ہو کر ان کی سطح سیاہ ہو جاتی ہے۔

انکل سُننے میں آیا ہے کہ کبھی کبھی مینڈکوں اور مچھلیوں کی بارش بھی ہوتی ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟

عرفانہ اصغر، کبیر والا

وجہ یہ ہے کہ گرمیوں کے زمانے میں جب زمین تپنے لگتی ہے تو اس پر سے اُٹھنے والی گرم ہوائیں چکر کھاتی ہوئی اوپر بھی جاتی ہیں اور ساتھ ساتھ آگے بھی بڑھتی رہتی ہیں جنھیں بگولے کا نام دیا گیا ہے۔ یہ بگولے جب بہت طاقتور ہو جاتے ہیں تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جہاں سے گزرتے ہیں وہاں کی چیزوں کو اوپر اُٹھا لیتے ہیں جیسے کوئی خلا پمپ کھینچ لیتا ہے۔ یہ چیز اُڑتی اور چکر لگاتی ہوئی بگولے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور جب یہ بگولہ کسی

تالاب یا جھیل پر سے گزرتا ہے تو پانی کے ساتھ ساتھ اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اُوپر کھنچ جاتا ہے اور یہ بے چاری مچھلیاں اور بدنصیب مینڈک ہوا میں چکّر کھاتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں اور جب یہ بلند ہوتے ہیں تو بادلوں تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر بارش ہوتی ہے تو لوگ حیرت کرتے ہیں کہ یہ مخلوق کہاں سے آٹپکی ہے۔

میں نے کچھ دن پہلے سُنا تھا کہ کائی ایک پودا ہے۔مجھے بہت حیرت ہوئی کیا واقعی کائی ایک پودا ہے؟

نصرت جہاں کھوکھر، نواب شاہ سندھ

جی ہاں کائی ایک پودا ہے۔اسے سائنس کی زبان میں الجی کہتے ہیں، لیکن یہ عام قسم کے پودوں سے ذرا مختلف ہے۔کسی شاعر نے بھی تو کہا ہے ؎ سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی

کائی عام پودوں سے ذرا مختلف یوں ہے کہ اس میں عام پودوں کی طرح تنا نہیں ہوتا، شاخیں نہیں ہوتیں پھل نہیں آتے۔اس میں بیج نہیں پیدا ہوتے۔کائی ایک نہایت ابتدائی قسم کا پودا ہے جو یک خلوی ہوتا ہے۔یعنی ایک خلیے کا ہوتا ہے اور یہی ایک خلیہ زندگی کے تمام کام انجام دیتا ہے۔کائی عموماً باریک ریشوں کی شکل میں پائی جاتی ہے کبھی کبھی کئی کئی فٹ لانبے ہوتے ہیں اور پانی میں تیرتے رہتے ہیں اگر پانی میں کوئی بڑا پودا ہو تو یہ ریشے اسی سے لپٹ جاتے ہیں۔کائی کا رنگ ہمیشہ ہرا نہیں ہوتا بلکہ سُرخ یا کتھئی بھی ہو سکتا ہے۔جاپان اور کئی دوسرے ممالک میں کائی سے انسانی غذا تیار کی جارہی ہے، برسات کے موسم میں تالابوں اور جھیلوں پر جو کائی جم جاتی ہے وہ یہی چیز ہے فرق صرف جگہ اور جسامت کا ہے۔

پہاڑوں پر جمی ہوئی قطب شمالی اور قطب جنوبی کی ساری برف پگھل جائے تو کیا ہوگا۔؟

سید جاوید حیدر شاہ، راولپنڈی

اس بات کا امکان بہت ہی کم ہے کہ ساری دنیا کی برف یکدم پگھل جائے لیکن اگر ایسا ہونا بھی شروع ہو جائے تو اس کو پگھلتے پگھلتے بھی ہزاروں سال لگ جائیں گے۔اگر خدانخواستہ ساری دنیا کی برف یکدم پگھل جائے تو سمندر کی سطح ۵۰۰ رسے ۶۰۰ رفٹ تک بلند ہو جائے گی۔قطب جنوبی کی برف جو خود ۶۰ رلاکھ مربع میل تک پھیلی ہوئی ہے اگر پگھلے تو اس کا پانی ۶۵ رلاکھ مربع میل رقبہ گھیرے گا۔اگر سمندر صرف سَو فٹ بلند ہو جائے تو سارے ساحلی علاقے ڈوب جائیں گے۔کراچی کا تو پتہ بھی نہیں چلے گا۔اگر سمندر کی سطح ۶۰۰ رفٹ بلند ہو جائے تو دنیا کے تقریباً ۹۰ فیصد علاقے میں پانی ہی پانی ہوگا۔اندازہ لگایا گیا ہے کہ سمندر کی سطح چھ ہزار سال پہلے کے سمندر سے تقریباً ۱۴ رفٹ بلند ہو گئی ہے اور یہ کام ابھی چند سو سال پہلے ہی ہوا ہے۔

○ انکل برق سکونی کیا ہے؟ اور کیسے پیدا ہوتی ہے۔ مثال سے سمجھائیے۔

الیاس فاروق، انڈس مہران ملیر کراچی

بھئی سادہ لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ برقِ سکونی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔

برق سکونی جسے انگریزی میں STATIC ELECTRICITY کہتے ہیں عام بجلی سے بہت مختلف ہوتی ہے آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ اگر پلاسٹک کے کنگھے کو سر کے بالوں میں چند مرتبہ پھیریں اور پھر اُسے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے قریب لائیں تو کاغذ کے ٹکڑے کنگھے کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم شیشے کی ایک سلاخ کو ریشم پر یا سخت ربڑ کی سلاخ کو اون سے رگڑتے ہیں تو ان میں بھی ایسی ہی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس خاصیت کی وضاحت کے لئے ہم کہتے ہیں کہ اس چیز میں برقی چارج پیدا ہو گیا ہے۔ اور کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کھینچنے کی قوت برقی چارج کے باعث ہے۔

عام حالات میں کسی بھی مادے میں منفی اور مثبت چارج کی مقدار برابر ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی چیز سے کچھ الیکٹران نکال دیئے جائیں تو اس میں الیکٹرانوں کی کمی واقع ہو جائے گی۔ یعنی وہ چیز مثبت چارج ہو جائے گی۔ مثلاً جب شیشے کی سلاخ کو ریشم کے ساتھ رگڑتے ہیں تو شیشے کی سلاخ سے کچھ الیکٹران علیحدہ ہو کر ریشم پر منتقل ہو جاتے ہیں اس لئے شیشے کی سلاخ پر مثبت چارج ہو جاتا ہے اور ریشم پر منفی چارج ہو جاتا ہے اس کے برعکس جب سخت ربڑ کی سلاخ کو اون کے ساتھ رگڑا جاتا ہے تو اون سے کچھ الیکٹران علیحدہ ہو کر ربڑ کی سلاخ پر آ جاتے ہیں۔ جس سے ربڑ کی سلاخ پر منفی چارج ہو جاتا ہے۔ اور اون پر مثبت چارج اس طرح کسی جسم پر پیدا شدہ مثبت یا منفی چارج کو برق سکونی STATIC ELECTRICITY کہتے ہیں۔

بھئی ہم نے تو سادہ لفظوں میں آپ کو برق سکونی کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اب بھی اگر کوئی بات وضاحت طلب رہ گئی ہے تو بلا جھجک پوچھ لیجئے ہمیں نہیں معلوم ہوگی تو ہم بڑے بڑے سائنس دانوں سے پوچھ کر آپ کو بتا دیں گے۔

○ جب ہم لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں تو کروٹ کیوں بدلتے ہیں۔ اور کروٹ بدلتے ہوئے ہم لوگوں کی آنکھ کیوں نہیں کھلتی ہے۔؟

(شادمان مجید، اورنگی ٹاؤن کراچی)

شادمان صاحب اسے اللہ تعالیٰ کا انتظام کہہ لیجئے کہ انسان سوتے ہوئے کروٹیں بدلتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اگر انسان ایک کروٹ سوئے تو اس کا دورانِ خون متاثر ہو سکتا ہے۔ آپ کو بھی اس کا تجربہ ہوا ہوگا کہ اگر آپ کا کوئی ہاتھ ایک طرف دبا رہ جائے تو وہ سُن ہو جاتا ہے۔ سُن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کروٹ بھی بدل لیتا ہے۔ اور اس کی آنکھ بھی نہیں کھلتی اور کبھی کبھار کروٹ بدلتے ہوئے آنکھ کھل بھی جاتی ہے وہ اس لئے کہ اگر آپ نے ذرا بھی غلط

سمت کروٹ لے لی اور چارپائی سے نیچے گر گئے تو ظاہر ہے کہ آپ کی آنکھ کھل جائے گی۔

○ آندھی کیوں اور کیسے آتی ہے؟

(اویس عزیز شیخ، فیصل آباد)

اکثر ہم جب گھر سے باہر نکلتے ہیں تو دیکھتے ہیں ہر طرف گرد اڑ رہی ہے اور ساتھ میں کچھ ہلکی پھلکی چیزیں بھی اڑ رہی ہیں۔

پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ آندھی ہے کیا چیز؟

آندھی زمین کے اوپر ہوا کی حرکت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہوا کی اس حرکت کا کیا سبب ہوتا ہے؟ تمام آندھیاں صرف ایک سبب سے آتی ہیں۔ یعنی درجہ حرارت میں کوئی تبدیلی آرہی ہوتی ہے۔ جب ہوا گرم ہوتی ہے وہ پھیلتی ہے اور گرم ہوا ہلکی ہوکر اوپر بڑھتی جاتی ہے اور گرم ہوا کی جگہ سرد ہوا لیتی ہے اور اس عمل کے نتیجے میں آندھی آتی ہے آندھیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ عالمی پیمانے پر آنے والی آندھی اور مقامی طور پر پیدا ہونے والی آندھی عالمی پیمانے کی آندھی خط استوا کے گرم علاقوں سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں سورج کی روشنی براہ راست پڑتی ہے اور بہت تیز ہوتی ہے۔ یہاں سے چلنے والی آندھی قطب جنوب اور شمالی کا رُخ کرتی ہے ابھی یہ ہوا اپنے سفر کا ⅓ فاصلے کر رہی ہوتی ہے کہ سرد ہوکر واپس پلٹتی ہے اور دوبارہ کچھ ہوائیں قطبین کی طرف سفر کرتی رہتی ہیں۔ اس قسم کی آندھی کو مفید آندھیاں کہا جاتا ہے۔ اکثر عالمی آندھی کو مقامی آندھیاں مختلف سمتوں میں تقسیم کردیتی ہیں۔ مقامی آندھی کے آنے کا سبب ہوتا ہے کہ سرد ہوا کا دباؤ زمین پر بڑھ جاتا ہے یا گرم ہوا کم دباؤ کے ساتھ سفر کرتی ہے لیکن مقامی آندھی کا دائرہ زیادہ طویل نہیں ہوتا۔ عموماً یہ چند گھنٹوں کے بعد یا چند دنوں کے بعد ختم ہوجاتی ہے روزانہ زمین کے گرم اور سرد ہونے کے باعث بھی آندھیاں آتی ہیں۔ سمندر اکثر رات کو چڑھ آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دن میں سمندر کے اوپر تو سرد ہوا رہتی ہے لیکن رات کو سمندر گرم ہوجاتا ہے تو وہ آگے بڑھنے لگتا ہے اور شہر کی ہوا سمندر کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔

○ تیز ہوا کو کس طرح قابو کیا جاسکتا ہے اور اس سے کیا کام لئے جاسکتے ہیں۔؟

(سلطان بشیر، جی سکس فور، اسلام آباد)

بھئی تیز ہوا کو قابو میں لانا آسان کام نہیں ہے اور تیز ہوا پر اب تک قابو نہیں پایا جاسکا ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر اب تک اس کے ذریعے صرف پون چکی چلائی گئی ہے اور اُس سے بجلی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ان پون چکیوں سے بہت بڑی تعداد میں بجلی نہیں حاصل کی جاسکی ہے یہ تیز ہوا صرف نقصان نہیں پہنچاتی فائدہ مند بھی ہوتی ہے اس کے نتیجے میں بادل ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ بارش برساتے ہیں موسموں میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ یہ سب تیز ہوا کے کرشمے ہیں۔

●●●

پانڈا جس کی نسل ختم ہو رہی ہے

جنگل اور جانور فطرت کا حُسن ہیں اور دونوں ایک دوسرے کیلئے تقریباً لازم و ملزوم ہیں۔ حضرتِ انسان نے کچھ تو اپنی فطرت اور کچھ تقاضوں سے مجبور ہو کر جنگلی جانوروں کا اس بے دردی سے شکار کیا ہے کہ نہ صرف بے شمار جانور آج صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو چکے ہیں اور اُن کی نسل کا کوئی فرد اب زمین پر نہیں پایا جاتا بلکہ متعدّد خوبصورت اور نایاب جانوروں کی نسلیں تیزی سے معدوم ہوتی جارہی ہیں۔

"پانڈا" بھی ایک ایسا ہی جانور ہے جو آج اپنی نسل ختم ہو جانے کے خطرے کا شکار ہے۔ اس خوبصورت وحشی جانور کو اس بے دردی سے شکار کیا گیا ہے کہ اب دنیا بھر میں ایک اندازے کے مطابق اس کی نسل میں بمشکل ایک ہزار جانور باقی بچے ہیں۔ اس کی نسل کو بالکل ہی نیست و نابود ہونے سے بچانے کے لیے عالمی ادارۂ تحفّظِ حیوانات نے ایک مُہم شروع کی ہے جس کے تحت اس کی نسل میں اضافے کے لیے متعدّد اقدامات کیے جارہے ہیں۔

پانڈا کو ریچھ اور بن مانس کی درمیانی کڑی کہا جاسکتا ہے جسمانی طور پر دونوں سے مُشابہ ہونے کے علاوہ اس کی عادات بھی دونوں جانوروں سے ملتی جُلتی ہیں۔ پانڈا کا اصل گھر چین ہے۔ دنیا بھر میں یہ صرف مشرقی چین اور شمالی برما کے درمیانی علاقے میں پایا جاتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ پانڈا کی نسل تیس لاکھ سال پُرانی ہے یعنی پانڈوں کے جدِّ امجد تیس لاکھ سال پہلے وجود میں آئے تھے۔ پانڈے کی بے دریغ نسل کشی کی وجہ سے یہ خوبصورت جانور قلّتِ تعداد کا شکار ہو گیا ہے اور ماہرین کے مطابق اگر اس کی نسل کو ختم ہونے سے نہ بچایا جائے تو بہت جلد اس کی نسل کا خاتمہ ہو جائے گا۔

پانڈا طبعی طور پر صرف انتہائی ٹھنڈے علاقوں میں زندہ رہ سکتا ہے۔ کم سرد یا گرم علاقوں میں اس کی افزائشِ نسل کی کوششیں ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔ تیس لاکھ سال پہلے پائے جانے والے پانڈے اور آج کل کے پانڈے میں موسمیاتی اور جسمانی طور پر کوئی زیادہ فرق واقع نہیں ہوا حتّٰی کہ ان کے دانت تک اسی ساخت کے مطابق موجود ہیں جو لاکھوں سال پہلے پائے جانے والے پانڈوں کے تھے۔

عالمی ادارۂ تحفّظِ حیوانات (ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ) کے اشتراک سے چین میں "پانڈا ریسرچ پروجیکٹ" پر عملدرآمد کیا جارہا ہے جس کے تحت تقریباً آدھے پانڈوں کو ایک درجن خصوصی تیّار شُدہ "جنگلی ماحول" میں رکھا گیا ہے تاکہ انھیں شکاریوں کی دستبُرد اور موسمی سختیوں سے محفوظ رکھا جاسکے۔۔

ہے نا حیرت کی بات

وجیہہ احمد صدیقی

دنیا میں آج جتنی ایجادات نظر آرہی ہیں اُن کا پہلے پہل صرف تصور کیا جاسکتا تھا۔ ہر چیز نے پہلے خیال میں جنم لیا اور پھر اس خیال نے عملی جامہ پہنا۔ پس پتا چلا کہ اصل اہمیت "خیال" کی ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی ترقّی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں نئے خیالات کو پسند کیا جاتا ہے، اُن کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ہر نیا خیال دراصل ترقّی کی جانب ایک اور قدم ہوتا ہے۔

اب یہی دیکھئے کہ گاڑی اور پہیے کا تصور لازم و ملزوم ہے۔ یعنی کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ گاڑی پہیے کے بغیر بھی چل سکتی ہے۔ لیکن جاپان کی صنعتی کمپنیوں نے "نیا خیال" پیش کرنے کا ایک دلچسپ مقابلہ منعقد کیا۔ اس مقابلے میں ہر کمپنی نے ایک سے ایک انوکھی چیز پیش کی اور یہ مقابلہ اُس وقت اپنے دلچسپ ترین مرحلے میں داخل ہوا جب ایک کمپنی کی جانب سے یہ صاحب بغیر پہیوں کی اس نئے انداز کی گاڑی پر سوار مُسکراتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اس گاڑی کو دیکھ کر لوگوں کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ آپ دیکھ رہے ہیں اس گاڑی میں دو پہیوں کی جگہ سولہ عدد فُل بوٹ لگے ہوئے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ گاڑی نہیں چل رہی، فوجی پریڈ کر رہے ہیں۔ گاڑی سوار کا کہنا ہے کہ "گاڑی چلنے میں اتنا جھٹکا تو نہیں کھاتی ہے البتّہ لوگ عجیب نظروں سے ضرور دیکھتے ہیں۔" خیر اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، ہر نئی ایجاد کو لوگ پہلے عجیب ہی نظروں سے دیکھتے ہیں پھر اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔

ترجمہ : ابوظفر زین

سفید بھوت

زیادہ دن نہیں گزرے کہ لندن سے ایک حسین وجمیل ماہوار رسالہ نکلتا تھا۔ گھوسٹ، جو ہر شمارے میں بھوتوں اور بلاؤں کے متعلق کم از کم ایک کہانی دیا کرتا۔ یہ رسالہ بہت بِکتا تھا۔ ہر ماہ ایسی کہانیاں پڑھنے کے لیے لوگ اس رسالے کے منتظر رہتے تھے اور رسالے کے مالکان نے بھوتوں کی کہانیاں لکھنے کے لیے اعلیٰ تنخواہوں پر ماہرین کا عملہ رکھا ہوا تھا جو ایسی خوفناک کہانیاں لکھتے تھے کہ لوگ پڑھ کر ڈر جائیں۔

"گھوسٹ" میں ایک مرتبہ ایک کہانی شائع ہوئی جس کی سُرخی تھی "سفید بھُوت، موٹر سائیکل پر" لندن سے چار سو میل دور یارڈ فورڈ بستی کے پادری بشپ میک فرسن نے اشاعت کے لیے ایک کہانی بھیجی تھی جس میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ سچ مچ ایک سفید رنگت بھوت ہر جمعرات کو نو بجے شب موٹر سائیکل پر بستی کے کنارے والی سڑک پر نمودار ہوتا ہے اور اس مقام پر جہاں پہلے ریلوے لائن ہُوا کرتی تھی، غائب ہو جاتا ہے۔ پادری بشپ میک فرسن نے اپنا قلمی نام 'پرنس آف

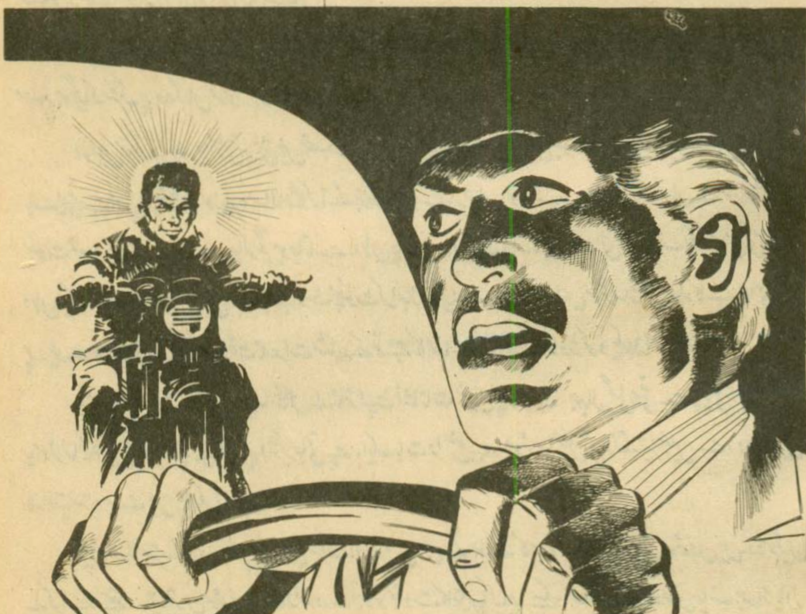

ڈنمارک رکھا تھا جو شیکسپیئر کے ایک مشہور ڈرامے کا نام ہے۔ وہ اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

گھوسٹ کے ادارتی اسٹاف نے غور کیا کہ بشپ قسم کے لوگ خواہ مخواہ جھوٹ نہیں بولا کرتے اور پھر وہ اس بستی کے گرجا میں گزشتہ بیس سال سے ذمّہ دار عہدہ پر کام کر رہا ہے۔ اُسے یقین ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ کیوں نہ پوری تحقیقات کر لی جائے۔

انھوں نے اپنے دو بہترین جاسوس... ڈین اور لاسٹر کو اس کام پر لگا دیا۔ یہ دونوں نہایت صحتمند اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ گھونسا بازی یعنی باکسنگ کے علاوہ جوڈو کراٹے بھی خوب جانتے تھے۔ کشتی، چھلانگ، سمر سالٹ اور چھوٹے خنجر کا کام بھی وقتِ ضرورت کر لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کیمرہ، مووی کیمرہ، ٹی وی کیمرہ کے فنون کے ماہر تھے اور لطف یہ کہ وہ رپورٹنگ کرنا بھی جانتے تھے اور بھیس بدلنا بھی۔

وہ جمعرات کی صبح ہی کو یارڈ فورڈ بستی پہنچ چکے تھے۔ دوپہر ہونے تک انھوں نے چار بڈّھے مرد اور ایک جوان عورت کا انٹرویو لے لیا تھا۔ یہ معلوم ہوا کہ واقعہ غلط نہیں ہے۔ اکثر لوگوں نے اپنی آنکھوں سے ان بھوتوں کو دیکھا ہے اگرچہ بہت سے لوگوں نے نہیں دیکھا۔ بچّوں کے لیے ٹافیاں اور بسکٹ بیچنے والے ایک دکاندار نے کہا... عام طور پر ایک ہی بھوت آتا ہے لیکن کبھی کبھی دو بھوت آتے ہیں اور کبھی تین۔ سب اپنی اپنی موٹر سائیکل پر ہوتے ہیں۔ سب کی رنگت انگریزوں کی طرح گوری ہے۔

اخیر میں ڈین اور لاسٹر نے "پرنس آف ڈنمارک" کا انٹرویو لیا۔ ظاہر ہے کہ وہاں سے اُس کی تصدیق ہوگئی۔ انھیں یہ معلوم ہو گیا کہ سڑک پر وہ کہاں نمودار ہوتا ہے اور کہاں جا کر گم ہو جاتا ہے۔

افواہیں تو گرد کی طرح اُڑتی رہتی ہیں خصوصاً جب کہ دلچسپی کا موضوع 'خیالی بھوت' ہو۔ ایک زبان دوسری زبان سے بات لیتی ہے اور اپنا چٹخارہ اور بارہ مسالا لگا کر آگے بڑھا دیتی ہے۔ جہاں افواہ سازوں نے بتایا کہ یہاں سے موٹر سائیکل والا بھوت نمودار ہوتا ہے اور یہاں جا کر گم ہو جاتا ہے۔ وہاں چالیس سال پہلے ایک ریلوے لائن تھی جو اب اُکھاڑ دی گئی ہے۔ وہاں ایک ریلوے اسٹیشن بھی تھا جو اب ٹوٹ پھوٹ کر اُجاڑ ہو گیا ہے۔ یہ بھوت اس موٹر سائیکل سوار کا ہے جو اسی مقام پر ریلوے حادثہ میں مارا گیا۔ وہ وقت جمعرات شب کے نو بجے کا تھا۔ وہ اپنی جائے حادثہ کو دیکھنے آتا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی موٹر سائیکل کے ٹائر اپنے نشانات نہیں چھوڑتے۔ جہاں گیلی مٹّی ہے یا پانی ہے وہاں یہ موٹر سائیکل مع سوار اوپر ہی اوپر پرواز کر جاتی ہے۔ ایک بات واضح ہے۔ موٹر سائیکل کی رفتار تیز نہیں ہے۔ وہ چار میل کا راستہ سترہ منٹ میں طے کرتی ہے۔

ڈین اور لاسٹر نے اس تمام چار میل سڑک اور آس پاس کے علاقے کا معائنہ کیا اپنی اپنی موٹروں میں۔ وہ موٹریں لے کر آئے تھے... تیز ترین موٹریں... تاکہ ضرورت ہو تو بھوت کا پیچھا کیا جا سکے۔ سڑک کے دونوں جانب جھاڑیاں

تھیں جہاں وہ اپنی اپنی کاروں کو چُھپا سکتے تھے۔

سرِشام ہی وہ آکر اپنی کمین گاہ میں چھُپے بیٹھے تھے ایک ہی کاریں۔ کہ کب رات کے نو بجیں اور وہ ایک دلکش کہانی کے خاکے سے دوچار ہوں۔ یہ ایک اچھی کہانی بننے والی تھی۔۔۔ ایک بھُوت موٹر سائیکل پر جو گزشتہ چالیس سال سے مقررہ وقت اور مقررہ جگہ پر بلا ناغہ آتا ہے۔ جس کے ٹائر کے نشانات نہیں اُٹھتے اور جس کی گاڑی کچّی مٹّی اور پانی کو پھاند جاتی ہے۔

ڈین نے اپنے مووی کیمرے کو ٹھیک ٹھاک کر لیا تاکہ "گھوسٹ" میں جو کہانی آئے وہ تصویروں کے ساتھ ہو۔ لاسٹر نے مکّہ بازی کے دستانے چڑھا لیے، پستول لگا لیا اور گولیوں کی پیٹیاں باندھ لیں تاکہ کہیں بھُوت بدمعاش یا مضبوط نکلا اور اس سے ہاتھا پائی کی نوبت آگئی۔ "مگر کیا اس کہانی میں کوئی حقیقت بھی ہے؟"

ڈین بولا "ہر فرضی کہانی اصلی بیج سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ تو ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ اصلی بیج کیا ہے اور کہاں ہے، ہم نے مقامی علاقے کے نقشہ کا اچھی طرح سے مطالعہ کر لیا ہے۔"

لاسٹر نے گھڑی دیکھی "نو بج رہے ہیں، تیّار ہو جاؤ۔ ہم نے بہت صبر کر لیا۔ اب ہم تیار ہو جائیں اور اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر پوزیشن لے لیں اور اِس بھُوت کا پیچھا کریں۔"

لاسٹر اپنی گاڑی میں چلا گیا۔

"ہوشیار" اچانک ڈین نے ہلکی چیخ ماری "وہ آ رہا ہے۔"

بے شک ایک موٹر پُش بائک کی مدّھم ہیڈ لائٹ معمولی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ مشین میں کوئی آواز نہ تھی۔ ڈین نے اپنا مووی کیمرہ ٹھیک کیا اور فوکس لگایا۔ موٹر سائیکل اور سوار دونوں اندھیرے میں ملفوف تھے۔ مگر اتنی بات تھی اس کے چہرے سے ایک ہلکی روشنی نکل رہی تھی۔ ایک پھٹا پرانا میلا کوٹ وہ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ٹوپی نہ تھی۔ ڈین نے مسلسل چند فوٹو لیے۔ کیمرہ کی روشنی پڑنے سے بھوت چوکنّا ہو گیا۔ اُس نے موٹر سائیکل سڑک سے اُتار لی اور اسے نیچے کچّے پانی میں ڈال دیا جہاں وہ ذرا بلندی پر پرواز کرنے لگی۔

"آج تک نہیں سُنا کہ کوئی موٹر سائیکل پرواز کرتی ہے۔ موٹر نکالو، موٹر نکالو، ہم دونوں اس کا پیچھا کریں سڑک پر"۔ لاسٹر چلّایا "ادھر چلو جدھر وہ ٹوٹا پھوٹا ریلوے اسٹیشن ہے۔"

دونوں نے اپنی اپنی موٹروں سے پیچھا کیا۔

ڈین اور لاسٹر کو حیرت تھی کہ بھُوت کیوں ڈر کے مارے بھاگ رہا تھا۔ بہرحال انھوں نے پیچھا کیا۔ موٹر سائیکل اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئی اور وہاں سے غائب ہو گئی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بھُوت ہمیشہ گُم ہو جایا کرتا تھا۔ ڈین اور لاسٹر بھی اسٹیشن کے اندر غائب ہو گئے۔ اور ٹارچ نکال کر تمام بلڈنگ کا معائنہ کرتے رہے۔

انھوں نے پلیٹ فارم کو دیکھا جس کا فرش بہت جگہ سے اُکھڑ چکا تھا۔ کچھ گھاس کانٹے اِدھر اُدھر نکل آئے تھے مگر ایک جگہ صاف سُتھری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کچھ لوگ یہاں رات کو سویا کرتے ہیں۔ کیا یہ ایک بھوت ہے یا چند ؟

انھوں نے اسٹیشن کے تمام کمروں کی یکے بعد دیگرے تلاشی لی۔ تیز ٹارچ کی روشنی میں انھیں ایک کمرے میں تین عدد پُرانے ڈیزائن کی موٹر سائیکلیں نظر آئیں اور ان کی مرمّت کا سامان بھی۔

ان سائیکلوں کی ہیڈ لائٹ میں مرکری کی پالش تھی جو چلنے میں چمک دیتی تھی۔ ٹائروں پر سفید ویکس پیپر ایرکے دھاگوں سے بندھا ہوا تھا۔ تینوں موٹر سائیکلوں میں ایک خاص اڑان مشین ہوور کرافٹ لگی ہوئی تھی جو اُن ہی اصولوں پر کام کرتی تھی جن اصولوں پر آج کل طیارہ اُڑتا ہے۔ مگر یہ بہت چھوٹی تھی اور اس میں موٹر سائیکل اُڑانے کی طاقت دو فٹ انچائی تک تھی اور نصف میل لمبائی تک۔

ڈین اور لاسٹر کو یقین آگیا تھا کہ یہاں کوئی بھوت نہیں۔ یہ تین مجرم انسان ہیں جنھوں نے کسی خاص سازش کے تحت اپنے آپ کو بھوت مشہور کر رکھا ہے۔ بہت ممکن ہے ان میں ایک لیڈر ہو یا پھر لیڈری کا کام وہ تینوں باری باری کرتے ہیں۔ مگر وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں ؟ ڈین اور لاسٹر نے میگافون کے ذریعہ قریبی پولیس اسٹیشن کو خبر دے دی کہ یہاں کسی جاسوسی کا سُراغ نظر آتا ہے۔ یہ بھوت کی کہانی نہیں ہے۔ یہ کہانی کا بھوت ہے۔

ڈین اور لاسٹر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں جو بھی ہیں بھوت یا انسان وہ خوفزدہ ہیں اور کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ اتنے میں تینوں مجرم بھوت کی شکل بنائے۔ چہرے پر مرکری لگائے جس سے ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ بالوں میں کالا بھبھکا خضاب لگائے بہت خوفناک شور مچاتے کہیں سے دوڑے ہوئے آئے اور 'گھوسٹ' کے دونوں جاسوسوں پر حملہ کر دیا۔

حملہ بہت خطرناک تھا اور وہ اِس فن کے اُستاد معلوم ہوتے تھے۔ لیکن یہ لوگ بھی کسی طرح کم نہ تھے۔ خوب گتھم گتھا جنگ ہوئی۔ گھونسا، لات، مُکّا، اُٹھا پٹک، مار پیٹ۔ پندرہ بیس منٹ تک یہ مقابلہ بازی اور ہنگامہ بازی جاری رہی، دو اِدھر اور تین اُدھر مگر مقابلہ برابر کا تھا۔ دونوں طرف سے خون بہا، زخم آئے، ہڈیاں بھی ٹکرائیں، بہت شور مچا کہ اتنے میں پولیس آگئی۔ پولیس نے آتے ہی ان تین بدمعاشوں کو باندھ کر گرفتار کر لیا۔ اب چھان بین شروع ہوئی وہ تینوں راز اُگلنے کو کسی طرح تیّار نہ تھے۔

اسٹیشن کے تمام کمروں کی تلاشی ہوئی ایک بڑے کمرے میں سائنسی آلات نصب تھے جو کسی بیرونی طاقت کو خبریں دیتے تھے اور وہاں سے ہدایتیں لیتے تھے۔ انھوں نے اسٹیشن کا انتخاب یوں کر رکھا تھا کہ یہ عمارت باہر سے شکستہ اور بے رونق نظر آتی تھی، لیکن بلڈنگ مضبوط تھی اور اندر کے کمرے بالکل صحیح حالت میں تھے۔ ہال بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہیں جاسوسی کے آلات نصب تھے۔ یہاں پانی بجلی وغیرہ کے انتظامات بھی تھے چوروں کے اپنے

لگائے ہوئے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جگہ نہایت مرکزی مقام پر واقع تھی اگرچہ عام آبادی سے بہت دُور اور اُسے عام آبادی سے بہت دُور رکھنے کی تدبیر ایک ہی تھی کہ اُسے بھُوت زدہ اور آسیب زدہ مشہور کردیا جائے۔ اسی لیے اِن میں سے ایک شخص باری باری ہر جمعرات کی رات کو موٹر سائیکل پر بھُوت بن کر آتا تھا اور اسٹیشن کے اندر آکر غائب ہوجایا کرتا تھا۔

حیرت یہ تھی کہ پولیس نے اب تک اِس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ مگر اب اس واقعہ کے بعد یہ عمارت، جو کبھی ریلوے اسٹیشن تھی اب پولیس اسٹیشن بن گئی۔

'گھوسٹ' کا جو نیا شمارہ شائع ہُوا اس میں... سفید بھُوت موٹر سائیکل پر... کی کہانی نہایت آب و تاب سے شائع ہوئی' ذرا' ذرا تفصیل کے ساتھ۔ یہ سفید بھُوت کون تھے، کیا کیا کام کر رہے تھے۔ اب تک انھوں نے مُلک و قوم کو کتنا نقصان پہنچایا۔ کس طرح پکڑے گئے۔ کون سے مسالے اور کیمیائی اجزا استعمال کرتے تھے۔ اسٹیشن کی بلڈنگ کے میدان میں کتنے خشک کنویں کھود ڈالے تھے۔ کہاں کہاں کیا کیا پلانٹ نصب کیے تھے۔ سب کی تصویریں۔

'گھوسٹ' کے نئے شمارے میں اس تقریب کی بھی تمام تصویریں چھاپی گئیں، جن میں افسروں اور دیگر معزّزین کے بھرے مجمعے میں ڈین اور لاسٹر کو طلائی میڈل پہنائے گئے۔ انھیں ترقّی دی گئی۔ اُن کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا۔ جس محنت اور ہمّت سے انھوں نے کام لیا، جس مہارت سے وہ مجرموں سے لڑے اور بہادری دکھلائی، اس پر محکمۂ پولیس نے بھی انھیں گولڈ میڈل عطا کیا اور اپنے پولیس گزٹ میں اُن کی تعریفیں لکھیں۔

ایفل ٹاور

فرانس کے دارالحکومت پیرس کے مرکز میں یہ عظیم الشان ٹاور ۱۸۸۹ء میں پیرس کے نمائش کے لئے تیّار کیا گیا۔ اس ٹاور کو ایک ذہین انجینئر الیگزینڈر ایفل نے ڈیزائن کیا۔ اس نے امریکہ کے مشہور مجسمۂ آزادی کا فریم ورک بھی ڈیزائن کیا تھا۔ ایفل کے نام کی مناسبت سے اسے ایفل ٹاور کہا جانے لگا۔ لوگ اسے دُور دُور سے دیکھنے آتے ہیں اور یہ فرانس کا قومی نشان بن چکا ہے۔

بال کھڑے کرنے والا شخص

پیر میسی نامی ایک فرانسیسی اداکار کو اپنے بالوں پر یہ قدرت حاصل تھی کہ وہ ضرورت کے مطابق اپنے بالوں کو کھڑا کرلیتا تھا۔ اور تو اور وہ جب چاہتا، ان میں گھونگھر بھی ڈال لیتا تھا۔

جوجو
سب سے اچھی چیونگ گم
جوجو کی یہ ببل گم
کھیل کا کھیل
لذّت کی لذّت
Bubble Gum
گلف فوڈ انڈسٹریز گوجرانوالہ (پاکستان)

ہیں وہی لوگ جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

مدر ٹریسا

خلیل اللہ فاروقی

مغربی بنگال میں کسی بھی شخص سے پوچھا جائے کہ کلکتہ کی مصروف ترین اور مقبول ترین شخصیت کون ہے؟ تو ہر دس میں سے نو کا جواب ہوگا۔ مدر ٹریسا۔ یہ مدر ٹریسا کون ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟ ان کی شہرت اور مقبولیت کا سبب کیا ہے یقیناً آپ کے ذہن میں کئی سوال سر اٹھا رہے ہوں گے مدر ٹریسا کی شہرت اور مقبولیت صرف کلکتہ تک محدود نہیں ہے بلکہ تقریباً ساری دنیا اس عظیم خاتون کے نام سے واقف ہے، جس نے اپنی زندگی دُکھی انسانوں کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے ان کی عمر اس وقت پچھتّر سال ہے۔ یہ وہ عمر ہے جب عموماً ہاتھ پاؤں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، ہمت جواب دے جاتی ہے، سہارے کے لئے لاٹھی، دیکھنے کے لئے عینک، کھانے کے لئے بتیسی اور صحت کے لئے دوا لازمی ہو جاتی ہے۔ خصوصاً برّصغیر پاک و ہند کی عورتیں اس عمر تک پہنچتے پہنچتے دنیا سے عملاً کنارہ کش ہو جاتی ہیں اور اپنے چھوٹوں کی ذمہّ داری بن جاتی ہیں۔ مگر مدر ٹریسا آج بھی پورے جذبے، سرگرمی اور ہمت و قوت کے ساتھ انسانیت کے دکھ سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ مدر ٹریسا ۲۷ اگست ۱۹۱۰ء کو یوگوسلادیہ کے ایک قصبے "اسکوپجی" میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والدین کا تعلق البانیہ سے تھا۔ والد اسٹور کیپر تھے۔ ٹریسا سمیت ان کے تین بچے تھے۔ یہ خوشحال خاندان پُرمسرت زندگی گزار رہا تھا کہ ٹریسا بارہ سال کی عمر سے خدمت خلق کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ وہ ۱۹۲۹ء میں کلکتہ آئیں۔ جہاں انہوں نے سینٹ میری ہائی اسکول میں جغرافیہ پڑھانی شروع کی۔ بعد میں وہ کئی برس تک اس اسکول کی پرنسپل رہیں۔ مدر ٹریسا نے خدمت خلق

کے لئے کلکتہ کے تنگ و تاریک اور افلاس زدہ گلیوں کو منتخب کیا۔ بیمار، لاچار، مفلس اور معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے انسان مدر ٹریسا کے 'خاص لوگ' ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "غریبوں سے محبت کرنے اور انہیں جاننے کے لئے غریب ہونا ضروری ہے۔"

آہنی اعصاب اور مضبوط قوت ارادی کی مالک مدر ٹریسا نے ہزاروں مرتبہ اپنے کمزور ہاتھوں سے وہ بے گور و کفن لاشیں اُٹھائی ہیں جن کے قریب کوئی جانا بھی پسند نہیں کرتا۔ بے سہارا آفت زدوں کے کٹے پھٹے جسم، ٹوٹے ہوئے اعضاء اور خون میں تربتر بدن مدر ٹریسا کی توجہ کا مرکز بنتے رہے ہیں۔ کہیں وبا پھیلے، طوفان یا زلزلہ آئے غرض کوئی آفت ارض و سما کی ہو مدر ٹریسا بے چین ہو کر وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ گزشتہ ۲۵ برسوں کے دوران انہوں نے بے سہارا بیواؤں کے لئے ۲۵ گھر، یتیم اور بے سہارا بچوں کے لئے ۵ گھر، ۷۰۰ اسکول، ۲۵۹ کلینک اور ۵۸ جذامی سینٹر قائم کر چکی ہیں۔ بھارت کے ۳۵ شہروں میں انہوں نے کام کیا ہے اور اب تو ان کا کام سری لنکا، آسٹریلیا، لاطینی امریکہ، انگولا، آئرلینڈ، مغربی ایشیا اور وسطی ایشیا تک پھیل چکا ہے۔

جنگی ہاتھی

ایک بادشاہ "بتان" یمن پر حکومت کیا کرتا تھا۔ وہاں کے لوگ سورج کو خدا مانتے تھے۔ ایک مرتبہ کیا ہوا کہ بادشاہ کے اپنے ہمسائے ملک سے تعلقات خراب ہو گئے اور بات بڑھتے بڑھتے لڑائی جھگڑے تک جا پہنچی۔ چنانچہ بتان نے اپنی فوج تیار کی اور لڑنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اس کا لشکر حجاز سے ہو کر گزرا یہاں جو لوگ آباد تھے وہ یہودی تھے۔ کسی معمولی بات پر بادشاہ حجاز والوں سے ناراض ہو گیا اور انہیں برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا جب حجاز والوں کو بادشاہ کے خطرناک ارادوں کا علم ہوا تو وہ جمع ہو کر بادشاہ کے پاس گئے اور اس سے درخواست کی کہ ہماری سرزمین کو برباد مت کریں کیونکہ یہاں اللہ کے سب سے بڑے نبیؐ ہجرت کر کے آئیں گے۔ بتان نے یہ سنا تو پوچھا۔ لوگو! تمہارا مذہب کیا ہے۔ لوگوں نے بتایا ہم سب یہودی ہیں بادشاہ نے یہودی مذہب کے بارے میں معلوم کیا اور دلچسپی سے سنتا رہا اسے مذہب کی باتیں اچھی لگیں اور وہ یہودی ہو گیا۔ بہت عرصہ گزر گیا، کئی لڑائیاں ہوئیں اور آخر کار شاہِ حبشہ نے یمن پر حملہ کیا اور پورا علاقہ فتح کر لیا۔ اب یمن پر حبشہ کی حکومت قائم ہو گئی۔ یہاں حبشہ کے سپہ سالار کو حکمران بنا کر بھیج دیا گیا وہ مدتوں حکومت چلاتا رہا۔

اس سپہ سالار کی ایک جنرل سے کچھ مخالفت ہو گئی اور وہ مخالفت اتنی بڑھی کہ اس جنرل نے اس سپہ سالار کو قتل کر دیا اور خود حکمران بن بیٹھا۔

یہ نیا بادشاہ عیسائی تھا۔ جب حج کا زمانہ آتا تو تمام دنیا سے لوگ جمع ہو کر خانہ کعبہ جایا کرتے تھے۔ اور حج کیا کرتے تھے۔ یمن سے بھی لوگ خانہ کعبہ کا طواف کرنے جانے کے لئے تیار ہو گئے اس بادشاہ نے جب یہ دیکھا کہ سارے لوگ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں تو اسے بہت غصّہ آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی بھی وہاں نہ جائے۔ چنانچہ اس نے یمن میں ایک بہت بڑا اور عالیشان قسم کا کلیسا بنوایا اور تمام یمن والوں کو حکم دیا کہ وہ مکہ نہ جایا کریں بلکہ اس خوبصورت کلیسے کا طواف کیا کریں۔ اور یہاں حج کریں مکہ والوں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں بہت غصّہ آیا۔ خود یمن والوں نے بادشاہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور حج کے لئے خانہ کعبہ جانے کا فیصلہ کیا۔ اب تو بادشاہ کو بہت ہی غصّہ آیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیونکہ اس کا کلیسا بالکل ویران پڑا رہتا تھا اور لوگ خانہ کعبہ

چلے جاتے تھے۔ بادشاہ نے سوچا اس کا حل یہ ہے کہ خانہ کعبہ تڑوا دیا جائے تاکہ لوگ مجبوراً کلیسا میں حج کرنے آنے لگیں۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ بہت بڑا لشکر بنایا جائے اور کعبہ پر چڑھائی کی جائے۔ کئی ہفتے تیاری کرنے کے بعد بادشاہ نے بہت سے ہاتھی جمع کئے اور ان پر اپنی فوج لے کر مکہ کی طرف چل پڑا۔ بادشاہ خود سب سے آگے ایک ہاتھی پر سوار تھا۔ بڑا بھاری لشکر خانہ کعبہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں جس بستی والے کو خبر ہوتی کہ یمن کا بادشاہ توڑ پھوڑ کرنے آرہا ہے تو لوگ بستیاں خالی کر کے پہاڑوں میں چھپ جاتے۔

جب یہ لشکر مکہ میں داخل ہوا تو اس نے ہر طرف تباہی مچا دی، ہاتھیوں نے لوگوں کے گھر برباد کر دیئے لشکر والوں نے کعبے کے متولّی کے اونٹ چوری کر لیئے۔

غرض ہر طرف افراتفری کا عالم تھا مکہ والے ڈر کے مارے پہاڑ پر جا بیٹھے اور کعبے کے قریب کوئی بھی نہیں رہا۔ بادشاہ نے جب یہ دیکھا کہ کعبہ خالی پڑا ہے تو بہت خوش ہوا۔ کہ اب ہاتھیوں کی مدد سے خانہ کعبہ گرا دے گا۔ لیکن جب ہاتھی خانہ کعبہ کے قریب پہنچے تو انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے ہاتھیوں کو خوب مارا پیٹا لیکن بجائے آگے بڑھنے کے ہاتھیوں نے وہیں گھٹنے ٹیک دیئے اور سجدے کرنے لگے۔ بادشاہ نے اپنے ہاتھی کو ایڑھ لگا کر آگے بڑھایا۔ ابھی بادشاہ کعبہ کی طرف بڑھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ آسمان پر بہت سے چڑیاں جیسے چھوٹے چھوٹے پرندے اُڑتے ہوئے آئے ان پرندوں کی چونچ میں باریک کنکر تھے۔ وہ کنکر برسانے لگے وہ چھوٹا سا کنکر جس ہاتھی پر گرتا وہ اس کے جسم سے آر پار ہو جاتا تھا۔ تمام ہاتھیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔

لشکر والے ہاتھیوں سے گھبرا کر ادھر اُدھر بھاگنے لگے جو بھی گرتا ہاتھی اسے کچل دیتے۔ کئی گھنٹے تک چھوٹے چھوٹے پرندے پتھر برساتے رہے یہاں تک کہ تمام ہاتھی وہیں زخمی ہو کر گر گئے اور ہلاک ہو گئے۔ تمام فوج اور فوج کا بادشاہ سب مر گئے۔ جب یہ تمام لوگ مر گئے تو ننھے ننھے پرندے اُڑ گئے۔ لوگ پہاڑوں سے اُتر کر دیکھنے آئے تو کیا دیکھا تمام ہاتھی اور انسان بالکل تباہ ہو کر ایسے ہو گئے جیسے چبایا ہوا بھوسہ ہو۔

جو بادشاہ اپنی طاقت کے غرور میں خانہ کعبہ کو تباہ کرنے آیا تھا وہ ابرہہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں کو حکم دیا کہ اس سرکش بادشاہ سے مقابلہ کریں۔ چنانچہ ابابیلوں نے چند گھنٹوں میں اَبرہہ کے لشکر کو پامال کر دیا اور اللہ کا گھر خانہ کعبہ سلامت رہا۔ آج بھی دنیا بھر کے مسلمان ۸ ذی الحج کو کعبہ کا طواف کرنے جاتے ہیں اور حج کرتے ہیں۔

میرزا ادیب

خزانہ

سردیوں کے دن تھے دسمبر کا پہلا ہفتہ بیت گیا تھا اور دوسرے ہفتے کا آغاز ہوچکا تھا۔
شام کا وقت تھا۔ دو شخص اُس ویران مقام سے گزر رہے تھے جو دو شہروں کے درمیان واقع تھا۔ جس شہر سے یہ آئے تھے وہ پُرانا شہر کہلاتا تھا اور جدھر جا رہے تھے اسے لوگ نیا شہر کہتے تھے،

ان دو اشخاص میں سے ایک کا نام عامر تھا اور دوسرے کا فیّاض تھا۔ دونوں دکان دار تھے اور مہینے میں ایک بار کچھ نئی چیزوں کی خریداری کے لئے نئے شہر جاتے تھے۔ رات ایک سرائے میں بسر کرتے تھے۔ یہ سرائے نئے شہر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ جن لوگوں کا ان دو شہروں کے درمیان آنا جانا رہتا تھا وہ رات عام طور پر اسی سرائے میں گزارتے تھے۔ عامر اور فیّاض دونوں تنومند تھے مگر سارا دن دکانوں پر کام کرنے کی وجہ سے تھک گئے تھے۔ اس لئے ایک گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ستانے لگے۔

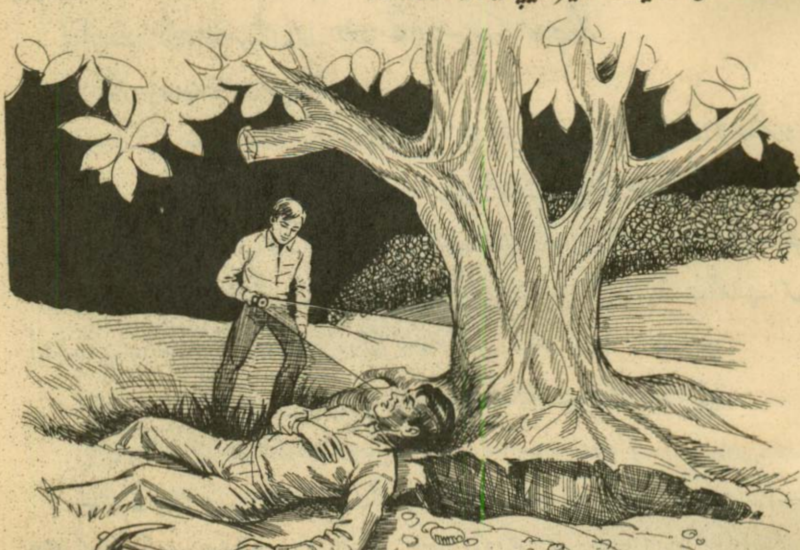

آدمی بُری طرح سے تھک چکا ہو تو فوراً سو جاتا ہے۔ یہی حال فیاّض کا ہوا۔ گھاس پر لیٹتے ہی سوگیا۔
نیند میں اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا ساتھی کسی سے باتیں کر رہا ہے۔ ابھی نیند اس کی آنکھوں میں تھی کہ وہ بیدار ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس وقت اُس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی اس کے قریب سے گزر کر درختوں کی ایک قطار کے پیچھے غائب ہو رہا ہے۔

"یہ بوڑھا کون ہے اور اس نے عامر سے کیا کہا ہے۔" فیاض کے ذہن میں خیال آیا اور وہ عامر سے بولا۔

"عامر! یہ بوڑھا تم سے باتیں کر رہا تھا"؟

"نہیں تو۔ ادھر آیا ضرور تھا"

عامر کے لہجے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بات چھُپا رہا ہے۔

"تم سے کچھ نہیں کہا اس نے؟"

"بالکل نہیں"۔

دونوں پُرانے دوست تھے اور ایک دوسرے پر اعتماد کرتے تھے مگر اس تمام عامر اپنے دوست پر اعتماد نہیں کر رہا تھا۔

فیاّض نے اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دونوں اٹھے اور سرائے کے اندر چلے گئے۔

کھانا کھا کر اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔

عامر بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ فیاّض کو یقین ہو چکا تھا کہ اُس کا ساتھی کوئی خاص کارروائی کرنے والا ہے مگر وہ آنکھیں بند کئے اس طرح لیٹا رہا جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں نیند اترتی جا رہی تھی مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے بیتاب تھا کہ آخر عامر کرنا کیا چاہتا ہے اور وہ کونسا ایسا راز ہے جو وہ اس سے چھُپا رہا ہے۔

رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ رات آدھی بیتی ہو گی کہ فیاّض نے دیکھا، عامر اپنی چار پائی سے اٹھا ہے۔ اس کی طرف آیا ہے۔ جھک کر اُسے دیکھا ہے اور یہ دیکھ کر کہ وہ سو رہا ہے، دروازے کی طرف جا رہا ہے۔ دھیرے سے دروازہ کھولتا ہے۔ ایک بار پلٹ کر فیاّض پر نگاہ ڈالتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔

"یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ آدھی رات کو یہ جا کہاں رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے"؟

فیاّض کے دل میں ایک کشمکش سی جاری تھی، جی تو اس کا چاہتا تھا کہ فوراً اسے آواز دے دے اور اس سے پوچھے یہ کیا حرکت کر رہے ہو تم۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ دیکھوں تو ذرا یہ کرتا کیا ہے۔ ضرور کوئی خاص کارروائی کرنا چاہتا ہے۔ اُس بوڑھے نے اسے کوئی راز کی بات بتائی ہو گی۔

وہ اپنی چارپائی پر لیٹا رہا مگر زیادہ دیر تک لیٹے رہنا اس کے لئے مشکل تھا۔
بستر سے اُٹھ کر اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔
اس نے اپنے تھیلے میں سے ٹارچ نکالی، چند منٹ کمرے میں ٹہلتا رہا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں آرہے تھے، سوچتا تھا اس بوڑھے آدمی نے اسے نئے شہر کے کسی خاص دکان دار کا پتا بتا یا ہوگا جہاں سے اعلٰی درجے کا سامان مل سکتا ہے اور عامر رات کے اندھیرے میں چلا گیا ہے تاکہ صبح جیسے ہی اس کی دکان کھلے وہ ڈھیر سارا سامان خرید لے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے اسے کوئی اور بات بتادی ہو۔ لیکن وہ بات کیا ہوگی! اس کی سمجھ اسے نہیں آتی تھی۔
وہ رہ نہ سکا۔ ٹارچ جیب میں ڈالی۔ اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیاں طے کر کے نیچے آیا اور سرائے کے بڑے دروازے کی طرف جانے لگا۔
سرائے کا بڑا دروازہ عموماً کھلا رہتا تھا۔ کیونکہ بعض مسافر رات ہی کے وقت اپنے کمرے چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ سرائے کے اندر ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سرائے میں کام کرنے والے اور سرائے کے کمروں میں رات بسر کرنے والے سب سو رہے تھے۔ فیاّض دروازے سے نکل کر باہر آگیا۔
فضاؤں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ فضا، ابر آلود تھی مگر بارش نہیں ہوئی تھی،
"میں اسے ڈھونڈوں کہاں ؟" فیاّض نے خود سے سوال کیا۔ اس نے جیب سے ٹارچ نکالی مدّہم روشنی میں وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔
وہ چلتا گیا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے قریب ہی کوئی آدم زاد موجود ہے۔
روشنی میں اس نے اس درخت کو پہچان لیا جس کے نیچے شام کے وقت دونوں نے آرام کیا تھا اور یہیں وہ بوڑھا عامر سے کچھ کہہ کر چلا گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ اور آگے بڑھا۔
"ہیں یہ کیا"؟
اس نے دیکھا کہ ایک شخص سخت درد سے بے قرار ہو کر ہائے ہائے کر رہا ہے۔
اس نے سانس روک کر دیکھا۔
وہ شخص عامر تھا۔
"یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے، عامر کو ہوا کیا ہے۔؟"
عامر ایک گڑھے کے کنارے پڑا تھا۔
"عامر!" فیاّض نے جھک کر اس کے چہرے کو دیکھا جو سیاہ پڑتا جا رہا تھا۔

"فیاض! سانپ ۔ "

عامر فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ فیاض نے سمجھ لیا کہ وہ کہنا چاہتا ہے کہ سانپ نے مجھے کاٹ کھایا ہے۔

" خدا کے لئے کچھ کرو فیاض!" عامر نے بڑی مشکل سے کہا۔

فیاض کو فوراً خیال آیا اگر بہت جلدی اس کا علاج نہ ہوا تو یہ مر جائے گا۔ اس نے ٹارچ منہ میں تھامی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے دوست کو اٹھا کر اپنی پیٹھ پر لادا اور نئے شہر کی طرف چلنے لگا۔!

قدم اٹھانا اس کے لئے مشکل تھا مگر دوست کی جان بچانا بہرحال وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔

بوجھ اتنا بھاری تھا کہ اس کی کمر دوہری ہوئی جاتی تھی۔ سانس رک رک جاتا تھا لیکن اس کے قدم نہیں رکتے تھے۔

نئے شہر میں بار بار آنے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ ہسپتال کہاں ہے۔ ہسپتال شہر کے کنارے پر تھا۔

خوش قسمتی سے ڈیوٹی پر ڈاکٹر جاگ رہا تھا۔ اس نے عامر کی حالت دیکھی۔ اسے فوراً آپریشن روم میں لے آیا۔ اپنے ساتھی ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا کہ وہ فوراً آجائے۔

" اب مریض خطرے سے باہر ہے۔ چند منٹ گزر جاتے تو مر گیا ہوتا۔"

ڈاکٹر کے منہ سے یہ الفاظ سن کر فیاض کی جان میں جان آئی۔

صبح تک ڈاکٹروں کے علاج سے عامر کی حالت کافی بہتر ہو چکی تھی۔ اور وہ گفتگو کر سکتا تھا۔

فیاض نے ٹیکسی کرائے پر لی۔ ڈاکٹر سے مزید علاج کے لئے نسخہ لکھوایا اور ٹیکسی میں اپنے دوست کو لے کر اپنے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں فیاض نے عامر سے کچھ کہنا سننا مناسب نہ سمجھا۔

" عامر کچھ بتانا ضروری سمجھے گا تو خود ہی بتا دے گا۔ میں کیوں پوچھوں اس سے۔؟"

گھر پہنچ کر فیاض نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس کے دوست کی زندگی بچ گئی

اپنے گھر جانے کے لئے اس نے عامر سے اجازت چاہی۔

" فیاض!"

" کہو عامر!"

" تم نے جو احسان کیا ہے وہ میں آخری سانس تک نہیں بھول سکتا"

" یہ میرا فرض تھا جو میں نے ادا کیا ہے عامر! تم پر میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ میری ایسی حالت ہوتی تو تم بھی یہی کام کرتے جو میں نے کیا ہے۔

ہم دوست ہیں کوئی غیر تو نہیں ہیں۔"

عامر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"فیّاض! لالچ نے میری آنکھوں پر پٹّی باندھ دی تھی۔ میں اندھا ہو گیا تھا۔ اُس بدبخت بوڑھے نے مجھ سے کہا تھا کہ اسی پیڑ کے نیچے خزانہ دفن ہے۔ موقع پاکر زمین کھودنا۔ بہت بڑا خزانہ تمہارے ہاتھ آجائے گا۔ میں نے تم سے اس کا ذکر نہ کیا اور آدھی رات کو زمین کھودی۔ اور سانپ نے کاٹ کھایا، تم رحمت کے فرشتے بن کر آگئے۔ میری جان بچ گئی۔ ورنہ اب تک میرے بچے یتیم ہو گئے تھے۔"

عامر خاموش ہو گیا۔

"یہ اللہ کی بڑی مہربانی ہے ہمارا اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔"

"فیّاض!" عامر بولا۔

"کہو"۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے خزانہ نہیں ملا؟"

فیّاض حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہی حالت عامر کی بیوی اور بچوں کی تھی۔ سب اسے بڑی حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔

"مجھے خزانہ مل گیا۔"

فیّاض حیران پریشان اسے دیکھتا رہا۔

"یہ ہے میرا دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ، ایک سچّا اور ہمدرد دوست دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہوتا ہے۔"

عامر نے فیّاض کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

آپ مانیں نہ مانیں!

دو آدمی باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ایک نے دوسرے سے کہا "میں اپنے دانتوں سے اپنی آنکھ کاٹ سکتا ہوں۔" دوسرے نے کہا "یہ ناممکن ہے۔" پہلے نے کہا "لگاؤ شرط" چنانچہ شرط لگائی گئی۔ پہلے نے اپنے نقلی دانت نکالے اور اپنی آنکھ کاٹ لی۔ دوسرا صدمے سے بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے پہلے سے کہا "یہ کوئی بات نہیں ہے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ تم اپنی آنکھ دانتوں سے اس طرح کاٹ کر دانت منہ میں رہیں"۔ اس عرصہ میں وہاں کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ پہلے نے یہ شرط بھی مان لی اور پتھر کی آنکھ نکال کر اپنے دانتوں سے کاٹ لی۔ دوسرا پھر بے ہوش ہو گیا اور تادمِ تحریر ہوش میں نہیں آیا۔

تصویری کہانی

پنٹو

میاں کے آنسو

جب ماسٹر صاحب نے علان کیا کہ پوری کلاس تفریحی دورے پر جائے گی تو سارے بچّے مارے خوشی کے ناچ اٹھے۔ اس روز موسم اچھا نہیں تھا اور آسمان کا رنگ بتا رہا تھا کہ زبردست آندھی آنے والی ہے لیکن تفریح پر جانے کا اشتیاق ایسا تھا کہ سب اپنے اپنے سوٹ کیس سنبھالے ریلوے اسٹیشن پہ جا پہنچے۔ انہیں ۱۴۸ نمبر کی الیکٹرک ٹرین میں جانا تھا۔ ٹرین کے روانہ ہونے میں ابھی دیر تھی اس لئے لڑکے انتظار کرنے لگے اور کچھ حسبِ معمول شرارتوں میں مصروف ہوگئے۔ حالانکہ ماسٹر صاحب نے کلاس ہی میں بتا دیا تھا کہ جو بچّہ شرارت کرے گا اسے اسٹیشن پہ ہی چھوڑ دیا جائے گا۔ پنٹو میاں نے جو شرارت کرنے میں سب سے آگے تھے، چپکے سے عزیز کا بستہ اڑا لیا۔ اور اُسے چھپانے کے لئے دوسری جگہ لے جانے لگے۔ اسی دوران بستے سے ایک ڈبہ گر گیا۔ انہوں نے ڈبہ اٹھا کر دیکھا تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل اُٹھیں کیونکہ یہ خشک دودھ کا ڈبہ تھا۔ خشک دودھ تو ان کی کمزوری تھا۔ انہوں نے حسبِ عادت ایک لمحے کے لئے تھوڑی کے نیچے ہاتھ جما کر کچھ سوچا اور پھر بستہ وہیں پھینک کر ایک کونے میں چلے گئے۔ ڈبے سے ڈھکّن ہٹا کر انہوں نے تیزی سے ڈبہ منہ میں انڈیل لیا۔ اب جو ڈبے میں موجود خشک پوڈر ان کے منہ میں گیا تو وہ لگے واویلا کرنے۔ کیونکہ ڈبے میں خشک دودھ تھا ہی کب۔ وہ تو گرمی دانوں کا پوڈر تھا۔ ان کی چیخ وپکار سن کر دوسرے لڑکے اور ماسٹر صاحب بھاگے بھاگے آئے تو دیکھا کہ ایک ہاتھ میں کیپ اور دوسرے میں دودھ کا ڈبہ اٹھائے پنٹو میاں دھاڑیں مار رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر لڑکوں کا تو ہنستے ہنستے بُرا حال ہوگیا۔ البتہ ماسٹر صاحب سخت طیش میں آگئے۔ انہوں نے بطور سزا پنٹو میاں کو سفر میں ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔

ٹرین سارے بچّوں کو لے کر چل پڑی اور پنٹو میاں اسٹیشن پہ اُداسی سے آنکھوں میں آنسو لئے کھڑے ہاتھ ہلاتے رہ گئے۔ لیکن اس عالم میں بھی ان کی شرارت دیکھیئے کہ ان کے ہاتھوں میں جو سرخ رنگ کی کیپ تھی وہ بھی گڈّو کی تھی جو انہوں نے اُس سے زبردستی لے کر اپنے سر پہ رکھ لی تھی اور اب وہ گڈّو کو کیپ لہرا لہرا کر دکھا رہے تھے۔ اُدھر ڈبّے میں گڈّو میاں "میری کیپ، میری کیپ" کہہ کر ہچکیاں بھر رہے تھے۔ اُف شرارتی پنٹو!!

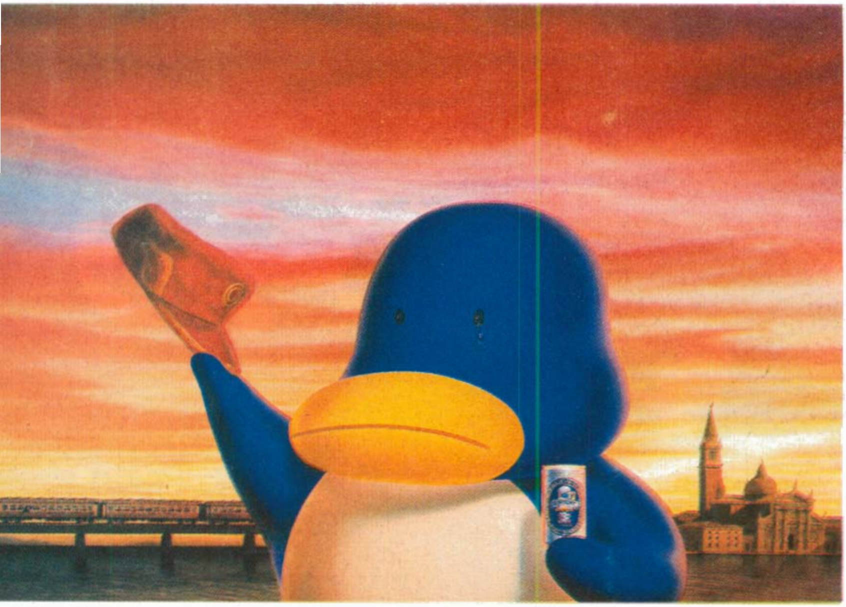

84

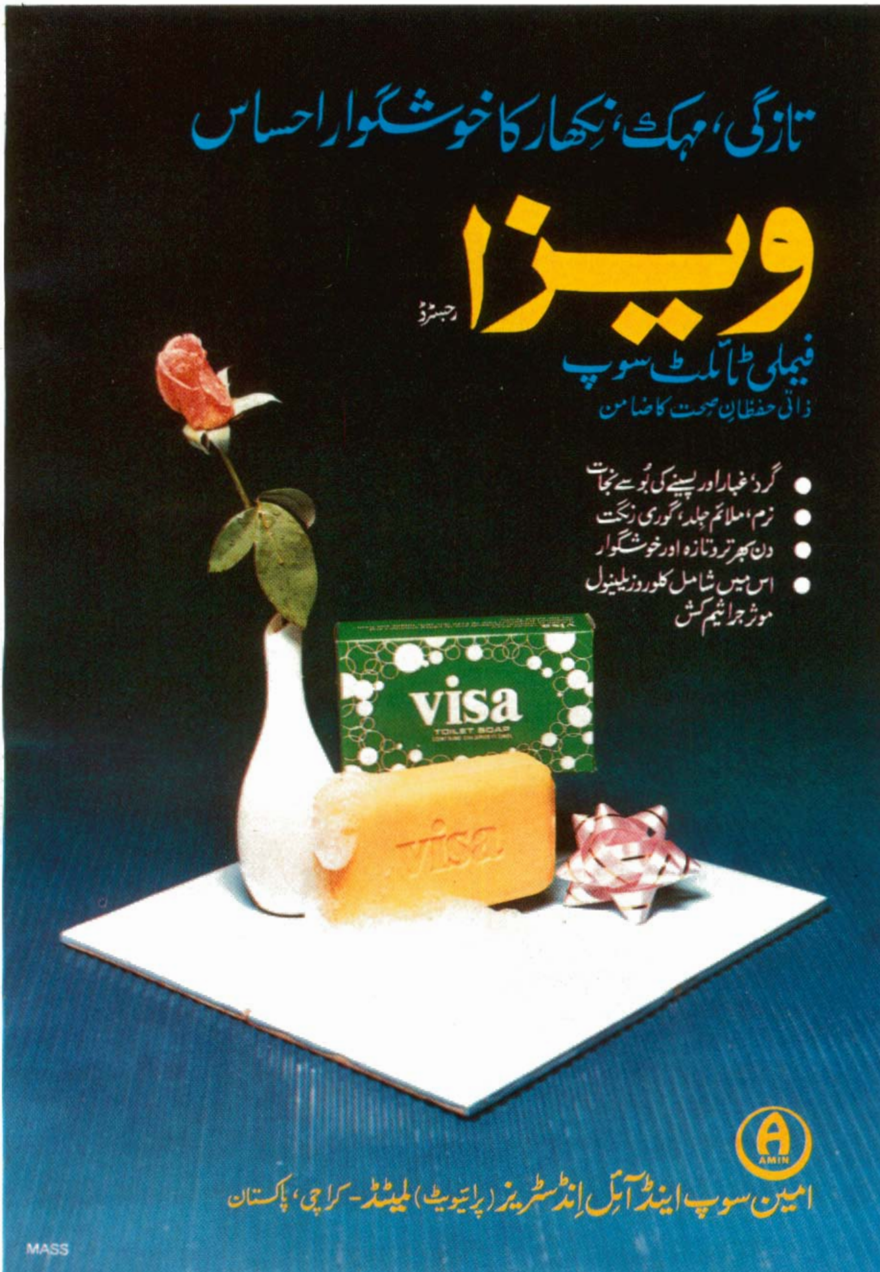

تازگی، مہک، نِکھار کا خوشگوار احساس
ویزا
رجسٹرڈ
فیملی ٹائلٹ سوپ
ذاتی حفظانِ صحت کا ضامن
گرد، غبار اور پسینے کی بُو سے نجات
نرم، ملائم جلد، گوری رنگت
دن بھر تروتازہ اور خوشگوار
اس میں شامل کلوروزیلینول موثر جراثیم کش
visa
TOILET SOAP
visa
AMIN
امین سوپ اینڈ آئل اِنڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ - کراچی، پاکستان
MASS

نثار احمد زبیری

ہارا ہوا کپتان

وہ دونوں سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ آج ان کی ٹیم پھر ہار گئی تھی۔۔۔ اور اس وقت جب جیت کا امکان بہت روشن ہو چلا تھا۔ ایک وکٹ باقی تھا اور صرف تین رن بنانے تھے، لیکن بڑی مشکل سے ایک رَن بنا اور ان کا دسواں وکٹ گر گیا۔ روفی نے جاوید میانداد کے مشہور چھکے کی طرح زوردار شارٹ لگانا چاہا تھا لیکن وہ مڈ آن میں کیچ آؤٹ ہو گیا۔ اس لمحے رستم نے جھنجھلا کر بیٹ پٹخ دیا دو رَن۔۔۔ صرف دو رن بنا لیے جاتے تو وہ میچ جیت جاتے، لیکن روفی کی لاپروائی نے اس تمنا کا جنازہ نکال دیا۔ رستم کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ روفی سے گتھم گتھا ہو جائے اور اُسے اُٹھا کر پٹخ دے۔

وہ دونوں مخالف ٹیم کے دوستوں کی تالیوں اور چیخ پکار کی گونج میں میدان سے باہر آ گئے۔ انھوں نے

جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹتا اور ینگ اسٹار کرکٹ کلب کے کھلاڑی ایک اور شکست کا داغ ماتھے پر سجائے وہاں سے تقریباً بھاگ نکلے۔ دو ماہ کے دوران یہ اُن کی چھٹی شکست تھی۔

رستم نے... جس کا اصل نام راؤ عبدالستار تھا، بڑی محنت سے یہ کلب بنایا تھا اور اس کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کر کے ایک گراؤنڈ حاصل کیا تھا۔ اس نے آس پاس رہنے والے لڑکوں میں سے اچھے کھلاڑی جمع کر کے ایک اچھی ٹیم بنائی۔ شروع میں وہ لوگ میچ پر میچ جیتتے چلے گئے، لیکن ان کے دو اچھے کھلاڑی محلّے سے شفٹ کر گئے۔ ان میں ایک تو ارشد تھا جو بڑا ہی پھرتیلا وکٹ کیپر تھا۔ ارشد کا ریکارڈ تھا کہ اُس سے مشکل سے کیچ چھوٹ نہیں سکتا تھا۔ دوسرا راحیل تھا، جو نہایت کامیاب میڈیم پیسر تھا۔ جب ایک طرف سے رستم اور دوسری طرف سے راحیل گیند پھینکتے تو عموماً چار چھ اووروں میں مخالف ٹیم کے تین چار کھلاڑی پکّے آم کی طرح ٹپک ہی پڑتے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا کہ وہ مخالف ٹیم کی بیٹنگ کی کمر شروع کے چھ اووروں میں توڑنے میں ناکام رہے ہوں۔

لیکن وقت بدلنے میں دیر کہاں لگتی ہے پہلے تو ارشد کے ابّو کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا اور راحیل کا نیا گھر گلشنِ اقبال میں بن گیا جس پر وہ فیڈرل ایریا کو خیرباد کہہ گیا۔ رستم نے اُن کی جگہ دوسرے کھلاڑیوں سے پُر کرنے کی بہت کوشش کی لیکن قابلِ اعتماد کامیابی نہ ہو سکی جس کے نتیجے میں شکستوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس کے بعد سے یہ پہلا میچ تھا جس میں وہ فتح ______ کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے، لیکن بُرا ہو رونی کی جلد بازی کا کہ جیتنے کی تمنا ___ دل میں ہی رہ گئی۔ رستم کو زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ جس گیند پر وہ آؤٹ ہوا وہ کوئی خاص گیند بھی نہ تھا۔ ایک سیدھی سادی گیند تھی جس پر ہلکا سا ہٹ لگا کر رونی بڑی آسانی کے ساتھ ایک رَن بنا سکتا تھا اور پھر رستم بہ آسانی دو رَن بنا سکتا تھا کیونکہ وہ اوپن کرنے کے لیے آنے کے بعد اب تک ڈٹا ہوا تھا اور اُس نے بڑے اطمینان سے چھیالیس رنز بنائے تھے۔

گھر آکر رستم نے بڑی اُداسی سے کپڑے تبدیل کیے اور بغیر منہ ہاتھ دھوئے چپ چاپ بستر پر گر پڑا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ خاموش پڑا رہا۔ جب باجی چائے لے کر اس کے پاس آئیں تو اُسے وہ دیکھ کر اس طرح کھلکھلا کر ہنسیں کہ پیالی گرتے گرتے بچی۔

"رستم کے بچّے... آج تم پھر ہار کر آئے ہو..." وہ مزے سے بولیں، لیکن اس بار رستم کچھ زیادہ ہی اُداس تھا وہ باجی سے کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ باجی اُس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ چھوٹے بھائی کو اتنا خاموش دیکھا تو مذاق کا موڈ رفو چکّر ہو گیا۔ انھوں نے بے اختیار بھائی کو گلے سے لگا لیا۔ لیکن رستم کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا۔ بے چاری باجی نے بہت تسلّیاں دیں۔

کہنے لگیں ۔۔۔" آدمی کا کام محنت کرنا۔۔۔ کوشش کرنا ہوتا ہے، کھیل میں ہار جیت تو ہوتی ہی ہے، ہارنے کا حوصلہ بڑی قیمتی چیز ہوتی ہے، یہ حوصلہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔"

رستم خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا اور پھر خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اگلے جمعہ کو رستم میچ رکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن دوسرے لڑکے نہیں مانے۔ اس پر رستم نے ایک بہت ہی کمزور ٹیم سے میچ رکھا۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا' اس ٹیم کے خلاف کامیابی آسان ہوگی۔

نہ جانے جی میں کیا آئی کہ اُس نے میچ والے دن صبح سب کھلاڑیوں کو پہلے اپنے گھر بلایا اور ایک چھوٹی سی تقریر کرنے کی کوشش کی، لیکن مشکل یہ تھی کہ اُسے تقریر کرنی آتی نہیں تھی۔ وہ اٹک اٹک کر بولا۔۔۔" دیکھو بھئی ۔۔ کھیلنا ہے تو قاعدے سے کھیلو، یہ کیا کہ دھڑا دھڑ ہٹ پر ہٹ لگانے کی کوشش کرو اور دھڑن تختہ کرا کے واپس چلے آؤ۔ نسیم تم بہت آہستہ دوڑتے ہو۔ کتنی بار رَن آؤٹ ہوئے ہو یار، اور سمیع تم، یار تم تو کیچ گرانے کے ماہر ہو، پھر ضِد کرتے ہو سلپ میں فیلڈنگ کرنے کی، بھائی کچھ کلب کی عزّت کا خیال دیال کر لیا کرو۔"

اُس نے ہر کھلاڑی کے عیب گنائے۔ اُس کی ٹوٹی پھوٹی تقریر سُن کر لڑکے طرح طرح کے مُنہ بناتے رہے۔

جب وہ دیو قامت اخلاق حسین کو باتیں سُنا رہا تھا، تو بحث بھی شروع ہوگئی۔ اخلاق بھنّا کر بولا۔

" اور تم ۔۔۔ تم جو پچھلے سے پچھلے جمعہ چار رَن بنا کر کلین بولڈ ہوگئے تھے ۔۔۔ اس پر بھی تو کچھ فرماؤ ۔۔۔؟"

رستم بولا ۔۔۔" میں کوئی جیف بائیکاٹ تو نہیں ۔۔۔ میں بھی کبھی آؤٹ ہو سکتا ہوں، لیکن میں نے زیادہ تر میچوں میں رَن بنائے ہیں۔" لیکن بات نہ بنی، خوب تُو تُو مَیں مَیں ہوئی، کچھ لڑکے رُستم کی طرف تھے کچھ اخلاق کی طرف۔ بڑی مشکل سے باجی نے آکر بیچ بچاؤ کرایا۔ اُن کی کوشش سے صُلح ہوگئی ورنہ اُس دن تو یوں لگ رہا تھا جیسے کلب ٹوٹ جائے گا۔۔۔ اور آج کا میچ کھیلنے کے لیے وہ گلشن اقبال جائیں گے ہی نہیں۔

بحث کی وجہ سے رستم کا موڈ آف ہوگیا۔ کہاں تو وہ سب کو سمجھا رہا تھا۔ کہاں مُنہ پُھلا کر چُپ ہو رہا۔ باجی کی بڑی کوشش سے وہ کِٹ اُٹھا کر میچ کھیلنے کے لیے چلے، لیکن سب کے موڈ تھوڑے تھوڑے آف تھے۔ کئی لڑکوں کا خیال تھا کہ رستم نے مختبِ اعلیٰ بن کر اچھا نہیں کیا۔

اُس دن کا میچ سب میچوں سے بُرا رہا۔ ینگ اسٹار کلب کی پوری ٹیم صرف چھپّن رنز پر اُڑ گئی۔ رستم نے بڑی مشکل سے بارہ رن بنائے اور بولر کو آسان سا کیچ دے کر واپس آگیا۔ مخالف ٹیم بالکل کمزور تھی۔ پھر بھی اُس نے میچ آٹھ وکٹوں سے جیت لیا۔ کیونکہ رستم سے بولنگ بھی ٹھیک سے نہ ہو سکی۔ اُس نے آٹھ اوور میں ۔۔۔ گیارہ رن تو وائیڈ گیند پھینک کر دے دیے۔

گھر پہنچ کر رستم نے کمرہ بند کر لیا اور باقاعدہ رو پڑا۔ باجی نے بار بار دروازہ باہر سے پیٹا لیکن اس نے کواڑ نہ کھولے۔ بالآخر انھوں نے تنگ آکر ٹیم کے ایک کھلاڑی کو فون کرکے احوال پوچھا تو معلوم ہوا کہ بہت ہی بُری... بلکہ شرمناک شکست ہوئی ہے۔ اس نے بتایا کہ رستم سے نہ بیٹنگ ہوئی نہ بولنگ۔

باجی کو اپنے بھائی سے بہت محبّت تھی وہ جانتی تھیں کہ رستم خود بہت اچھا کھلاڑی ہے۔ ذمّہ داری سے بیٹنگ کرتا ہے اور اتنی تیز اور اتنی سیدھی گیند پھینکتا ہے کہ وکٹ پر کھلاڑی کا ٹکنا مشکل ہوتا ہے۔ انھیں حیرت تھی کہ رستم کو کیا ہوگیا۔

باجی نے نفسیات میں ایم اے کیا تھا، انھیں معلوم تھا کہ ٹیم کا مورال خراب ہوگیا ہے اس لیے سب کھلاڑیوں پر مایوسی طاری ہے ورنہ وہ اچھا خاصا کھیل سکتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ینگ اسٹار کرکٹ کلب کو ایک جیت کی اشد ضرورت ہے۔ فتح کی آرزو ان سب کے سر پر سوار ہے۔ بار بار کی ہار نے انھیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

باجی ان کے زخم کا مرہم تلاش کرنے میں جُت گئیں۔ کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے گہری سوچ میں ڈوب جاتیں لیکن سوچ بچار کے باوجود وہ کوئی اچھی ترکیب نہ نکال سکیں۔ کبھی ان کے جی میں آتی کہ سب کھلاڑیوں کو جمع کرکے ان کے سامنے ایک تقریر کریں، کبھی سوچتیں کہ ان سب کے بازوؤں پر ایک تعویز باندھ دیں۔ جس سے اُن کا حوصلہ بڑھ جائے اور تعویز کے کاغذ پر لکھ دیں "یا اللہ... مدد"

انھوں نے کئی بار رستم سے بات چھیڑی تاکہ اُسے سہارا ملے، لیکن رستم بھی بہت مایوس ہو چلا تھا۔ وہ سیدھے منہ بات ہی نہ کرتا تھا۔

"ارے چھوڑیے ثمینہ باجی... سب کم بخت بالکل اُلّو ہیں، بیٹ پکڑنا نہیں آتا، چلے ہیں کرکٹ کھیلنے، باپ نے ماری مینڈکیں، بیٹے تیرانداز۔"

باجی اُسے سمجھانا چاہتیں تو وہ اُٹھ کر چل دیتا۔

اُس دن رستم، باجی، چھوٹو فرمان اور امّی بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی چھوٹو نے فون اُٹھایا۔ حیدرآباد سے باغی چچا بول رہے تھے۔ چھوٹو اُن سے اوٹ پٹانگ باتیں کرکے قہقہے لگانے لگا۔ بڑی مشکل سے باجی نے اُس سے رسیور چھینا۔ اُن کے ساتھ ہی رستم اور امّی بھی لائن لگائے کھڑے تھے۔ باغی چچا سے سبھی باتیں کرنا چاہتے تھے، لیکن ثمینہ نے اُن سے دو تین باتیں کرکے فون کھٹ سے بند کر دیا۔ شاید زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں تھی۔ باغی چچا اور اُن کا منجھلا بیٹا پرویز اگلی صبح دس بارہ دن کے لیے

کراچی آرہے تھے۔

باغی چچا... بڑے مزے دار قسم کے چٹپٹے والے چچا تھے۔ نام تو اُن کا راؤ عبدالعلیم تھا، لیکن شاعری میں باغی تخلّص کرتے تھے اس لیے چھوٹے بڑے سبھی انھیں باغی چچا کہتے تھے۔ مزاحیہ شاعری کرتے تھے۔ شعر سُنا سُنا کر ہنساتے تھے اور ہنساتے ہنساتے پاگل کر دیتے تھے۔ سب بچّوں سے اُن کی گہری دوستی تھی۔ اُن کی آمد پر گھر کا ماحول بدل جاتا۔ سازشیں کر کے کبھی امّی سے مٹھائی کبھی ابّو سے آئس کریم کھائی جاتی۔ رات گئے تک وہ ہنگامہ مچتا کہ کسی کو ٹی وی تک کھولنے کا خیال نہ آتا۔

جمعہ قریب آرہا تھا... لیکن اس بار ینگ اسٹار نے کسی ٹیم سے میچ نہیں رکھا تھا۔ وہ آس پاس کی سب ٹیموں سے ہار چکے تھے۔

بدھ کے دن باجی نے رستم سے پوچھا... "چوہے کرکٹر... اس بار کسی سے ہے تمہارا میچ... بل میں سے نکلو گے یا نہیں؟"

رستم نے کندھے اُچکا کر کہا... "باجی چھوڑیے بھی، ہماری ٹیم سوچکی ہے۔ اب کیسا میچ ویچ"...

باغی چچا قریب ہی بیٹھے تھے۔ اخبار سے نظریں ہٹا کر انھوں نے چشمہ اُتارا اور بولے...!

"ارے بھتیجے... تم اور بلا میچ جمعہ گزار دو... یہ میں کیا سُن رہا ہوں"

"ہماری ٹیم ختم ہو چکی ہے باغی چچا..." رستم بیزاری سے بولا۔

"لیکن کیوں بھئی... میں بھی تو سنوں..."

"سات میچ لگاتار ہار کے بیٹھے ہیں..." باجی بڑے طنز سے بولیں "جیتنے کی حسرت جو پوری نہیں ہوئی"

"ارے تو اس میں کیا رکھا ہے... ہم جتائے دیتے ہیں میچ... پوچھو کیسے" باغی چچا نے کہا۔

"جی کیسے...؟" رستم نے کچھ دلچسپی ظاہر کی۔

"اماں ہمارے پرویز کو کھلا لو اپنی طرف سے... اس نے وہاں حیدرآباد میں اپنی دھاک بٹھادی ہے"

"پرویز...؟" رستم ایکدم بولا "کب سے کرکٹ کھیلنے لگا... یہ تو ہاکی"...

"بھئی ابھی دو مہینے سے، باغی چچا بولے "ارے ایسی بال پھینکتا ہے کہ بس غضب... اِن سوئنگر، آؤٹ سوئنگر، لیگ کٹر، باؤنسر، باغی چچا نے ایسی اداکاری سے کہا کہ سب ہنس پڑے اور پرویز سینہ پھُلا کر اِترانے لگا۔

"لیکن پرویز کو نفرت تھی کرکٹ سے"

"ارے بھئی... ہم نے یہ نفرت ختم کرادی ہے" باغی چچا بولے "تم اسے ساتھ کھلا لو... کم سے کم چھ وکٹ

تو لے ہی دے گا۔"

"لیکن صرف بولنگ سے کیا ہو گا۔۔" رستم نے پوچھا۔

"اجی میری بیٹنگ بھی کچھ کم خطرناک نہیں" پرویز نے کہا "ابھی پچھلے میچ میں سٹر سٹھ رنز بنائے ہیں میں نے۔۔"

"اکیلے" رستم نے بے یقینی اور طنز کے ساتھ کہا۔

"جی بالکل اکیلے" پرویز نے برجستہ جواب دیا۔

رستم عجیب امید بھری نظروں سے پرویز کو دیکھنے لگا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پرویز ایک دم اتنا اچھا کرکٹر بن گیا ہے۔ اتنے میں پرویز نے اُسے للکارا۔

"رستم صاحب! اب تو آپ بھی میرے سامنے کوئی چیز نہیں۔"

"رہنے دو۔۔۔ رہنے دو۔۔۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں تمھیں کرکٹ کھیلتے۔۔۔ اور مجھے چیلنج۔۔۔"

"ہاں ہاں تمھیں چیلنج۔۔۔ کھلا کر دیکھ لو۔ تم سے زیادہ وکٹیں نہ لوں اور تم سے زیادہ رَن نہ بناؤں۔۔۔ تو نام پرویز نہیں۔۔"

"اچھا یہ بات ہے۔۔۔ تو چلو رہی شرط" یہ کہہ کر رستم نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"اچھا بھئی۔۔۔ تو کیا شرط رہی" باغی چچا مزے سے بولے۔

"رستم۔۔۔ ذرا احتیاط۔۔۔ کہیں مارے ہی نہ جاؤ" باجی نے توجّہ دلائی، لیکن رستم کا خون جوش مار رہا تھا۔

"آئس کریم کی شرط" رستم نے آفر دی۔

"اونہوں۔۔۔ صرف آئس کریم سے کیا ہو گا۔ آئس کریم اور رَس ملائی دونوں ہوں تو کچھ بات بنے" پرویز نے اُسے ایسے دیکھا جیسے رِنگ میں ایک باکسر دوسرے کو دیکھتا ہے۔

"چلو دونوں سہی" رستم نے شرط مان لی، لیکن ابھی پرویز کی تسلّی نہیں ہوئی وہ بولا۔

"ارے تم تو تم۔۔۔ تمھاری ٹیم میں بھی کوئی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔۔۔ سب سے جا کر کہہ دو حیدر آباد سے پرویز علی خان آگئے ہیں تمھیں میچ جتانے وہ اکڑ کر بولا۔

"اچھا اچھا۔۔۔ دیکھتے ہیں تمھیں بھی"۔ رستم یہ کہہ کر اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ باجی اور باغی چچا اُسے روکتے رہ گئے، لیکن اُس پر میچ رکھنے اور شرط جیتنے کا جنون طاری ہو چکا تھا۔۔۔!

رستم نے نہ صرف ناز ناظم آباد کلب سے میچ رکھ لیا بلکہ ٹیم کے دوسرے کھلاڑیوں کو بھی پرویز کے غرور

کی بابت بتاتے ہوئے کہہ دیا کہ "میچ ہاریں یا جیتیں... لیکن اس کے غرور کا سر نیچا ضرور کرنا ہے۔ بڑا آیا ہے۔ حیدر آباد کا دھاکڑ بن کر۔"

میچ والے دن باغی چچا نے کار نکالی۔ باجی اور چھوٹو فرمان بھی آئس کریم اور رَس ملائی چیلنج مقابلہ دیکھنے کے لیے بیتاب تھے۔

گراؤنڈ پر پہنچ کر جب ٹاس ہوگیا اور مخالف نے پہلے بیٹنگ لے لی تو پرویز... رستم کے پاس آیا اور بولا۔

"یار... میری ایک مجبوری ہے۔"

"چلو چلو... باتیں نہ بناؤ..." رستم جھلّا کر بولا "اب تم بچ نہیں سکتے۔"

"بھائی... ایک بات سُن لو۔" پرویز نے خوشامد سے کہا۔

"یہی نا کہ میری ٹانگ میں تکلیف ہے... میں بولنگ نہیں کر سکتا۔" رستم نے طنز کیا۔

"نہیں... یہ بات نہیں" پرویز سنجیدہ تھا۔

"اچھا تو پھر..."

"میں اوپن بولنگ نہیں کرتا اور بیٹنگ چھٹے نمبر پر۔" پرویز نے کہا "میں کم از کم دس اووروں کے بعد بولنگ کروں گا۔"

"لیکن کیوں...؟" رستم تنگ آتے ہوئے بولا۔

"ہمارا اسٹائل ہے یار... ہم ذرا دیر سے جوش میں آتے ہیں نا" پرویز اعتماد سے بولا۔

"چلو یہ بھی دیکھ لیں گے... مگر تم چھٹے نمبر پہ بیٹنگ کرکے کیا تیر مار لوگے۔"

دیکھ لینا... دیکھ لینا" پرویز نے مزے سے کہا۔

بات طے ہوگئی۔ رستم غصّے اور جوش میں بھرا ہوا تھا۔ اور وہی کیا، ٹیم کے دوسرے لڑکے بھی پرویز کو نیچا دکھانے کے لیے بے تاب تھے۔

میچ شروع ہوا۔ رستم نے اوپن بولنگ شروع کی اور پہلے ہی اوور میں اُس نے مخالف ٹیم کے دو کھلاڑی ڈھیر کر دیئے۔ اُس وقت تک صرف چھ رنز بنے تھے۔ دوسرے اوور میں سمیع نے اور کچکچا کر بولنگ کی اور ناظم آباد کلب کا کپتان صرف دو رَن بنا کر واپس ہوگیا۔

رستم اور سمیع کے چار چار ہی اوور ہوئے تھے کہ مخالف ٹیم کا جلوس نکل گیا۔ جب چھتیس رنز پر اُن کے سات کھلاڑی آؤٹ ہوگئے تو رستم نے پرویز کی طرف گیند بڑھائی۔

"چلو سیدھی طرح بولنگ کرو... سارے وِکٹ گر گئے تو تم کیا خاک کارنامہ دکھاؤ گے..." اس نے حکم دیا۔

"نو... ناٹ ایٹ آل" پرویز اطمینان سے بولا "معاہدے کی رُو سے ہم دس اوورز کے بعد بولنگ کریں گے۔"

رستم نے غصّے میں گیند اٹھا کر پٹخ دی اور اپنے اوپنر سے کہا کہ وہ بولنگ کرے۔

اس سے پہلے کہ دس اوورز ہوتے مخالف ٹیم صرف اٹھاون رَن بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ رستم نے صرف اٹھارہ رَن دے کر چار وکٹیں لیں۔ وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا، لیکن وہ تھوڑا سا خوف زدہ بھی تھا۔ مخالف کلب میں ایک غضب کا بولر خورشید موجود تھا۔ وِکٹ پر تھوڑی تھوڑی سی گھاس بھی موجود تھی۔ ظاہر تھا کہ اس کی بولنگ بڑی طوفان ہوگی۔ رستم نے پیڈ باندھتے باندھتے پھر پرویز کو رجھایا۔

"ڈھاکڑ صاحب آپ کی بولنگ تو رہ گئی... اب بیٹنگ کے لیے چلیئے۔"

"بالکل نہیں رستم..." پرویز بولا "میچ ہم تمھیں جتا کر دیں گے، چھٹے نمبر پر جائیں گے اور چوکے مار مار کر خورشید دُر شید سب کی بولنگ کا بھُرکس نکال دیں گے۔"

رستم اُس کی بات سُن کر طنز سے ہنسنے لگا اور نسیم کو ساتھ لے کر بیٹنگ کے لیے چلا گیا۔ کچھ وہ جوش میں بھرے ہوئے تھے... کچھ قسمت نے ساتھ دیا، وہ چار وکٹوں پر اسکور پورا کر کے بہ آسانی چھ وکٹوں سے جیت گئے... رستم تیئس رن بنا کر ناٹ آؤٹ رہا۔ اُسے مین آف دی میچ قرار دیا گیا۔

رستم نے سارے راستے پرویز کا ناک میں دَم کر دیا۔ "چلو نکالو پیسے... سب کو آئس کریم اور رس ملائی کھلاؤ۔"

پرویز کا مُنہ لٹکا ہوا تھا۔ ایک آدھ بار اُس نے دبی زبان سے بحث کرنے کی بھی کوشش کی "میرا تو نمبر ہی نہیں آیا پھر کیسی آئس کریم اور کیسی رَس ملائی"، لیکن رستم اور ٹیم کے دوسرے کھلاڑیوں نے اُس کا خوب مذاق اُڑایا۔ پرویز کبھی جیب سے پیسے نکال کر گنتا، کبھی باغی چچا اور باجی سے مدد مانگتا، لیکن باغی چچا اور باجی نے اُس کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اُن کا فیصلہ تھا کہ پرویز شرط ہار گیا ہے لہٰذا اُسے بے چون وچرا سب کی خاطر مدارات کرنی چاہیئے۔ اس پر پرویز کے خلاف تالی پٹ گئی اور وہ باغی چچا سے مالی امداد طلب کرنے لگا۔

گھر پہنچ کر سب نے لان والے نَل سے ہاتھ مُنہ دھویا۔ چھوٹو فرمان نے بینت کی کرسیاں لگا دیں۔ محفل جم گئی۔ پرویز سر جھکائے چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ سب اس سے تقاضا کر رہے تھے کہ وہ بازار جائے اور آئس کریم وغیرہ لے کر آئے۔

اچانک باغی چچا کھڑے ہوئے اور بولے "ارے بھئی پرویز کو کیوں پریشان کرتے ہو... ہم کھلائے دیتے ہیں آئس کریم اور رَس ملائی..."

"نہیں نہیں ... نہیں نہیں ... آپ سے نہیں"

سب جوش سے بولے ... اور پرویز کے خلاف اتنی تالیاں پٹیں کہ وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔

"رس ملائی اور آئس کریم، میں ہی کھلاؤں گا" چچا نے ذرا زور دے کر کہا۔

"کیوں ... آخر آپ کیوں؟" رستم جھلا کر بولا۔

"اس لیے میرے بیٹے کہ پرویز کو کرکٹ بالکل نہیں آتی" باغی چچا اطمینان سے بولے۔

وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے ... اور اُن میں پرویز کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔

باجی اور باغی چچا کی دلچسپ سازش، پوری طرح کامیاب رہی تھی۔ ●●●●

جگانے والی گھڑی

بعض لوگ اتنی گہری نیند سوتے ہیں کہ گھڑی کے الارم سے بھی اُن کی آنکھ نہیں کھلتی۔ اٹلی میں ایک ایسا گھنٹہ (کلاک) بنایا گیا ہے، جو گہری سے گہری نیند سونے والوں کو جگا سکتا ہے۔ پہلے گھنٹہ الارم بجاتا ہے، پھر اس میں کار کا ہارن بجنے کی آواز آتی ہے۔ اس کے بعد کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی ہیں۔ اس پر بھی سونے والا اگر نہ جاگے تو آخر میں اُس میں سے توپیں چلنے کی آوازیں نکلتی ہیں۔ گھڑی ساز کا کہنا ہے کہ یہ گھڑی سوائے بے ہوش لوگوں اور مُردوں کے، ہر ایک کو جگا سکتی ہے۔

آسٹریلیا کا سارجنٹ کتّا

جنگ میں انسان اپنی بہادری اور اعلیٰ کارکردگی کی بدولت مختلف عہدے اور اعزازات حاصل کرتا ہے۔ لیکن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ آسٹریلیا میں "وہاسکا" نام کے ایک کُتّے نے سارجنٹ کا عہدہ حاصل کیا۔ اس کُتّے نے بیس مختلف جنگوں میں شرکت کی اور تین مرتبہ زخمی بھی ہوا۔ بعد میں یہ کتّا قدرتی موت مرا۔ آسٹریلیا کی حکومت نے اس کی جنگی خدمات کے صلے میں اُسے سارجنٹ کا عہدہ دیا۔

کتّوں کا ہوٹل

شیبویاکو (جاپان) میں ایک ایسا ہوٹل ہے، جو صرف کتّوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں باقاعدہ میز اور کرسیاں ہیں، جہاں کتّوں کو دودھ اور گوشت وغیرہ کھانے کے لیے دیا جاتا ہے۔ کتّے کا مالک اپنے کتّے کو کھلا پلا کر بل ادا کرتا ہے۔

دودھ اور مکھن کا شیریں احساس
Royal
بٹر ٹافی
Butter Toffee
Royal
چاکلیٹ ٹافی
Chocolate Toffee
Royal
رائل کنفیکشنری انڈسٹریز 22/24-سی-ایس-آئی-ای-گوجرانوالہ

یاسر آدرش

چھکّا

گُڈّو نے مولوی فیضان سے صرف اتنا سُنا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ اور ہر وقت موجود رہتا ہے نہ تو وہ کسی سے غافل ہوتا ہے اور نہ کوئی اُس کی دسترس سے باہر۔ بس یہی بات اُس کے دماغ میں سما گئی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ کبھی اللہ میاں سے مِلے اُن سے بہت سی باتیں کرے۔ درحقیقت یہ تو اُس نے اپنے دِل کو مطمئن کرنے کے لیے سوچا تھا ورنہ تو وہ اللہ میاں سے صرف اپنے پاپا کی شکایتیں کرنا چاہتا تھا۔ اتنی شکایتیں کہ اللہ میاں پاپا کو سزا دے کر درُست کر دیں۔

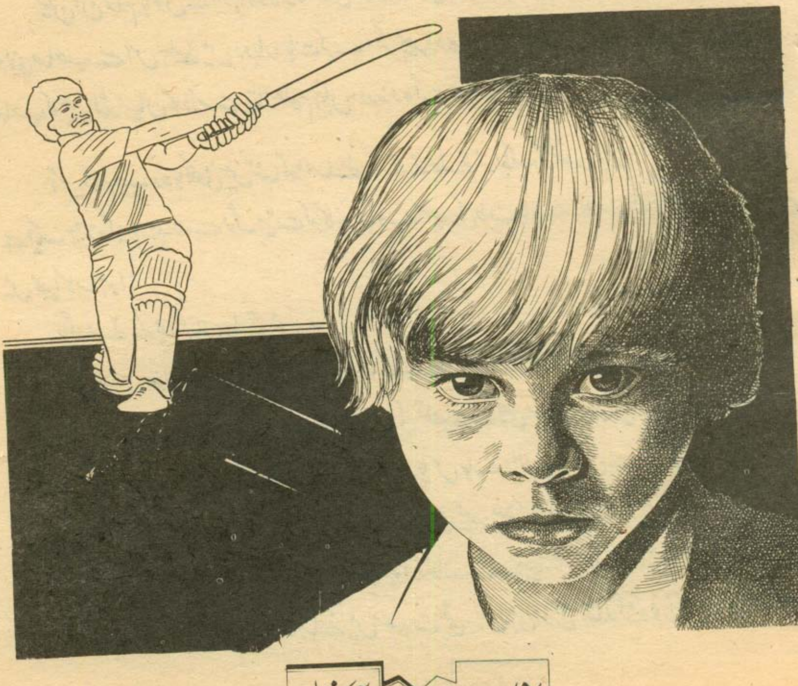

گڈّو نے مولوی صاحب سے اللہ میاں کا پتہ پوچھا تو انھوں نے بڑی عجیب سی بات بتائی "خدا تمھارے دِل میں ہے۔ اپنا دِل صاف رکھو، اچھے کام کرو، اور نمازیں پڑھو، یہی خدا تک پہنچنے کا رستہ ہے۔"

گڈّو نے اپنی بائیں پسلیوں کو ہلکے ہلکے چھُوا، جیسے خدا کو محسوس کر رہا ہو، لیکن اُسے خدا تو کیا اپنا دِل بھی انگلیوں کے پوروں پر محسوس نہ ہوا۔

پھر اُس نے اچھے اچھے کام کیے۔ وہ رنگ برنگ چڑیاں جو وہ تین ماہ پہلے لایا تھا، آزاد کر دیں۔ وقار کی گیند جو پرسوں آنگن میں جاگری تھی بڑی شرافت سے واپس کر دی۔ حتّٰی کہ کل اُس نے مسجد کے باہر سے ایک فقیر کو بلوایا اور اُس کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ مگر خدا سے وہ پھر بھی نہ مل سکا۔

پھر اُس نے باقاعدگی سے نمازیں پڑھنا شروع کر دیں تاکہ خدا سے ملاقات ہو سکے مگر ملاقات تو در کنار وہ ربِّ کریم کا دیدار تک نہ کر سکا۔ البتّہ اس تمام عرصے میں اُس نے اپنے اندر بڑی حیرت انگیز تبدیلی ضرور محسوس کی۔ وہ تبدیلی کیا تھی ؟ یہ تو وہ سمجھنے سے قاصر تھا مگر مولوی فیضان نے اُس کے چہرے پر نئی تازگی ضرور دیکھی تھی۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ اپنا حقیقی مقصد حاصل کرنے سے محروم رہا تھا۔ اُس نے کئی بار سوچا کہ مولوی صاحب سے اس سلسلے میں دوبارہ بات کرے، مگر پھر وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ شاید مولوی فیضان صاحب کو بھی اللہ میاں کا دُرست پتا معلوم نہیں، ورنہ وہ اُسے ضرور بتاتے۔

اُس شام جب وہ بالکونی میں تنہا کھڑا سامنے آتے جاتے ٹریفک کو گھُور رہا تھا سامنے سے ایک جنازہ گزرا۔ بہت سے لوگ میّت کو کاندھا دیے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک جیسے گڈّو کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

لوگ مرنے کے بعد کہاں جاتے ہیں ؟

وہ اپنے اس سوال کا جواب جانتا تھا کہ موت کے بعد ایک نئی زندگی شروع ہوگی اور مرنے والا خدا کے پاس جائے گا جہاں وہ اپنے اعمال کا حساب دے گا۔ سزا و جزا کی تفصیلات بھی مولوی فیضان نے اُسے بتائی تھیں۔ مگر وہ تو اس وقت یہی سوچ رہا تھا کہ مرنے والا، خدا کے پاس جانے والا ہے۔ اس سے فوراً ملاقات کرنی چاہیئے ممکن ہے یہ میرا پیغام اللہ میاں تک پہنچا دے اور اللہ میاں مجھے ملنے کا وقت دے دیں۔

اس خیال کا آنا تھا کہ گڈّو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ نانی جائے نماز پر بیٹھی دُعا مانگ رہی تھیں۔ آپا باورچی خانے میں شاید چائے بنانے میں مصروف تھی۔ بس یہی موقع تھا کہ گڈّو فوراً نکل جاتا چنانچہ اُس

نے ایسا ہی کیا اور تیر کی تیزی سے باہر نکل گیا۔

جس وقت وہ مسجد پہنچا جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ نماز پڑھنے کے لیے صفوں میں شامل ہونا ہی چاہتا تھا کہ دفعتاً وہ ٹھٹھک گیا۔

اگر میں نے نماز شروع کر دی تو یقیناً مرنے والے سے تنہائی میں بات نہ ہو سکے گی،

بس اس خیال کا آنا تھا کہ وہ واپس پلٹا اور گنبد کی بلندیوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اللہ میاں! آپ تو دل کا حال جانتے ہیں۔ اس لیے معاف کر دیجیے گا۔ میں نماز ابھی تھوڑی ہی دیر بعد پڑھ لوں گا۔ اچھا...!"

اُس نے اِس طرح کہا جیسے اللہ میاں بالکل اُس کے سامنے کھڑے ہوں۔ پھر وہ تیزی سے پچھلی سمت والے میدان میں اُتر گیا جہاں ایک پیڑ کی گھنی چھاؤں میں میّت ہری چادر سے ڈھکی ہوئی رکھّی تھی۔ اُس سے کچھ دور چند ایک لڑکے سر پر سفید ٹوپیاں چڑھائے سوگوار سے کھڑے تھے۔

گڈّو دھیرے دھیرے میّت کے پاس پہنچا اور اپنے اطراف دیکھنے لگا۔ اُس کی طرف کوئی بھی متوجّہ نہیں تھا اور گڈّو کے لیے یہی موقع غنیمت تھا۔ اُس نے اندازے کے مطابق میّت کے سرہانے گھٹنے ٹیک دیے اور دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

"پیارے مرنے والے انکل!

مجھے پتا ہے آپ اللہ میاں کے پاس جا رہے ہیں۔ اللہ کرے آپ خیریت سے پہنچ جائیں۔ پلیز انکل! آپ میرا ایک کام ضرور کیجئے گا۔ جاتے ہی اللہ میاں سے کہہ دیجئے گا کہ گڈّو آپ سے ملنا چاہتا ہے، تھوڑا سا وقت نکال کر مجھ سے کسی طرح ضرور مل لیں، یا پھر اپنا پتا دے دیں۔ آپ نے تو ساری دُنیا بنائی ہے، آپ کے پاس تو ٹیلی فون بھی ہوگا۔ میں اپنا ٹیلی فون نمبر آپ کو بھجوا رہا ہوں۔ مجھے نمبر ملتے ہی ٹیلی فون کر لیں۔ آپ کو شاید پتا نہیں اللہ میاں کہ میں آپ سے ملنے کے لیے کس قدر بے چین ہوں۔ پاپا تو اتنے خراب ہیں کہ...!"

وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"بس میں ساری باتیں آپ ہی سے کروں گا کہ آپ ہی سب سے زیادہ اچھے اور بڑے ہیں۔ تب آپ کو پتا چلے گا کہ میرے پاپا کیسے ہیں...؟"

"مرنے والے انکل! آپ ضرور میرا پیغام اُن تک پہنچا دیجئے گا۔ لوگ نماز پڑھ کر آ رہے ہیں، میں بھی اب چلتا ہوں مگر میرا کام ضرور کیجئے گا انکل!"

گڈو اپنا ٹیلی فون نمبر دیتے دیتے رُک گیا۔
"اللہ میاں! آپ تو پوری دنیا کے مالک ہیں، میرا نمبر بھی آپ کے پاس ہوگا، بس کل ضرور مجھ سے بات کیجئے گا۔۔"
اور پھر وہ میّت کے سرہانے سے اُٹھ کر مسجد میں گیا اور نماز پڑھنے لگا۔
جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو میّت لے جائی جا چکی تھی۔ گڈو نے بھی اپنے قدم گھر کی جانب بڑھا دیے۔
اگلے دن وہ صبح ہی صبح اُٹھ بیٹھا اُسے یقین تھا کہ مرنے والے انکل اب تک اللہ میاں کے پاس پہنچ چکے ہوں گے اور یقیناً میرا پیغام بھی اُن تک پہنچا چکے ہوں گے۔ بس اب اُسے صرف انتظار تھا تو ٹیلی فون کا۔
صبح سے شام ہوگئی مگر اللہ میاں کے ٹیلی فون کا کہیں پتا نہ تھا۔ اس دوران کتنے ہی ٹیلی فون آئے، حتیٰ کہ پاپا کا بھی، مگر اُسے تو ان دیگر ٹیلی فونوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔
وہ رات بھی گزر گئی اور پھر اُس سے اگلی رات بھی۔ گڈو کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ شاید مرنے والے انکل صحیح طرح پہنچے نہیں، یا پھر وہ میرا پیغام دینا بھول گئے۔ بس وہ مسلسل یہی سوچے چلا جا رہا تھا۔
دن یہ دن گزرتے رہے اور خبر ہی نہ ہوئی کہ اس واقعے کو دو ہفتے بیت گئے۔ اس دوران گڈو نے اپنے طور پر بہت کوشش کی اور بالآخر اُس کو اتنی کامیابی ہوئی کہ وہ ایکسچینج کا نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے دوست حسن نے بتایا تھا کہ ایکسچینج والوں کے پاس سب کے نمبر ہوتے ہیں۔
اُسی روز اُس نے ایکسچینج ٹیلی فون کیا۔
"ہیلو انکل! میں گڈو بول رہا ہوں۔"
"جی فرمائیے گڈو میاں!" دوسری طرف سے بڑی نرم آواز آئی۔
"انکل آپ کے پاس سب کے نمبر ہوتے ہیں نا۔۔"
"جی۔۔۔جی۔۔۔"
"تو پھر انکل! پلیز ہمیں اللہ میاں کا نمبر بتا دیں، ہم انھیں ٹیلی فون کریں گے۔"
"اللہ میاں کا؟" دوسری طرف سے آنے والی آواز حیرانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔
"جی انکل اللہ میاں کا۔۔" گڈو کے لہجے میں عاجزی تھی۔
"مگر بیٹا۔۔۔!"
"پلیز انکل آپ انکار مت کیجیے گا۔ آپ کو پتا نہیں کہ میں کتنا پریشان ہوں، خدا کے لیے انکل۔۔۔!" گڈو نے

پھر التجا کی۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔ شاید کہنے والے کے پاس اِس عجیب وغریب مُطالبے کا کوئی حل نہیں تھا' مگر وہ دوسری طرف بولنے والے بچّے کی اضطرابی کیفیت سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اُسے یہ خدشہ تھا کہ انکار کی صورت میں نہ معلوم بچّے پر کیا گزرے۔ اُس نے کچھ دیر سوچ کر اپنے ہی گھر کا نمبر دے دیا جو ان دنوں خالی تھا۔

"بیٹا! میں نے آپ کو نمبر دے دیا نا' آپ اس پر کل بات کیجئے گا۔ ہاں ایک بات یاد رکھیے گا اللہ میاں صرف سنتے ہیں جواب نہیں دیتے اچھا... آپ اُن سے بات کیجئے گا اور ٹیلی فون رکھ دیجیے گا۔"

"بہت بہت شکریہ انکل! میں آپ کی ہدایات پر ضرور عمل کروں گا۔ آپ نے مجھے اللہ میاں کا نمبر دیا۔ میں آپ کے لیے بھی اللہ میاں سے کہوں گا کہ آپ کو بہت امیر کر دیں۔ اچھا انکل خدا حافظ..."

"خدا حافظ..." دوسری طرف سے بھی آواز آئی اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

جیسے ہی نیا دن طلوع ہوا، گڈّو ٹیلی فون کے پاس جا کر بیٹھ گیا' لیکن اُسے موقع ہی نہیں مل رہا تھا' اللہ میاں سے بات کرنے کا، نانی سروتہ لیے چھالیہ کتر رہی تھیں تو آیا ناشتے کی میز کو سجانے میں مصروف۔

اُس نے دل میں سوچا' دوپہر میں جب نانی نماز پڑھ کر سو جائیں گی اور آیا اپنے کمرے میں چلی جائے گی تب ٹیلی فون کروں گا۔

اس خیال کے آتے ہی وہ مطمئن ہو گیا' لیکن وہ اس دوران مسلسل یہی سوچتا رہا کہ وہ اللہ میاں سے کیا کیا باتیں کرے گا۔

دوپہر کو کھانے کے بعد نانی نماز میں مشغول ہو گئیں تو گڈّو بھی نئے اُجلے کپڑے پہن کر یوں تیار ہو گیا جیسے وہ خود اللہ میاں سے ملنے جا رہا ہو۔ نانی نماز سے فارغ ہو کر پلنگ پر دراز ہو گئیں۔ البتّہ آیا ابھی باورچی خانے میں برتن دھونے میں مشغول تھی۔

جب آیا نے کام ختم کیا تو اس وقت تک نانی اچھی طرح سو چکی تھیں۔ چنانچہ چند ہی لمحوں بعد آیا بھی وہاں سے جا چکی تھی۔

گڈّو کے لیے یہ موقع اچھا تھا۔ اُس نے پہلے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر آہستہ سے دراز کھینچ کر ڈائری سے وہ نمبر نکالنے لگا جو اُسے ایکسچینج سے ملا تھا۔

اُس نے جلدی جلدی نمبر ملائے اچانک کسی نے ٹیلی فون اٹھا لیا۔

"ہیلو... ہیلو... ہیلو اللہ میاں..." وہ زور زور سے کہنے لگا۔ ٹیلی فون تو کسی نے اٹھا لیا تھا، مگر دوسری

طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ دفعتاً اُسے خیال آیا کہ ایکسچینج والے انکل نے بتایا تھا کہ اللہ میاں صرف سُنتے ہیں بولتے نہیں۔

"سوری اللہ میاں! میں بھُول گیا تھا"۔۔ اُس نے جلدی سے معافی مانگی اور دوبارہ کہنے لگا۔

"اللہ میاں! پہلے تو یہ بتائیں کہ آپ کے پاس مرنے والے انکل پہنچے یا نہیں، میں نے اُن کے ذریعے آپ کو ٹیلی فون کرنے کو کہا تھا۔۔۔ خیر چھوڑیے میں تو آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔

اللہ میاں! آپ نے تو اتنی بڑی دنیا بنائی ہے سب آدمیوں کو بھی۔ میرے پاپا کو بھی، مگر آپ نے انھیں اچھا کیوں نہیں بنایا۔ وہ تو بہت خراب ہیں۔ دوسروں کے پاپا کو آپ نے اتنا اچھا بنایا کہ وہ اپنے بچّوں سے پیار بھی کرتے ہیں اُن کے ساتھ کھیلتے بھی ہیں، مگر میرے پاپا تو بالکل بھی اچھے نہیں۔ آپ کو پتا ہوگا وہ تو بہت مشہور کرکٹر ہیں۔ اِن دنوں بھی وہ ایک سیریز کھیلنے میلبورن گئے ہوئے ہیں۔۔۔ لوگ اُن کی تصویریں کاٹ کر اپنی البم میں لگاتے ہیں مگر میں نے اپنی البم سے اُن کی سب تصویریں نکال دی ہیں۔ اللہ میاں! کیا مشہور لوگ اپنے ننھے منّے بچوں کو بھُول جاتے ہیں۔۔"

اِن لفظوں کے اختتام پر اُس کی ہچکی بندھ گئی۔۔۔ وہ کچھ دیر رُک کر آنسو پونچھتا ہوا بولا۔

"اللہ میاں! وہ جب یہاں ہوتے ہیں تب بھی میرے ساتھ نہیں کھیلتے۔ میری الماری کھلونوں سے بھری پڑی ہے اور وہ سب کھلونے پاپا ہی نے لاکر دیے ہیں، مگر اللہ میاں! کیا کھلونے ماں باپ بن سکتے ہیں؟ مُجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ لوگوں کی ممیوں کی طرح میری ممّی کیوں نہیں؟ میں سارا دن پاپا کو یاد کرتا ہوں کہ اب کی بار وہ آئیں تو وہ بالکل بدل گئے ہوں، مگر ہر بار ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بالکل ویسے ہی رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پاپا میرے ساتھ کھیلیں، باتیں کریں مگر وہ تو بالکل ایسا نہیں کرتے، میں بالکل اکیلا ہوں، اللہ میاں بالکل اکیلا۔ اللہ میاں آپ سب کے لیے پاپا بناتے ہیں مگر میرے لیے کیوں نہیں بناتے۔۔۔ کاش میرے لیے بھی آپ کرکٹر کی جگہ اچھے سے پاپا بنا دیتے کاش۔۔۔!"

وہ کچھ دیر ٹیلی فون اٹھائے روتا رہا۔ شاید اُس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا تھا، لیکن وہ پھر بھی اللہ میاں سے باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔

"بس آخری بات اللہ میاں، کہ میرے پاپا کو سزا ضرور دیجیے گا اور ہاں ٹیلی فون ایکسچینج والے انکل کو بہت ساری دولت بھی۔ انھوں نے ہی مجھے آپ کا نمبر دیا تھا۔ میں نے آپ سے جتنی باتیں کی ہیں سب سچ ہیں اگر یقین نہ آئے تو کسی دن خود دیکھ لیجیے گا۔"

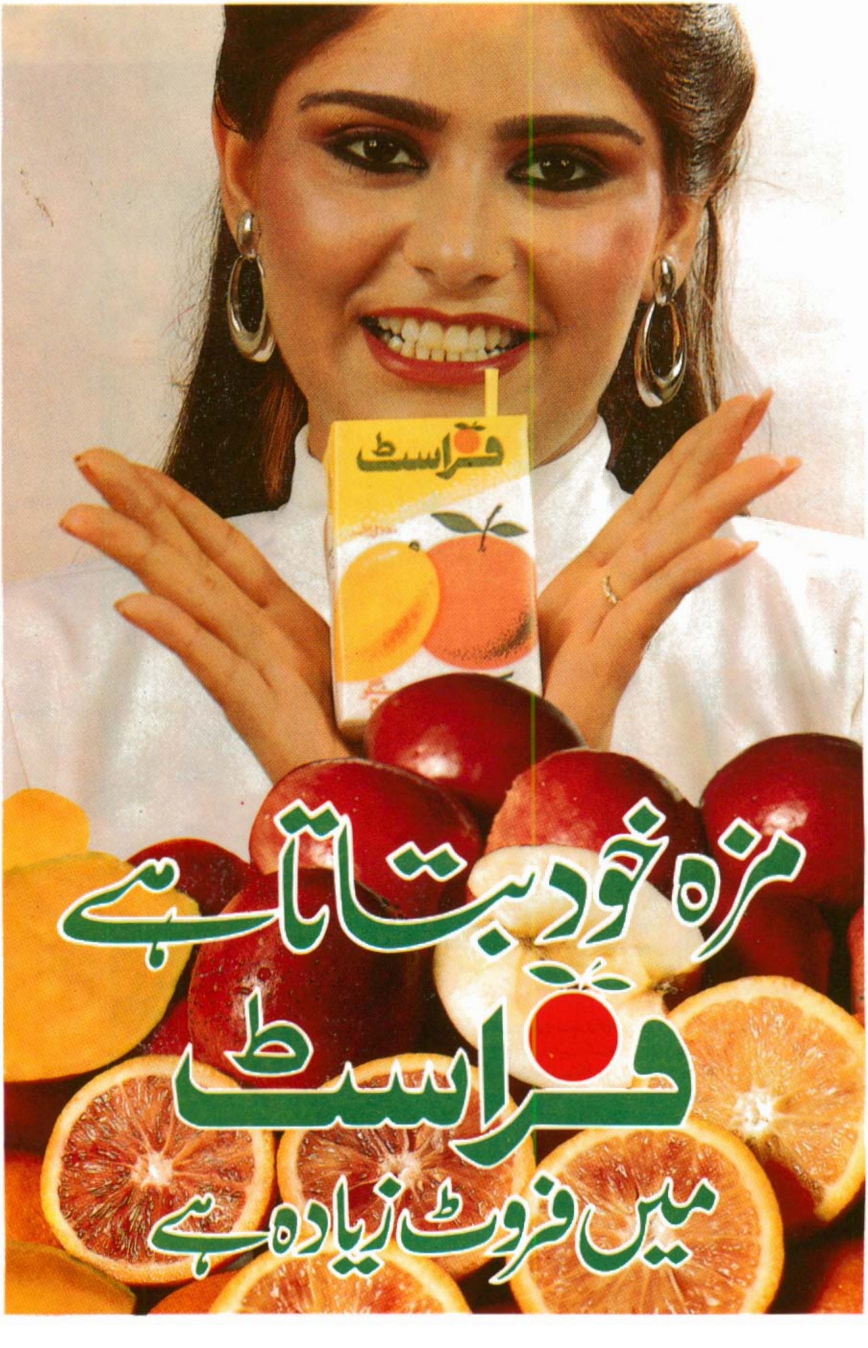
فراسٹ
مزہ خود بتاتا ہے
فراسٹ
میں فروٹ زیادہ ہے

رسیلی سپاری
RASILY
وہ لطف جو آپ بار بار چاہیں....
.....یقیناً وہ لطف رسیلی سپاری ہی کا ہے جسے ایک بار آزمانے کے بعد ہر ایک
اس کے خوشگوار ذائقے اور لطیف مہک کا قائل ہو جاتا ہے۔
سپاری کے صاف ستھرے ٹکڑوں کو قدرتی خوشبویات میں بسا کر ایک
منفرد اور خوشگوار ذائقہ عطا کیا جاتا ہے اور پھر خوبصورت پیکٹوں میں بند
کرکے اِسے رسیلی کا نام دیا جاتا ہے۔
شالیمار فوڈ پروڈکٹس

"اچھا اللہ میاں! میں اب ٹیلی فون بند کر رہا ہوں" اور اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیلی فون کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ اُسے خبر ہی نہ ہوئی اور وہ روتے روتے وہیں سو گیا۔ آنسو اُس کے گال پر خشک ہو کر لکیر سی بنا چکے تھے۔

جس وقت اُس کی آنکھ کھلی شام ہو چلی تھی۔ اس نے جلدی سے مُنہ ہاتھ دھو کر کنگھی کی اور باہر آ گیا۔ باہر بہت سارے بچّے چھوٹے چھوٹے ریڈیو اُٹھائے کمنٹری سُن رہے تھے۔ گڈّو کو دیکھتے ہی سب اُس کے اطراف جمع ہو گئے۔

"گڈّو! پتا ہے تمھارے پاپا کا ایک عالمی ریکارڈ قائم ہونے والا ہے..." خاور نے خوشی سے کہا۔

"ہاں صرف ایک چھکّے کی کمی ہے۔ خدا کی قسم اِس سے شاندار اِننگز تمھارے پاپا نے کبھی کھیلی ہی نہیں..." بدر نے مُکّا فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔

"اور اگر یہ چھکّا مارنے میں تمھارے پاپا کامیاب ہو گئے تو...؟" مُتّقی نے جان بوجھ کر جُملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں میں جانتا ہوں اس چھکّے کے بعد جب وہ کریز چھوڑیں گے تو لاکھوں تماشائی اُن کا تالیاں بجا کر استقبال کریں گے۔ پاکستانی جھنڈے لہرائے جائیں گے۔ اُن کے نام کے نعرے لگیں گے۔ اگلے روز کے اخبارات میں صدر اور وزیرِ اعظم اُنھیں مبارک باد کے پیغام بھجوائیں گے۔ بیش قیمت انعامات اور تحائف دیے جائیں گے۔ آٹو گراف لینے والوں کی طویل قطار اُن کے قلم سے نکلے ہوئے لفظوں کی منتظر ہو گی۔ بس یہی نا... لیکن کیا انھیں یہ خبر ہو گی کہ اُن کا اپنا بیٹا اس اِننگ کو ادھورا دیکھنا چاہتا ہے..." گُڈّو نے بالآخر وہ کہہ دیا جو اس کی زبان پر چڑھ آیا تھا۔

"کیا مطلب...؟" ناصر نے کہا۔

"کیا تم نہیں چاہتے کہ تمھارے پاپا یہ عظیم کارنامہ انجام دیں..." احتشام نے حیرانگی سے کہا۔

"یہ بات تو تمھارے لیے باعثِ فخر ہو گی..." کاشف نے بھی اپنی رائے کو اہم سمجھا۔

"کاش... کاش تم لوگ سمجھ سکتے..." گڈّو کے لہجے میں عجیب سی تھکن تھی۔

"اُف میرے خدا..." یکلخت بدر چلّایا۔ کئی آوازیں بھی اُس کے ساتھ بعد میں شامل ہو گئیں۔ ان کے چہرے زرد پڑ چکے تھے۔ ریڈیو میں کمنٹیٹر چیخ رہا تھا۔

"افتخار الدین کا تیز اونچا شارٹ جو انھیں چھکّے سے ہمکنار بھی کر سکتا اور... اور وہ لانگ آن پر کیچ آؤٹ ہو گئے... افتخار الدین کی تاریخی اِننگز جو ایک معرکہ آرا حیثیت اختیار کرتے کرتے رہ گئی۔ تماشائی اپنی سیٹوں پر

کھڑے ہو کر تالیاں بجا کر اُن کا استقبال کر رہے ہیں اور افتخار الدّین تھکے تھکے قدموں سے بیٹ بار بار زمین پر پٹختے ہوئے پویلین کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ایک طویل اور خوبصورت اننگز جو بالآخر اپنے اختتام کو پہنچی۔"

کمنٹیٹر بدستور بول رہا تھا مگر وہاں کھڑے تمام لڑکے گویا پتّھر کے ہو کر رہ گئے تھے۔اتنی شاندار بیٹنگ کے بعد وہ تاریخی چھکّا جو نہ صرف افتخار الدین بلکہ پاکستانی ٹیم کو بھی لازوال شہرت دلا سکتا تھا۔افتخار الدّین کی بیٹنگ کے بعد ختم ہو چُکا تھا۔

آنے جانے والے راہ گیر جو بار بار ایک دوسرے سے اسی موضوع پر تبصرہ کر رہے تھے،اب تھک کر خاموش ہو چکے تھے۔کھیل کی تمام جان اب ختم ہو چُکی تھی۔پاکستان کو میچ جیتنے کے لیے صرف تین رَن درکار تھے جبکہ ابھی اُس کے چار کھلاڑی باقی تھے۔جیت تو پاکستان کی یقینی تھی لیکن ایک عالمی ریکارڈ چند ہی رنز سے ادھورا رہ گیا تھا۔

رفتہ رفتہ تمام ریڈیو بند ہو چکے تھے۔کیونکہ اب میچ کی سنسنی خیزی ختم ہو چکی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد ٹی وی کی خبروں میں پاکستان کے جیتنے کی نوید سُنائی گئی اور ساتھ ہی افتخار الدّین کی بدقسمتی کی مختصر کہانی بھی۔

افتخار الدّین نے سب کا مان توڑ ڈالا تھا سب کو اُسی سے امیّد تھی اور یوں بھی جس طرح کی اُس نے کل سے بیٹنگ کی تھی اُس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ افتخار الدین یہ عظیم الشان ریکارڈ قائم کرے گا مگر اس طویل اونچے شارٹ نے یہ اعزاز اُس سے چھین لیا تھا۔

پاکستانی شائقین کرکٹ نے افتخار الدین کے نام ٹیلی گرام بھیجے،کچھ نے اُسے مبارک باد دی تھی اور کچھ نے اس کا مزید حوصلہ بڑھایا تھا۔

افتخار الدین اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھے مختلف ٹیلی گرام اور خطوط دیکھ رہے تھے۔

"افتخار الدین کو اس لازوال بیٹنگ پر مبارک باد..."

"عظیم کرکٹر افتخار الدین کو جارحانہ بیٹنگ پر مبارک باد..."

"ہمیں پاکستان کی جیت اور افتخار الدین کی شکست پر دُکھ ہے"

"کاش پاکستان ہار جاتا مگر افتخار الدین اس عالمی ریکارڈ کو قائم کرتے..."

اُنھی بے شمار خطوں اور ٹیلی گراموں میں سے جو خط اب اُن کے ہاتھ لگا تھا وہ اُن کو جھنجھوڑ دینے کے لیے کافی تھا انھوں نے خط کو اُلٹ پُلٹ کر دیکھا اور پڑھنے لگا۔

"جناب عظیم کرکٹر صاحب!

کتنی عجیب بات ہے کہ جس شخص پر پوری قوم فخر کر رہی ہو،اُسے ایک ننھا بچّہ قابلِ تعریف نہ سمجھتا ہو...

یہ مذاق نہیں ایک دلخراش حقیقت ہے جس سے آپ انکار نہ کر سکیں گے۔ میں کون ہوں یہ بتانا ضروری نہیں ہاں آپ کے علم میں، مَیں یہ بات لانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جس سمے آپ ہزاروں شائقین کے درمیان کھڑے بڑے فاتحانہ انداز میں ہاتھ ہلا کر انھیں اپنا کہنا چاہتے ہیں اُس لمحے آپ کا اپنا لختِ جگر تنہا کھڑا ایسے ہی اشاروں کا طالب ہوتا ہے، جسے آپ کی کرکٹ نے آپ سے بہت دُور کر دیا ہے۔

آج آپ کی تاریخی بیٹنگ یقیناً کامیابیوں سے ہمکنار ہو سکتی تھی بشرطیکہ دو ننھے ہاتھ آپ کی حمایت میں اُٹھتے۔ جن شکایتوں کو گڈّو نے خدا تک پہنچانا چاہا ہے اُنھیں میرا قلم لکھنے سے قاصر ہے ہاں البتہ اُسی کا ایک جُملہ صرف اس لیے لکھ رہا ہوں کہ شاید یہ آخری چوٹ آپ جیسے باضمیر شخص کو بیدار کر سکے۔

خدا کے لیے افتخار صاحب آپ عظیم کرکٹر کے ساتھ ساتھ عظیم پاپا بھی بنیے۔

فقط

خیر اندیش"

خط کیا تھا بم تھا جو ایک دھماکے سے افتخار الدین پر پھٹ پڑا تھا۔ انھوں نے کتنی ہی بار اُس خط کو پڑھا تب انھوں نے بے تاب ہو کر پاکستان ٹیلی فون کیا۔

"ہیلو۔۔ مجھے گڈّو سے بات کرنا ہے۔۔۔"

"ہولڈ کیجیے میں ابھی بُلاتی ہوں۔۔۔" یہ کہہ کر آیا گڈّو کو ڈھونڈنے کمرے میں بھاگی۔۔۔!

"گڈّو۔۔۔ گڈّو۔۔۔ تمھارے پاپا کا ٹیلی فون ہے۔۔۔" وہ جگہ جگہ کمرے میں اُسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔

"پاپا کا ٹیلی فون۔۔۔ مگر کس لیے۔۔۔" اُس نے بدستور صوفے میں دھنسے ہوئے کہا۔

"بیٹا وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔۔۔"

"اچھا۔۔۔" گڈّو خاموشی سے اٹھا اور کمرے میں جا کر میز پر رکھا ریسیور اُٹھا لیا۔

"جی۔۔۔" اُس کا لہجہ آج پہلی مرتبہ سَرد ہوا تھا۔

"بیٹا! میں کل آرہا ہوں۔۔۔ آپ ضرور ایئر پورٹ آئیے گا۔۔۔" اور اس سے پہلے کہ مزید کوئی بات ہوتی ٹیلی فون کی لائن کٹ چُکی تھی۔۔۔

گڈّو کے لیے یہ بات کوئی نئی تو نہ تھی کیونکہ اس سے پہلے وہ بغیر پاپا کے کہے ایئر پورٹ گیا تھا مگر انھیں اپنے مدّاحوں سے ہنس کر بات کرنے کے سوا شاید اور کوئی کام نہیں تھا۔ گڈّو سے وہ اس طرح ملتے جیسے وہ اِن کے مدّاحوں سے بھی کم اہمیت کا حامل ہو اور آج۔۔۔!

یہ رویہ گڈو کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

اگلے روز اُس کے پاپا تنہا پاکستان آرہے تھے۔ کرکٹ کے شائقین کی بڑی تعداد اُنھیں ایئرپورٹ سے لینے کے لیے پہلے ہی موجود تھی۔

جس وقت افتخارالدین جہاز سے نکل کر لاؤنج میں آئے۔ ہزاروں کی تعداد میں اُن کے مدّاح ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے اُن کے منتظر تھے۔ کیمروں کے فلش چمکے، اخباری نمائندے سوالات کرنے کے لیے لپکے، ٹی وی والے اُن کا کلوزاپ لینے آگے بڑھے۔ تالیاں بجیں، شور ہوا۔ مگر ان سب باتوں سے بے نیاز افتخارالدین کی نگاہیں اپنے گڈو کی تلاش میں تھیں... چمکتی آنکھوں میں آج پہلے والی کوئی بات نہیں تھی۔

بہت دیر تک وہ گڈو کو اس ہجوم میں ڈھونڈتے رہے مگر اُنھیں وہ چہرہ نظر نہ آسکا جس کا انھیں شدت سے انتظار تھا۔

جس وقت پاپا گھر میں داخل ہورہے تھے۔ گڈو اپنے کمرے میں لیٹا سوچ رہا تھا کہ شاید اللہ میاں نے اُس کی سُن لی اور اس کے پاپا کو یہ سزا دی کہ وہ عظیم عالمی ریکارڈ سے محروم رہ گئے۔

آج جب پاپا اُس سے ملے تو گڈو کو یوں لگا جیسے وہ واقعی پہلے والے نہ رہے ہوں۔ پاپا نے گڈو کو گود میں بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا اور ڈھیروں باتیں بھی کیں۔

دوپہر کو جب سب سو گئے تو گڈو کے پاپا اُٹھے اور گڈو کے کمرے میں آگئے۔ گڈو اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا لوڈو کھیل رہا تھا۔

"بیٹا..." انھوں نے آتے ہی کہا "یہ کون سا کھیل ہے جو اکیلے ہی کھیلا جارہا ہے"۔

گڈو نے ایک نظر پاپا کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "پاپا! میں تو اکیلے ہی کتنے عرصے سے کھیل رہا ہوں" لیکن وہ کچھ نہ بولا۔

"آج سے یہ ہمارا وعدہ کہ ہم آپ کے ساتھ روزانہ لوڈو کھیلیں گے.."

"سچ پاپا...؟" گڈو نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں... ہاں... کیوں نہیں آخر ہم آپ کے پاپا ہیں کوئی کرکٹر تھوڑی ہیں...؟"

گڈو ان آخری لفظوں پر ایک دم چونکا... بالکل وہی بات پاپا نے دُہرائی تھی جو اُس نے اللہ میاں سے کی تھی، لیکن اُنھیں کیسے پتا چلا کہ میں اللہ میاں سے ٹیلی فون پر بات کرچکا ہوں... گڈو کو بہت دیر تک سوچنے کے بعد بھی یہ بات سمجھ میں نہ آسکی۔

"ٹھیک ہے پاپا ہم کھیل کا آغاز کرتے ہیں"۔

"ہاں ہاں بالکل۔۔"

"لال گوٹیں میری اور ہری آپ کی، یہ لیں پانسہ۔۔"

"لاؤ بھئی۔۔" پاپا نے پانسے کو کئی بار ہلایا اور لوڈو کارڈ پر پھینک دیا۔

دفعتاً گڈّو چلّایا۔"پاپا کا چھکّا۔۔"

"چھکّا۔۔" ایک دم جیسے افتخارالدین کے اندر بنی پِچ پر گیند نے باؤنس لیا ہو۔ وہ یک دَم نیچے جُھکے۔۔۔ میلبورن کا تماشائیوں سے بھرا میدان اُن کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ اُنھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے بے شمار تماشائی کھڑے اُن پر قہقہے لگا رہے ہوں۔۔۔

"چھکّا۔۔۔ چھکّا۔۔۔ چھکّا۔۔۔!" اُن کے اندر کوئی چیز بدستور ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ کامیابی سے اتنے قریب ہونے کے بعد شکست۔۔۔! اُن کا ذہن بوجھل سا ہونے لگا۔۔ وہ دُکھ جسے وہ بھُول چکے تھے اُن کے اپنے ہی ہاتھوں تازہ ہوگیا تھا۔۔۔

اُن کا جی چاہتا تھا کہ پانسے کو وہ اپنی مٹّھیوں میں لے کر اس زور سے بھینچیں کہ وہ چٹخ کر ریزہ ریزہ ہوجائے۔۔۔

گڈّو جو بدستور پاپا کے چھکّے پر زور زور سے چلّا رہا تھا، اچانک خاموش ہوگیا، شاید اُسے بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ اس چھکّے نے پاپا کو دُکھ دیا ہے

"پاپا یہ کھیل اچھا نہیں ہے نا میں اُسے پھاڑ دیتا ہوں۔۔" گڈّو نے بڑی دیر کی خاموشی کے بعد کہا اور کارڈ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اُسے ٹکڑوں میں بانٹ دینا چاہتا تھا کہ پاپا نے اُسے کسی گڈّے کی طرح اُٹھالیا

"نہیں گڈّو بیٹا! یہ کھیل سب سے اچھا ہے میں نے وہ چھکّا جو ہزاروں تماشائیوں کے سامنے فیلڈر کے ہاتھوں میں دے دیا تھا، آج اپنے بیٹے کے سامنے کامیابی سے لگا دیا ہے۔۔۔ آج کا چھکّا میری زندگی کا سب سے بڑا واقعہ ہے جس میں میرا تماشائی میرا بیٹا ہے۔ بیٹا! تم تالیاں بجاؤ"

گڈّو تالیاں بجانے لگا۔۔۔ اِن تالیوں میں اُن تالیوں سے زیادہ گونج تھی جو میلبورن کے میدان میں شائقین بجا رہے تھے۔

قومی بچت

رشید ارشد

دانہ دانہ جمع کریں ہم بن جائے کھلیان — پاکستان کے پیارے بچّو یہ ہے بچت کی شان
قطرہ قطرہ دریا بن کر ... لے آئے طوفان! — پاکستان کے پیارے بچّو یہ ہے بچت کی شان
چیونٹی ... شہد کی مکھی جیسی کر کے ہم گزران! — پیسہ پیسہ جوڑیں ہم سب، دیس کی نکھرے شان!
دیس کی اور گھر بار کی خاطر چین کریں قربان! — پاکستان صحیح معنیٰ میں پھر ہو پاکستان!

پاکستان کے پیارے بچّو یہ ہے بچت کی شان!

بچّہ، بوڑھا ... ہر نر ناری، آج کرے اعلان! — قومی بچت سے بھر دیں گے ہم پُورا پاکستان!
قومی بچت سے مُلکی خزانے میں پڑ جائے جان! — کالج، پُل، تالاب، ملیں اور بنیں ہوٹل عالی شان!

پاکستان کے پیارے بچّو یہ ہے بچت کی شان!

آج مجھے اِک گلّہ لا کر دیجئے، ابّو جان! — پان سپاری میں تو سراسر خرچی کا ہے زیان!
آج سے تھوڑا تھوڑا کر کے جوڑوں گا ہر آن! — چونکہ قومی بچت ہے میرا اب جزوِ ایمان!

پاکستان کے پیارے بچّو یہ ہے بچت کی شان!

بلا ضرورت خرچ نہ ہوگا اب اے امی جان! — آپ ہی کہتی ہیں کہ اس میں ملک کا ہے نقصان!
جو اسراف کرے، وہ شخص بھی کتنا ہے نادان! — "وہ شیطان کا بھائی ہے" یہ کہتا ہے قرآن!

شکر خدا کا، ہم نے خود کو آج لیا پہچان!

قومی بچت ہے آج سے ہم سب کا قومی نشان!

پاکستان کے پیارے بچّو یہ ہے بچت کی شان! — دانہ دانہ جمع کریں ہم، بن جائے کھلیان!

گلی کی رونق

ابنِ شہباز خان

مائی جیناں چشمہ لگائے، پیڑھی پر بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی۔
یکایک دھماکہ سا ہوا اور تھال نے زور سے جھٹکا لیا۔ بہت سے چاول نیچے گر گئے۔

"ائے ہئے۔ ناس جائے تم لوگوں کا۔ میرے سارے چاول خراب کر دیے" مائی جیناں نے تھال ایک طرف رکھ کر ناک کی پھننگ پر چشمہ درست کرتے ہوئے دانت پیس کر کہا اور تیزی سے گیند اٹھانے لپکی۔

"کمبختوں کو ہزار بار کہا ہے، گلی میں نہ کھیلا کرو۔ میدان میں جا کر کھیلو۔ مگر ان چکنے گھڑوں پر تو اثر ہی نہیں ہوتا۔"

مائی جیناں نے گیند اٹھا کر پیڑھی کے نیچے رکھ دی اور گرے ہوئے چاول چننے لگی۔

"مائی جیناں! کیا حال ہے تمھارا؟ چاول صاف کر رہی ہو" سامنے دروازے سے ساجد اندر داخل ہو کر خوشامدانہ انداز میں بولا۔ اس کی نگاہیں گیند کی تلاش میں تیزی سے اِدھر اُدھر گردش کر رہی تھیں۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ گیند اندر آ کر کہاں گری ہوگی؟

"ہاں ہاں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کمبخت! تو گیند لینے آیا ہوگا۔ مگر اچھی طرح کان کھول کر سُن لے۔ میں آج گیند دینے والی نہیں۔ کم بختو! تم لوگوں نے تو ہمارا جینا حرام کر دیا ہے جب دیکھو کرکٹ۔ جب دیکھو کرکٹ۔ سارا محلہ سر پر اُٹھائے رکھتے ہو۔ گھر کے برتنوں کو نقصان پہنچاتے ہو۔ گلی سے گزرنے والوں کو الگ پریشان کرتے ہو۔ کبھی تو چین سے بیٹھ جایا کرو کمبختو!" مائی جیناں نے طویل تقریر جھاڑ کر چشمہ صحیح کیا اور چاول صاف کرنے لگی۔

"تم صحیح کہتی ہو مائی جیناں! ہم بھی سوچتے ہیں کہ یہ کھیل بند کر کے کوئی اور کھیل کھیلیں" ساجد نے تائیدی انداز

میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ حالانکہ مائی جیناں تو سر جھکائے چاول صاف کر رہی تھی اور تائید میں ہلتے ہوئے اس کے سر کو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔

"تو گویا تم لوگ کھیلو گے ضرور۔ کرکٹ نہ سہی، کوئی اور کھیل سہی!" مائی جیناں نے اُسے چشمے کے پیچھے سے گھورا۔

"وہ میرا مطلب ہے... اب دیکھو نا مائی جیناں! میدان تو ہے نہیں۔ پھر ہم کہاں کھیلنے جائیں"؟ ساجد معصومیت سے بولا۔

"تو کھیلنا ضروری ہے کیا؟" مائی جیناں نے پھر اُسے گھورا۔

"ظاہر ہے، جس طرح پڑھائی ضروری ہے، اسی طرح کھیل بھی!"

"خیر کچھ بھی ہو۔ آج تو میں گیند کسی صورت میں نہیں دوں گی!" مائی جیناں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"چلو اتنا ہی بتا دو۔ بیچاری گیند گئی کہاں"؟ ساجد بڑے غمگین انداز میں بولا۔

"میں کیوں بتاؤں"۔ مائی جیناں نے کہا اور چور نظروں سے پیڑھی کی نچلی جانب دیکھنے لگی۔ ساجد کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ وہ جان گیا تھا کہ گیند کہاں پڑی ہے۔

"اچھا پانی تو پلا دو مائی جیناں! بہت پیاس لگ رہی ہے۔"

"وہ سامنے گھڑا رکھا تو ہے خود پی لے"۔ مائی جیناں اس کی چال سمجھ گئی۔

"ارے رے رے! یہ گلاس کتنا گندہ ہو رہا ہے۔ اس میں پانی پی کر تو میں بیمار ہو جاؤں گا"۔ ساجد نے گھڑے پر رکھا گلاس اٹھاتے ہی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ مائی جیناں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"لئے ہے۔ کس موئے نے گندا کر دیا گلاس۔ صبح ہی تو میں نے اچھی طرح دھویا تھا"۔ مائی جیناں اُٹھ کر تیزی سے گھڑونچی کی طرف آئی۔ وہ بے انتہا صفائی پسند تھی اور تھوڑی سی بھی گندگی برداشت نہیں کرتی تھی۔

مائی جیناں جیسے ہی پیڑھی سے اُٹھی، ساجد نے عقاب کی طرح غوطہ لگایا اور پیڑھی کے نیچے سے گیند نکال کر یہ جا وہ جا۔ مائی جیناں اسے کوستی ہی رہ گئی۔

"اتنی دیر کیوں لگا دی"؟ اسلم نے پوچھا جو اُن کی ٹیم کا کپتان تھا۔

"گیند آخر مائی جیناں کے گھر گئی تھی۔ دیر تو لگنی ہی تھی"۔ ساجد ہنستا ہوا بولا اور گیند ایوّب کی طرف اچھال دی اس نے تیزی سے لپک لی اور بولنگ کرنے لگا۔ بیٹنگ ناصر کر رہا تھا اور تیز شاٹ لگانے میں خاص مہارت رکھتا تھا۔ ایک بار ایوب نے جیسے ہی گیند اس کی طرف پھینکی، ناصر نے پوری قوت سے شاٹ لگایا۔

"چھکّا!" ناصر کا گروپ چلّایا اور سب مل کر تالیاں بجانے اور نعرے لگانے لگے۔ کھیل فیصلہ کُن مرحلے میں داخل

ہونے والا تھا۔

"کیوں شور مچا رہے ہو لڑکو! کیا دیوتا تم پر مہربان ہو گیا ہے۔" ریحان ساغر صاحب اپنے گھر کے دروازے کا پردہ ہٹا کر باہر آتے ہوئے کرختگی سے بولے۔ وہ مُصنّف تھے اور ڈائجسٹوں میں پُراسرار کہانیاں لکھتے تھے۔

"ساغر انکل! ہماری ٹیم جیت رہی ہے۔" خرّم نے جوشیلی آواز میں کہا۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔

"تو اس میں اتنا شور مچانے کی کیا بات ہے۔ تم لوگوں نے تو میرا لکھنا مشکل کر دیا ہے۔ کہیں اور نہیں کھیل سکتے تم لوگ!" ریحان ساغر صاحب خشک انداز میں بولے۔ ایک تو اُن کا حلیہ پہلے ہی سر جھاڑ منہ پہاڑ تھا۔ اوپر سے وہ خشک مزاج بھی تھے۔

"انکل آپ کو تو پتا ہی ہے، اِرد گِرد کوئی کھیل کا میدان تو ہے نہیں، جہاں ہم کھیل سکیں، اس لیے گلی میں ہی کھیلنے کا شوق پُورا کرنا پڑتا ہے۔" اسلم نے صفائی پیش کی۔

"اچھا اچھا، کھیلو۔ مگر میرا دماغ تو مت کھاؤ۔ ورنہ دیوتا کا قہر نازل ہو گا!" ریحان ساغر صاحب شاید اب تک اپنی کہانی میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کا یہ جُملہ سُن کر لڑکے ہنسے اور دوبارہ کھیل میں مصروف ہو گئے۔

"چوکے، چھکّے مارنا ضروری ہے کیا!" اسلم، ناصر سے مخاطب ہوا۔

"واہ جی! اب ہار رہے ہو تو چھکّوں پر اعتراض ہونے لگا۔" ناصر نے جواب دیا اور سامنے سے آتی ہوئی گیند پر وار کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ گیند پاس آتے ہی اُس نے پوری قوت سے شاٹ لگایا۔

"چھکّا!" لڑکوں کا مشترکہ نعرہ گونجا۔ اس نعرے کی بازگشت ختم ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ برتن ٹوٹنے کی بے سُری آواز اس بازگشت پر حاوی ہو گئی۔

"لگتا ہے، خالہ مریم کے برتن ٹوٹ گئے۔" اسلم تشویش سے بڑبڑایا۔

"اب تو خیر نہیں!" ساجد بھی گھبراہٹ سے بولا۔

"جاؤ گڈّو! گیند تم لاؤ۔ گھر تو تمھارا ہے۔" ناصر نے کہا۔

"نا بابا! پٹائی لگوانی ہے کیا امّی سے۔" گڈّو نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

اتنے میں خالہ مریم گھر کے دروازے میں آکھڑی ہوئیں اور بے نقط سُنانے لگیں۔ جب وہ اپنے دِل کی بھڑاس خوب نکال چکیں تو اپنے گھر میں چلی گئیں۔ ظاہر ہے، گیند بھی ان ہی کے ساتھ اندر جا چکی تھی۔

شاید اسی واقعے کا اثر تھا کہ رات کو محلّے کے بڑوں کی میٹنگ ہوئی۔ جس میں یہ طے کیا گیا کہ کل سے لڑکوں کے گلی میں کرکٹ کھیلنے پر پابندی۔ سارے لوگوں نے اپنے اپنے لڑکوں کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ کل سے کرکٹ نہیں کھیلیں گے۔

کیونکہ اس سے شور شرابا ہوتا ہے اور گھروں کے برتن بھی ٹوٹتے ہیں۔ ان باتوں کی شکایت سب سے زیادہ مائی جیناں، ریحان ساغر صاحب اور خالہ مریم نے کی۔ بلکہ خالہ مریم تو غصّے میں زور زور سے بولتے ہوئے کہنے لگیں "ان موئے لڑکوں نے میرے گھر گیند پھینک کر بالکل نئے ٹی سیٹ کا ناس مار دیا ہے۔ اس لیے ان کے کھیلنے پر پابندی لگانا اشد ضروری ہے"۔ انھوں نے اتنے دلائل دیے کہ سب ہی اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہو گئے۔

اگلے دن حسبِ معمول سارے لڑکے گلی میں جمع ہوئے۔

آج اُن کے ہاتھ خالی اور چہرے اُداس تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹیں آ گئیں۔ پھر وہ سب ٹولی کی شکل میں گلی سے باہر نکل گئے۔

کافی دیر گزر گئی۔

آج گلی میں سکوت طاری تھا۔

نہ کسی لڑکے کی آواز، نہ نعروں کا شور، نہ کھلاڑیوں کی ہمّت بندھانے والی جوشیلی آوازیں۔ ہر طرف ایک عجیب سا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔

یکایک مائی جیناں کے گھر کے دروازے کا پردہ ہٹا اور مائی جیناں کا چہرہ نمودار ہوا۔ اُس نے باہر آ کر گلی میں دونوں جانب نظریں دوڑائیں۔ دُور، دُور تک کوئی نہیں تھا۔ اس گلی میں دونوں جانب آمنے سامنے قطار سے مکانات بنے ہوئے تھے۔ جن میں پہلے صحن آتا تھا، پھر کمرے بنے ہوئے تھے۔ سب کی دیواریں مشترک تھیں۔ چونکہ صحن کی دیواریں قدِ آدم سے زیادہ اونچی نہیں تھیں، اس لیے گیند ہوا میں اُڑتی ہوئی دیوار کے اوپر سے سیدھی صحن میں جا گرتی تھی اور کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھی۔ مگر اب تو سب ہنگاموں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ کھیل ہی بند کر دیا گیا تھا۔

"کتنا سنّاٹا ہے، گلی میں۔ یوں لگتا ہے، جیسے کوئی قبرستان ہو" مائی جیناں بڑبڑائی اور کچھ دیر پردہ تھامے کھڑی خالی گلی کو دیکھتے ہوئے سوچتی رہی۔ پھر سر جھٹک کر اندر چلی گئی۔

"گڈّو۔۔۔ ارے او گڈّو!" خالہ مریم پکارتی ہوئی گھر سے نکلیں۔

"ارے خالہ مریم! آپ کو پتا نہیں، آج سارے لڑکے کہیں باہر چلے گئے۔ کیونکہ ان کے کھیلنے پر پابندی لگ گئی ہے"۔ اپنے گھر کے دروازے کے سامنے بیٹھے ہوئے کمسن عُرفی نے گویا خالہ مریم کو تازہ ترین اطلاع فراہم کی۔

"اتنی خاموشی ہے، کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا"۔ خالہ مریم بے خیالی میں بڑبڑائیں۔ اور خالی نگاہوں سے گلی کو گھورنے لگیں۔

"صحیح کہتی ہو خالہ مریم! کان لڑکوں کے شور کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اس خاموشی سے اُلجھن سی ہونے لگی ہے"۔ خالہ مریم کے ساتھ والے مکان سے نکلتے ہوئے زہبو بولی۔

"ہاں، مگر تنگ بھی تو بہت کرتے تھے" وہ ہمیں! خالہ مریم نے جیسے جواز پیش کیا۔
" مجھے تو ان کے شور سے پتہ چلتا رہتا تھا کہ کیا وقت ہو گیا ہے اور جب شور ختم جاتا تھا تو میں سمجھ جاتی تھی کہ اب مغرب کا وقت ہو گیا ہے۔" زیبو کچھ اُداس سی ہو گئی۔
" ہاں یہ تو تم صحیح کہہ رہی ہو" خالہ مریم اپنا موٹا سَر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولیں۔
کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ریحان ساغر صاحب اپنے گھر کے دروازے کا پردہ ہٹاتے ہوئے، سوچوں میں گُم آہستہ آہستہ باہر آئے۔ حسبِ معمول ان کے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے شیو بڑھ رہی تھی اور چشمہ ناک کی پُھننگ پر لٹکا ہوا تھا۔
" لگتا ہے، اس بستی پر دیوتا کا غضب نازل ہو گیا ہے" وہ بولے " آہ!۔۔ کتنا سناٹا ہے۔ جیسے زندگی ختم ہو چکی ہو۔"
ریحان ساغر صاحب اپنے مخصوص انداز میں بڑبڑا کر چل دیے۔
یہ احساس دھیرے دھیرے ہر گھر میں پیدا ہوتا گیا۔ سارے ہی لوگ آج ایک عجیب سی بے چینی کا شکار تھے اور بار بار گھر سے نکل کر گلی میں آجاتے۔ کچھ دیر خالی اور خاموش گلی کو دیکھتے، پھر دوبارہ اندر چلے جاتے۔۔۔!
اسی طرح تین چار دن بیت گئے۔
لڑکے روزانہ اپنے مخصوص وقت پر گلی میں جمع ہوتے اور باہر نکل جاتے۔ ان کے چہروں کی اُداسی اب مزید گہری ہو گئی تھی اور انھوں نے ہنسنا بولنا بھی کم کر دیا تھا۔
آخر محلّے والوں نے پھر ایک ہنگامی میٹنگ بلائی، سارے بڑوں نے اس میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا کہ لڑکوں کو کھیلنے کی اجازت دے دی جائے۔
یہ فیصلہ سُن کر سارے لڑکوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔
اگلے دن مقررہ وقت پر سارے لڑکے گلی میں جمع ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں حسبِ معمول کرکٹ کا سامان تھا۔
اسلم نے دو گروپ بنائے اور کھیل شروع ہو گیا۔
گلی ایک بار پھر لڑکوں کے پُرجوش نعروں اور شور سے گونجنے لگی۔ اس وقت ایوب بیٹنگ کر رہا تھا اس نے جو ایک زور دار شاٹ لگایا تو گیند سیدھی خالہ مریم کے گھر میں جا گری، خالہ مریم اس وقت اپنے کچے صحن میں بیٹھی برتن دھو رہی تھیں۔ برتن دھونے سے جو پانی جمع ہو گیا تھا، اس نے کیچڑ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ گیند اُڑتی ہوئی آئی اور سیدھی کیچڑ میں جا گری۔ 'چھپاک' کی آواز آئی اور کیچڑ نے خالہ مریم کے چہرے اور کپڑوں پر عجیب و غریب نقش و نگار بنا دیے۔ خالہ مریم دلنت کچکچاتے ہوئے گیند اُٹھا کر باہر آئیں اور دھاڑیں " کمبختو! کھیلنے کو کوئی اور جگہ نہیں ملتی۔ ناک میں دَم کر رکھا ہے تم لوگوں نے۔ سارے کپڑوں کا ناس مار دیا" وہ لڑکوں پر برس رہی تھیں اور لڑکے دم سادھے کھڑے تھے!!

ذہانت آزمائیے

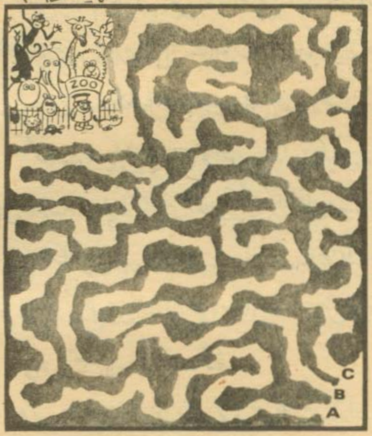

۱۔ ٹیڈی بیر چڑیا گھر جانا چاہتا ہے
راستہ بتائیے

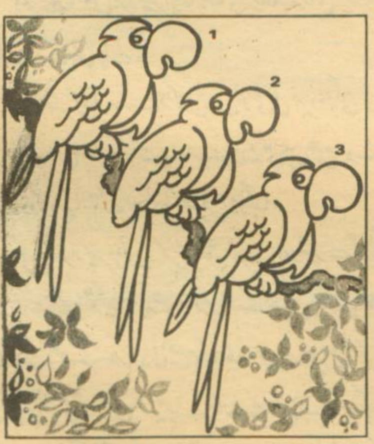

۲۔ تینوں طوطوں میں سے ایک دونوں سے
مختلف ہے۔ بتائیے کونسا؟

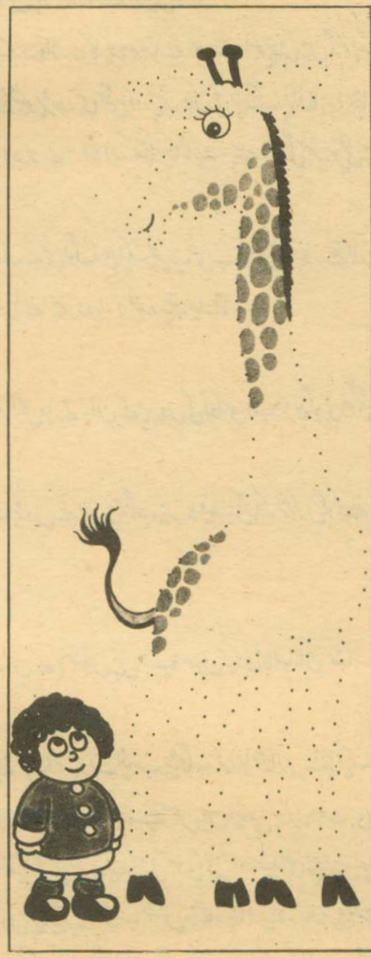

۳۔ یہ اتنا لمبا چوڑا جانور کون سا ہے؟
نقطے ملائیے۔ ابھی معلوم ہو جائے گا

حق اسکواڈ

اخلاق احمد

پہلوان کا فرار

کلاس میں سناٹا طاری تھا۔

صرف ماسٹر صاحب کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے "ملاوٹ ایک ایسی بُرائی ہے جو ہمارے معاشرے کو دھیرے دھیرے تباہ کرتی جا رہی ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ کرنے والوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ وہ معمولی سے منافع کی خاطر قوم کو کیسا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اِس سے ایک طرف ایماندار لوگوں کو بھی نقصان اٹھانا پڑتا ہے جس کے بعد وہ خود ملاوٹ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف ہماری، آپ کی، ہم سب کی صحت تباہ ہوتی جاتی ہے۔ ملاوٹ پر قابو پانے کے لیے، اِسے ختم کرنے کے لیے ہم لوگ خود کوئی کوشش نہیں کرتے اس لیے یہ کاروبار پھیلتا جا رہا ہے۔"

اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے سرفراز نے مُڑ کر پیچھے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ شہر یار، ضیاء اور شہزاد اسی کو دیکھ رہے تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہو رہی تھی۔

چھٹی کے بعد وہ چاروں اسکول سے نکلے تو ان کے چہروں پر مُسکراہٹ تھی۔

سرفراز نے کہا: "ماسٹر صاحب کی بات کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

شہر یار بولا: "بات تو انھوں نے ٹھیک کہی ہے۔ ملاوٹ ختم کرنے کے لیے ہمیں خود کچھ کرنا چاہیئے۔"

شہزاد نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا: "مشکل ہے بھائی۔ ملاوٹ کا دھندا تو نہ جانے کہاں سے کہاں تک پھیلا ہُوا ہے۔"

ضیاء بولا: "ہم پورے شہر یا پورے ملک سے تو اس بُرائی کا خاتمہ کر نہیں سکتے۔ ایک پتلی سی لکڑی کو تو مُکّا مار کر توڑا جا سکتا ہے، لیکن کسی مضبوط درخت کے تنے کو مُکّا مارنے سے درخت کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ درخت کے بجائے ہاتھ ٹوٹ جائے گا۔"

شہر یار مُسکرایا: "نہیں میرے دوست۔ یہی تو ہماری غلطی ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ بڑی بُرائی کا خاتمہ کرنا مشکل ہے، لیکن ہمارے ذہن میں یہ معمولی سی بات نہیں آتی کہ چھوٹی چھوٹی برائیوں کا خاتمہ کر کے ہم بڑی سے بڑی بُرائی کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔ فرض کرو کہ اس ملک میں ایک لاکھ لوگ ملاوٹ کر رہے ہیں۔ اگر ہم ان میں سے ایک یا دو یا چار کو بھی ملاوٹ سے روک دیں تو ان کی تعداد کم ہو جائے گی۔ اگر پورے ملک میں ہم جیسے دوسرے نوعمر لڑکے اسی طرح دو دو، چار چار کو روک دیں تو ذرا سی دیر میں ان کا خاتمہ ہو جائے۔"

سرفراز ہنسا: "بالکل ٹھیک۔ اس طرح ہاتھ نہیں ٹوٹے گا۔ درخت دھڑام سے نیچے آگرے گا۔ یار، یہ کام تو ہمیں فوراً شروع کرنا چاہیئے۔"

اپنے غار نما ہیڈ کوارٹر میں پہنچ کر حق اسکواڈ کے چاروں ارکان نے ملاوٹ کے خلاف اس نئی جنگ کو شروع کرنے کے بارے میں غور کرنا شروع کیا۔

بہت دیر کی بحث کے بعد شہر یار نے کہا: "ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے ہم اپنے علاقے میں ملاوٹ سے پاک دُودھ کی فراہمی کو یقینی بنائیں گے۔"

سرفراز بولا: "صاف اصلی دُودھ، جو ننّھے بچّوں کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ جو بدن کو توانائی دیتا ہے۔ بیماروں کو صحتیاب ہونے کے بعد قوّت بخشتا ہے۔ بوڑھوں کی غذائی ضروریات پوری کرتا ہے۔"

ضیاء نے کہا: "ایک آدمی سارے علاقے کے ہر گھر میں دودھ فراہم کرتا ہے۔"

شہزاد بولا:" اور اس کا نام ہے ... پہلوان دودھ والا ...!" وہ چاروں مُسکرانے لگے۔

پہلوان دودھ والا برسوں سے اس علاقے میں کاروبار کر رہا تھا۔ تیس برس پہلے جب وہ یہاں آیا تھا اور اس نے ایک فٹ پاتھ کے کنارے پیتل کا مٹکا رکھ کر کاروبار شروع کیا تھا تو اس کی عمر بمشکل بیس برس تھی۔ پہلے پہل اس نے ایمانداری سے اصلی دُودھ بیچا۔ مگر بہت جلد اس نے دُودھ میں پانی ملانا شروع کر دیا۔ اتفاق کی بات کہ انہی دنوں حکومت بدلی اور مارشل لاء لگ گیا۔ اس کے ساتھ ہی جگہ جگہ کھانے پینے کی چیزوں کی چیکنگ شروع ہو گئی۔ ناقص اور خراب اشیاء فروخت کرنے والوں کی شامت آگئی۔ پہلوان دودھ والا پہلے ہی دن گرفتار کر لیا گیا۔ دودھ میں پانی کی ملاوٹ کرنے پر اُسے بھاری جُرمانہ ادا کرنا پڑا اور ایک ماہ کی قید کاٹنی پڑی ...

مگر یہ تیس برس پرانی بات تھی جواب کسی کو یاد بھی نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ پہلوان دودھ والے کا کاروبار ترّقی کرتا گیا۔ دکان پھیلتی گئی۔ دولت بڑھتی گئی۔ کہتے ہیں کہ جب دولت ناجائز ذریعوں سے آتی ہے تو اپنے ساتھ لالچ کے جذبات بھی لاتی ہے۔ پہلوان دُودھ والے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اب وہ بے شمار گھروں میں دُودھ پہنچاتا تھا۔ خوب پیسے کماتا تھا۔ مگر اس کے اندر چُھپا لالچ کا جذبہ ختم نہیں ہوتا تھا۔ کبھی وہ دُودھ میں ملائے جانے والے پانی کی مقدار میں اضافہ کر دیتا۔ کبھی دُودھ کی قیمت بڑھا دیتا، وہ خوب دولت کمانا چاہتا تھا لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا چاہتا تھا۔

مگر اُسے معلوم نہ تھا کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔

اور اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ "حق اسکواڈ" ... ایک فیصلہ کر چکا ہے ...!!

ایک شام وہ اپنی دکان صاف کر کے، دُودھ کے کڑھاؤ کے نیچے آگ جلا کے، اپنی گدّی پر پیر پھیلا کر بیٹھا ہی تھا کہ کہیں سے اچانک چار نوعمر لڑکے نمودار ہوئے۔ پہلوان نے انھیں غور سے دیکھا۔ وہ اسی علاقے کے لڑکے تھے۔ ہر روز وہ انھیں بستے سنبھالے اسکول جانے کے لیے دکان کے سامنے سے گزرتا دیکھتا تھا۔ پہلوان کو خیال آیا کہ شاید وہ دودھ خریدنے آئے ہیں۔

اس نے کہا۔" ہاں جی ... کتنا دودھ چاہیئے ...؟"

سرفراز نے کہا۔" کیا بھاؤ ہے دودھ ...؟"

پہلوان مسکرایا۔" سات روپے کلو ہے جی ... پُرانا بھاؤ ہے، کتنا چاہیئے؟"

شہزاد نے سر کھُجا کر کہا۔" ہمیں تو بیس کلو دودھ چاہیئے ..."

پہلوان اُچھل کر سیدھا بیٹھ گیا۔ بیس کلو۔۔۔! ان لڑکوں کے گھر میں شاید تقریب ہونے والی تھی۔ لوگ عام طور پر زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ کلو دودھ خریدتے تھے۔ مگر بیس کلو۔۔۔! آج تو قسمت مہربان نظر آتی تھی!

پہلوان نے کہا۔" مل جائے گا جی بیس کلو دودھ۔۔۔ ضرور مل جائے گا۔۔"

ضیاء بولا۔۔" مگر پہلوان صاحب۔۔۔ دودھ ہے کہاں۔۔۔؟"

"دودھ۔۔۔؟ پہلوان حیرت سے بولا۔۔" یہ سامنے رکھا ہے دودھ۔۔" اس نے کڑھاؤ کی طرف اشارہ کیا۔

ان چاروں نے کڑھاؤ کو دیکھا، پھر ایک دوسرے کو دیکھا، بالآخر شہزاد نے کہا" یہ جو سفید پانی ہے، اس کو دودھ کہہ رہے ہو۔۔۔؟"

پہلوان ہنسا۔۔" یہ کیوں مذاق کر رہے ہو جی، یہ پانی کہاں ہے، دودھ ہے، بالکل اصلی دودھ۔۔"

سرفراز نے کڑھاؤ پر جھک کر اسے سونگھا اور کہا۔۔ مگر اس میں سے تو مچھلیوں کی بُو آ رہی ہے۔۔۔؟" اس کی بات پر باقی تینوں ہنسے۔

پہلوان نے شبے سے ان چاروں کو دیکھا" کیا بات ہے جی، آپ لوگ دودھ لینے آئے ہو یا مذاق کرنے۔۔؟"

شہریار نے کہا۔۔" سُن رہے ہو بھائی سرفراز۔۔۔! اپنے پہلوان صاحب کا خیال ہے کہ ہم ان سے مذاق کرنے آئے ہیں"۔

سرفراز ہنسا۔۔" ہاں بھائی شہریار۔۔۔ مگر ان کا خیال کتنا غلط ہے۔

ہم ان سے مذاق کہاں کرنے آئے ہیں۔ ہم تو بیس کلو دودھ لینے آئے ہیں، سات روپے کلو والا دودھ۔۔۔ پورے پیسے دیں گے، پورا دودھ لیں گے، اصلی نوٹ دیں گے، اصلی دودھ لیں گے۔۔"

پہلوان اب چوکنا ہو کر ان چاروں کو دیکھ رہا تھا۔ بظاہر وہ سیدھے سادے لڑکے نظر آتے تھے۔ مگر ان کے لہجے میں، ان کی باتوں میں کوئی ایسی بات تھی جو پہلوان کو پریشان کر رہی تھی۔

"کیا چکر ہے جی۔۔۔" اس نے غصے سے کہا" کیا چاہتے ہو تم لوگ۔۔؟"

"ویری گڈ۔۔" شہریار نے قہقہہ مارا۔۔ اَب پوچھا ہے نا اپنے پہلوان صاحب نے اصلی سوال۔۔ کیا چاہتے ہو تم لوگ۔۔۔ بتاؤ بھئی سرفراز۔۔۔ انھیں بتاؤ کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔۔"

سرفراز نے آسمان کی طرف دیکھا، کان کھجایا، انگلیاں چٹخائیں اور پھر بولا۔۔۔" بھئی پہلوان صاحب، ہم سیدھے سادے لوگ ہیں۔ ہم کوئی ہیرے جواہرات تو مانگتے نہیں، ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے پانی میں پانی ملانا بند کر دیں۔۔۔ اوہ۔۔۔ شاید میں غلط کہہ گیا۔۔ میرا مطلب تھا اپنے دودھ میں پانی ملانا بند کر دیں۔

a great new taste
mayfair
Fruta
Chew
Chew it,
you'll love it.
Fruta Chew
Fruta Chew
mayfair
–the sweet favourites

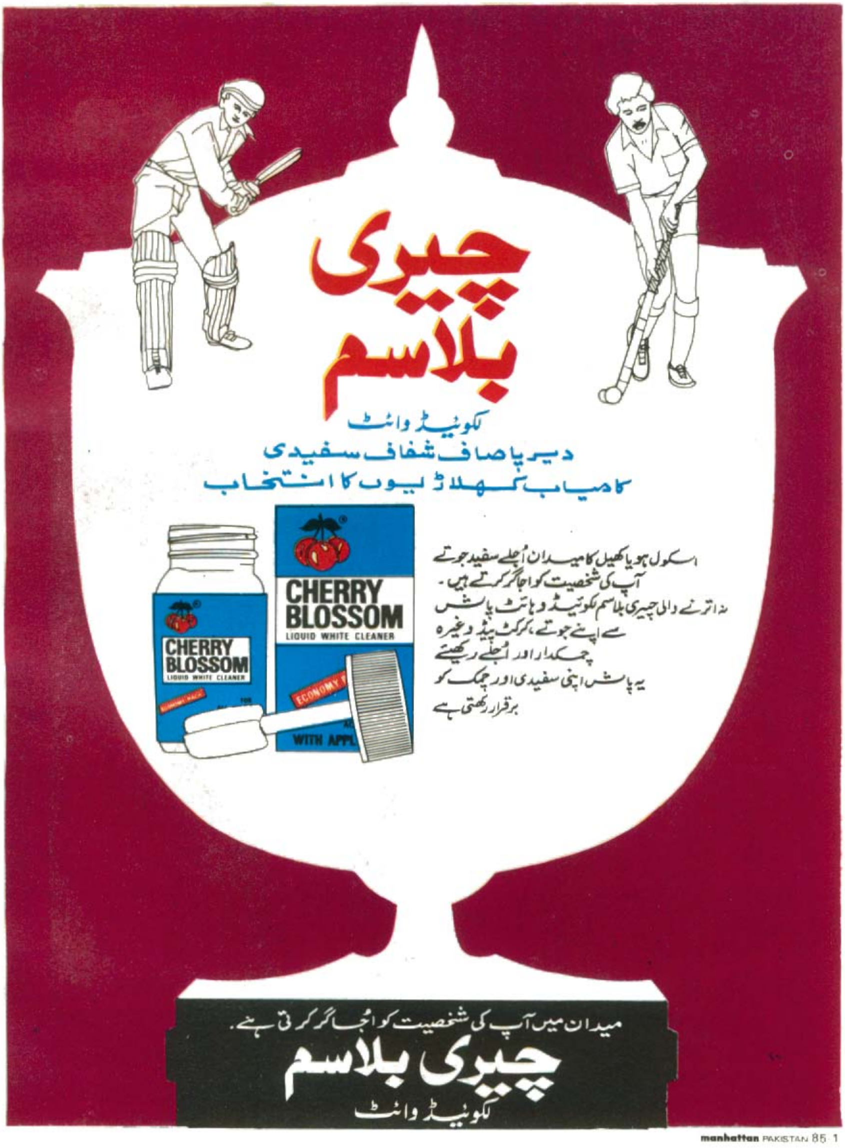

چیری
بلاسم
لکوئیڈ وائٹ
دیرپا صاف شفاف سفیدی
کامیاب کھلاڑیوں کا انتخاب
CHERRY BLOSSOM
LIQUID WHITE CLEANER
اسکول ہو یا کھیل کا میدان اُجلے سفید جوتے
آپ کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔
نہ اترنے والی چیری بلاسم لکوئیڈ وہائٹ پالش
سے اپنے جوتے، کرکٹ پیڈ وغیرہ
چمکدار اور اُجلے رکھیے
یہ پالش اپنی سفیدی اور چمک کو
برقرار رکھتی ہے
میدان میں آپ کی شخصیت کو اُجاگر کرتی ہے۔
چیری بلاسم
لکوئیڈ وائٹ

آپ نے بہت پیسہ کما لیا، بہت ملاوٹ کر لی، بہت لوگوں کی صحت تباہ کر لی، اب یہ سلسلہ بند کر دیجئے... آج کے بعد سے آپ دودھ میں پانی نہیں ملائیں گے..."

شہزاد بولا "یہی ہماری درخواست ہے..."

ضیاء نے کہا "یہی التجا ہے..."

اور شہریار نے آہستہ سے کہا "یہی ہمارا حکم ہے...!"

پہلوان ساکت بیٹھا انھیں گھورتا رہا۔ اس کی آنکھیں غصّے سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ بالآخر وہ بولا..."چلے جاؤ... اس سے پہلے کہ میں تمھاری ہڈیاں توڑ ڈالوں، چلے جاؤ..." اس کی آواز میں کرختگی تھی۔ مگر اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ چاروں لڑکے اس سے قطعی متاثر نہیں ہوئے تھے۔

شہریار نے ایک انگلی ہوا میں لہرائی اور بولا... "ایک دن... تمھارے پاس صرف ایک دن ہے پہلوان... چوبیس گھنٹے کے بعد ہم ایک بار پھر تمھارا دودھ چیک کریں گے، اگر تم نے پانی ملانے کا سلسلہ بند نہ کیا تو ہماری تمھاری کھلی جنگ شروع ہو جائے گی..."

"جنگ...!" پہلوان حقارت سے ہنسا... "تم جیسے پِدّوں کے مُنہ سے جنگ کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔ میں نے ذرا زور سے پھونک مار دی تو اُڑ جاؤ گے... جاؤ جاؤ... بھاگ جاؤ... کس نے کہا تم سے کہ میں دودھ میں پانی ملاتا ہوں...؟"

"ایک دن..." شہریار نے پھر انگلی ہوا میں لہرائی اور پلٹ کر چل پڑا، اس کے ساتھ ہی اس کے تینوں ساتھی بھی روانہ ہو گئے۔

پہلوان انھیں جاتے دیکھتا رہا، جب وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ پھر ہنسا... "ہونہہ... ایک دن..." اس نے انگلی لہرا کر شہریار کی نقل اتاری... "مُنہ اٹھا کے آ گئے تھانیدار کے بچّے، جانتے نہیں ہیں کہ پہلوان کون ہے...!"

وہ اپنے کڑھاؤ میں اُبلنے والے دودھ کو دیکھ دیکھ کر ہنستا رہا۔

اگلی صبح جب پہلوان معمول کے مطابق بیدار ہوا تو آسمان پر اندھیرا چھایا ہوا تھا، وہ ہر صبح فجر کی اذان سے پہلے ہی بیدار ہو جاتا تھا۔ یہ وقت دُودھ میں پانی ملانے کے لیے انتہائی مناسب تھا۔ دُور دُور تک سنّاٹا ہوتا تھا۔ سب اپنے اپنے گھروں میں سو رہے ہوتے تھے۔ اس وقت ملاوٹ کرنے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔

ہر صبح کی طرح اس روز بھی پہلوان نے اُٹھنے کے بعد دودھ کے بڑے بڑے کنستروں کو اُٹھا اُٹھا کر نل

کے پاس رکھنا شروع کیا۔ ہر کنستر آدھا بھرا ہوا تھا، اصلی دودھ سے۔ ہر صبح وہ ایک ایک کنستر کو نَل کے نیچے رکھتا جاتا تھا۔ جب ایک کنستر بھر جاتا تھا تو وہ دوسرا کنستر نَل کے نیچے رکھ دیتا تھا۔ کنستر میں آدھا دودھ پہلے سے موجود ہوتا تھا۔ باقی آدھا وہ پانی سے بھر دیتا تھا۔ گاڑھا دودھ پتلا ہو جاتا تھا، لیکن جب وہ اس میں کچھ دودھ کا پاؤڈر ڈال کر اُسے اُبالتا تھا تو پھر ملاوٹ کا شبہ کرنا آسان نہ رہتا تھا۔

اس صبح بھی اس نے پہلا کنستر نَل کے نیچے رکھا اور نَل کی ٹونٹی کھول دی۔

مگر پانی نہیں نکلا۔۔۔!

چند لمحوں کے لیے پہلوان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نَل کھولا جائے اور پانی ہی نہ آئے۔۔۔!

مگر ایسا ہی ہُوا تھا۔ اس نے ٹونٹی بند کی اور پھر کھولی، مگر پانی اب بھی نہیں آیا۔ دیر تک وہ اندھیرے میں حیران، پریشان کھڑا رہا۔ آج تک ایسا کبھی نہیں ہُوا تھا۔ نَل سے ہر وقت پانی آتا رہتا تھا۔

پہلوان نے جُھک کر ٹونٹی کے سوراخ کو ٹٹولا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔۔۔!

ٹونٹی میں کچھ پھنسا ہوا تھا۔ شاید کوئی کارک تھا جسے ٹھونک ٹھونک کر نَل کے اندر گھُسا دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے پانی کے نکلنے کا راستہ بالکل بند ہو گیا تھا۔

ایک لمحے میں وہ ساری بات سمجھ گیا۔ یہ یقیناً اُنہی چار شیطانوں کی شرارت تھی۔ وہی جو دکان پر اسے دھمکی دے کر گئے تھے، اس نے دِل ہی دل میں کہا۔۔۔ "کوئی بات نہیں۔۔۔ تم سے تو میں سمجھ لوں گا، تم نے پانی بند کر دیا تو کیا ہوا۔ میں دوسرا بندوبست کر لوں گا"۔

وہ اُٹھ کر اندر گیا اور اپنے دونوں پانی کے مٹکے اُٹھا لایا۔ یہ پانی اُس نے دُودھ میں ملا دیا۔ مگر ابھی تمام کنستر نہیں بھرے تھے، وہ صراحی بھی اٹھا لایا اور اس کا پانی بھی دودھ میں انڈیل دیا۔ پھر وہ غُسل خانے میں رکھی پانی کی بالٹی اُٹھا لایا اور اس کا پانی بھی دودھ میں ملا دیا۔

سارے کنستر اب بھی نہیں بھرے تھے، مگر دودھ اتنا ہو چکا تھا کہ کام چل سکتا تھا۔ وہ مُسکرایا۔ تھوڑا بہت پانی تو دکان والے نَل سے بھی ملایا جا سکتا ہے۔

اس روز وہ دکان پر خاموش بیٹھا رہا۔ اتنا پانی ملانے کے باوجود دودھ گاڑھا تھا اور کم تھا۔ لالچی پہلوان جانتا تھا کہ کم دودھ کا مطلب ہے، کم منافع، اور کم منافع کا مطلب تھا مایوسی۔۔۔

اس روز کئی گاہکوں نے اس کے دودھ کی تعریف کی۔ پہلوان بے چارگی سے اُن کا شکریہ ادا کرتا رہا۔

شام کو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب اس نے ان چاروں شیطانوں کو اچانک کہیں سے نمودار ہوتے دیکھا، وہ اس کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے اور مسکرانے لگے۔

پہلوان نے اِدھر اُدھر دیکھا، دُور، دور تک کوئی نہ تھا۔

پھر وہ بولا "تم نے میرا نل بند کیا تھا۔۔۔؟"

ان چاروں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ایک ساتھ کہا "نہیں۔۔۔"

"اداکاری مت کرو۔۔۔" پہلوان نے خونخوار لہجے میں کہا "میں خوب جانتا ہوں، تم لوگوں نے ہی میرے نل میں کوئی کارک ٹھونسا تھا، لیکن ایک بات کان کھول کر سُن لو، میں تم جیسے بچّوں کی دھمکی سے ڈرنے والا نہیں ہوں، میں دُودھ میں پانی ملاتا رہوں گا، تم لوگ جو بگاڑ سکتے ہو، بگاڑ لو۔۔۔"

شہریار نے کہا "سوچ لو پہلوان، ہم سے ٹکرانا آسان نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے کاروبار کو نقصان پہنچے"۔

سرفراز بولا "کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھاری دکان پر کوئی گاہک نہ آئے"

ضیاء نے کہا "کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دکان پر تنہا بیٹھے مکھیاں مارتے رہو۔۔۔"

شہزاد بولا "کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھیں دکان بند کرنی پڑے۔۔۔"

پہلوان چیخ کر بولا۔۔۔ "دُور ہو جاؤ میری نظروں سے۔۔۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

شہریار نے کہا "ہم نے تمھیں ایک دن کی مہلت دی تھی مسٹر پہلوان۔۔۔ مگر تم باز نہیں آئے، اب ہمارے وار کے لیے تیّار ہو جاؤ۔۔۔"

وہ خاموشی سے مڑے اور ٹہلتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

اگلے روز علی الصبح فجر کی نماز کے بعد "حق اسکواڈ" نے اپنی کارروائی شروع کر دی۔

اِن چاروں کے ساتھ ایک دُبلا پتلا نوجوان لڑکا بھی تھا۔ اس لڑکے کا نام محمود تھا اور اُس نے یہاں سے کچھ دُور دودھ کی دکان کھولی تھی۔ وہ چاروں رات کو ہی محمود سے معاملہ طے کر کے آئے تھے۔

ان پانچوں نے علاقے کے پہلے مکان پر دستک دی۔ اندر سے ایک صاحب کچھ دیر کے بعد آنکھیں ملتے ہوئے نکلے۔

شہریار نے انھیں سلام کیا اور کہا۔ "جاوید صاحب، یہ ہمارا دوست محمود ہے۔ اس نے دودھ کی دکان کھولی ہے۔ آج اِس کے کاروبار کا پہلا دن ہے۔۔۔"

جاوید صاحب نے کہا۔"اچھا... مگر ہم تو پہلوان سے دودھ لیتے ہیں۔۔"

"شوق سے لیجیے۔۔" سرفراز نے کہا۔۔"ہم توآپ کو محمود کی دکان کا دودھ دینے آئے ہیں، آج پہلا دن ہے۔ ہم ہر گھر میں ایک ایک پاؤ دودھ دیں گے۔۔۔ بالکل مُفت۔۔"

"مُفت۔۔۔؟" جاوید صاحب چونکے۔

"جی ہاں" شہریار نے کہا۔۔"ایک پاؤ دودھ بالکل مفت، آپ اس دودھ کو پی کر دیکھئے، آپ کو پہلا گھونٹ لیتے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ پہلوان دودھ والا آپ کو کس طرح بیوقوف بنا رہا ہے، اگر آپ کو یہ دودھ اچھا لگے، اگر آپ خود کو، اپنے گھر والوں کو، اپنے بچّوں کو ملاوٹ سے بچانے کی خواہش محسوس کریں تو پھر آئندہ محمود سے ہی دودھ لیجیے گا۔ یہ ایمانداری کا سودا ہے۔ ہماری بات سچّی لگے اور دودھ اصلی لگے تو اپنی مرضی سے فیصلہ کیجیے گا۔"

انھوں نے جاوید صاحب کو پلاسٹک کی تھیلی تھما دی جس میں ایک پاؤ دودھ تھا۔

جاوید صاحب نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے" اور اندر چلے گئے۔

اس کے بعد انھوں نے اگلے دروازے کو کھٹکھٹایا، یہاں بھی انھوں نے ایک پاؤ دودھ دیا، پھر وہ اگلے گھر کی طرف بڑھ گئے۔

ایک گھر، دو گھر، دس گھر، پچاس گھر... وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے، ہر ایک کو مُطمئن کرتے ہر گھر کو پہلوان کے دودھ کی خرابیوں سے آگاہ کرتے آگے بڑھتے گئے۔

ساڑھے نو بجے جب وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو علاقے کے دو سو گھروں میں اُن کا پیغام پہنچ چکا تھا، ہر جگہ کھلبلی مچی ہوئی تھی، ہر گھر میں ان کا ذکر ہو رہا تھا، لوگ اصلی دودھ دیکھ رہے تھے۔ اس کی مہک سونگھ رہے تھے۔ اس پر جمنے والی بالائی کی موٹی تہہ پر حیران ہو رہے تھے۔ اس کے ذائقے سے سرشار ہو رہے تھے۔

"لڑکے ٹھیک کہہ رہے تھے۔۔" کوئی آدمی کہہ رہا تھا۔

"دودھ واقعی اصلی ہے۔" کوئی بوڑھی خاتون باتیں کر رہی تھی۔

"کتنا عُمدہ اور گاڑھا دودھ ہے۔" ایک لڑکی اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔

"پہلوان کا دودھ تو بالکل بے کار ہے اس کے مقابلے میں۔" کوئی لڑکا دودھ کا گھونٹ لے کر اپنی بہن کو بتا رہا تھا۔

اور وہاں سے بہت دُور اپنے ہیڈ کوارٹر میں وہ چاروں بیٹھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا پیغام گھر گھر پہنچ چکا ہے۔ ان کی نظریں سامنے بیٹھے محمود پر جمی ہوئی تھیں جس کی دکان کا اصلی دودھ لوگوں کو فراہم کیا گیا تھا۔

"محمود" شہریار کہہ رہا تھا "تم پر بہت بڑی ذمّہ داری عائد ہونے والی ہے۔ اصلی دودھ فراہم کرنے کی ذمّہ داری۔ آج تم نے سوا مَن دودھ مفت تقسیم کیا ہے، لیکن یقین رکھو، کل سے تمھیں بے شمار گھروں میں کئی مَن دودھ فراہم کرنے کے آرڈر مل جائیں گے، لیکن ایک بات یاد رکھنا جس دن تم نے ملاوٹ کرنی شروع کی اس دن ہم تمھارے دوست نہیں رہیں گے۔ دشمن بن جائیں گے۔ اور "حق اسکواڈ" جس کا دشمن بن جائے وہ باطل کی طرح صفحۂ ہستی سے غائب ہو جاتا ہے۔"

محمود کی آنکھوں میں ان چاروں نوجوانوں کے خلوص کے عِوض محبّت کے آنسو تھے "کبھی نہیں دوستو..." اس نے کہا "ملاوٹ میں کبھی نہیں کروں گا... تم لوگوں نے میرا کاروبار جمانے میں مدد دی ہے۔ میں اس کا بدلہ چکانے کے لیے صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ علاقے کے لوگوں کو کبھی ناحق، ملاوٹ شدہ دُودھ نہیں دوں گا۔"

ایک ہفتے بعد وہ پہلوان کی دکان پر پہنچے تو وہاں پہلوان پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ کڑھاؤ دودھ سے بھرا ہوا تھا اور سارے کنستر دودھ سے بھرے تھے۔

"تم...!" پہلوان نے انھیں دیکھتے ہی غرّا کر کہا "تم کیا کرنے آئے ہو یہاں...؟"

"ہم کیا کرنے آئے ہیں...؟" شہریار نے حیرت سے کہا۔ "بتاؤ بھئی سرفراز... اپنے پہلوان صاحب کو بتاؤ ہم کیا کرنے آئے ہیں..."

سرفراز نے پھر سر کھجایا، قمیض کا کالر درست کیا، مُسکرایا اور بولا... "ہم مشورہ دینے آئے ہیں پہلوان صاحب ... بالکل مفت مشورہ دینے آئے ہیں، مشورہ یہ ہے کہ اب آپ یہ دکان بند کر دیجئے اور اپنے گاؤں واپس تشریف لے جائیے..."

"کیوں...؟" پہلوان نے گرج کر پوچھا۔

"اس لیے کہ یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں" شہریار نے کہا "اور یہ دکان کھولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب آپ سے کوئی دُودھ نہیں لے گا، جن لوگوں کو اصلی دودھ مل رہا ہے، وہ آپ سے پانی جیسا دودھ بھلا کیوں لیں گے۔ ہمارے دوست محمود کی دکان اب چل نکلی ہے۔ وہ بالکل اصلی دودھ بیچ رہا ہے"

پہلوان نے انھیں یوں دیکھا جیسے انھیں کچّا چبا جائے گا۔

ضیاء نے کہا "اس غصّے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے اب تو آپ کو ذرا ٹھنڈے دِل سے صورتِ حال پر غور کرنا چاہیئے ۔ ۔ ۔"

شہزاد بولا "اپنے پہلوان صاحب، اب آپ کے پاس دو ہی راستے باقی رہ گئے ہیں، یا تو دکان بند کرکے روانہ ہو جائیے، یا پھر اصلی دودھ بیچنا شروع کر دیجیے، ہو سکتا ہے کہ آپ اصلی دودھ کے ذریعے چند گاہکوں کو واپس اپنی طرف بلا سکیں ۔ ۔ ۔"

"مشکل ہے ۔ ۔ ۔" شہریار ہنسا "ایک تو محمود کی نیک نامی اور اصلی دودھ کی شہرت بہت پھیل چکی ہے دوسرے اپنے پہلوان صاحب کو ملاوٹ کرنے اور حرام کھانے کی عادت پڑ چکی ہے اور جس کو یہ عادت پڑ جائے وہ مشکل سے ہی راہِ راست پر آتا ہے ۔ ۔ ۔"

پہلوان بے بسی سے اِن چاروں نو عمر لڑکوں کو دیکھ رہا تھا، جنھوں نے اِس کے اچھے بھلے کاروبار کا دیکھتے ہی دیکھتے بیڑہ غرق کر دیا تھا ۔

وہ چاروں ٹھیک ہی کہہ رہے تھے ۔ اب دو ہی راستے باقی رہ گئے تھے ۔

پہلوان خاموش بیٹھا سوچتا رہا، اس کے چہرے پر شکست کے آثار تھے "حق اسکواڈ" نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا ۔

وہ چاروں اُسے یونہی خاموش بیٹھا چھوڑ کر چلے گئے ۔

اگلی شام ان چاروں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا ۔

پہلوان کی دکان پر سیاہ رنگ کا ایک موٹا سا تالا لٹک رہا تھا ۔ ۔ ۔ ! پہلوان دکان بند کرکے جا چکا تھا ۔ ان چاروں کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی ۔ ۔ ۔ کامیابی کی مسکراہٹ ۔ ۔ ۔ بدی کو ختم کرنے کی جدوجُہد میں ایک اور فتح حاصل کرنے کی مُسکراہٹ ۔ ۔ ۔

شہریار دکان کے چبوترے پر چڑھ گیا، اس کے ساتھ ہی اس کے تینوں ساتھی ۔ ۔ ۔ سرفراز، ضیاء اور شہزاد بھی اُوپر چڑھ گئے ۔

شہریار نے چلّا کر کہا ۔ ۔ ۔ "حق اسکواڈ ۔ ۔ ۔" "زندہ باد ۔ ۔ ۔" اُن کا نعرہ دور تک گونجتا چلا گیا ۔

نیا سلسلے وار ناول

سیّد عبد العزیز عزمی

دوسری قسط

پناہ

حنیف، یاسمین اور ناہید بہن بھائی تھے۔ ان کے ابو رشید صاحب فوج میں میجر تھے اور وہ لوگ سرحد کے قریب ایک قصبے میں رہتے تھے۔ تینوں امی سے اجازت لے کر سیر کے لیے باہر گئے، اِدھر دُشمن فوجیوں نے قصبے پر حملہ کر دیا اور ان کے امی ابو کو قیدی بنا کرلے گئے۔ ان کے ابو کے ایک کیپٹن دوست نے تینوں کو ان کے رشتے کے چچا چچی کے پاس بھجوا دیا لیکن چچا چچی ان کا خیال رکھنے کے بجائے ان کے ساتھ نوکروں کا سا سلوک کرتے اور مارتے پیٹتے۔ وہیں ان کی ملاقات علی سے ہوئی وہ بھی ان کی طرح اپنے خالو کے ظلم کا شکار تھا ایک دن چاروں نے پروگرام بنایا کہ وہ پہاڑی کے اُس پار جزیرے میں رہنے جائیں گے۔

اب آگے پڑھیے

اِن کا اگلا سارا دن علی کے خُفیہ جزیرے کے متعلق سوچتے ہوئے گزرا۔" وہ واقعی بھاگ کر چھُپ سکتے ہیں۔ وہاں وہ کیسے رہیں گے۔ کھانے پینے کا کیا ہوگا۔؟ اگر لوگ انھیں ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تو کیا وہ پکڑے جائیں گے اور اگر وہ پکڑے گئے تو:" ان کے ننّھے ننّھے دماغ خطرات سے بھرے ہوئے تھے، مگر وہ ساتھ ساتھ منصوبے بھی بنا رہے تھے

خفیہ جزیرے کی آزادانہ زندگی کا تصور ہی اتنا ولولہ انگیز تھا کہ انھوں نے تمام خطرات کو بُھلا دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں جیسے بھی خطرات یا مشکلات پیش آئیں گی۔ وہ یہاں کی ڈانٹ ڈپٹ اور پٹائی سے حد درجہ بہتر ہوں گی۔

جُونہی انھیں اکٹھے ہونے کا موقع ملا وہ جزیرے کے متعلق باتیں کرنے لگے "حنیف بھائی، میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تو ضرور اُس خفیہ جزیرے میں جاؤں گی"۔ یاسمین نے اٹل لہجے میں کہا ....

"ہاں علی سے کہہ دو کہ ہم وہاں ضرور جائیں گے"۔ ناہید نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ حنیف خود وہاں جانا چاہتا تھا۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ وہاں آزادی تو ضرور ہوگی۔ مگر وہاں کی زندگی اتنی آسان نہ ہوگی۔ کیا یہ دونوں لڑکیاں وہاں کی زندگی کا ساتھ دے سکیں گی۔ وہاں تو سونے کے لیئے چارپائیاں بھی نہیں ہونگی ___ زمین پر سونا ہوگا۔ جنگلی پھل کھا کر پیٹ بھرنا ہوگا۔ لیکن اُسے علی کی ذہانت پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ ضرور اس کا کوئی حل نکالے گا۔ اور اگر وہاں کے حالات بے حد خراب ہوئے تو وہ وہاں سے واپس تو آ سکتے ہیں۔ یہ سب سوچنے کے بعد اس نے حتمی لہجے میں کہا "ٹھیک ہے، ہم وہاں ضرور جائیں گے"۔

چنانچہ اسی رات جب وہ علی سے ملے تو سر جوڑ کر منصوبے بنانے لگے کہ انھیں وہاں کن کن چیزوں کی ضرورت ہوگی کیا کیا تیاری کرنی ہوگی، ان سب کے چہرے تمتما رہے تھے۔ چمک رہے تھے۔ وہ ایک ولولہ انگیز مہم پر نکلنے والے تھے۔

"ہمیں سوچ سمجھ کر چلنا ہوگا"۔ علی نے کہنا شروع کیا "جو کچھ ہمیں ساتھ لے کر جانا ہوگا۔ وہ ایک ہی مرتبہ طے کرنا ہوگا کیونکہ اگر ہمیں وہاں کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو لازماً یہاں آنا پڑے گا اور یہ بات ہمارے لیئے خطرہ ہو سکتی ہے"۔

"میرے خیال میں تو یہ بہتر ہے کہ کیوں نہ ہم ایک مرتبہ جزیرے پر چلیں اور وہاں اندازہ لگائیں کہ ہمیں کن کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی"۔ ناہید نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں۔ یہ تجویز اچھی ہے۔ اس سے ہمیں اپنی ضروریات کی اشیاء کا بہتر طور پر اندازہ ہو جائے گا۔ ایسا کرتے ہیں ہم کسی دن اس جزیرے کی سیر کو چلتے ہیں"۔ علی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"مگر چچی تو ہمیں کبھی دن میں اِدھر اُدھر جانے کی اجازت نہیں دیں گی"۔ یاسمین نے پریشان ہو کر کہا۔

"مگر ہم جا سکتے ہیں۔ تم لوگوں کو یاد نہیں کہ چچی جان اپنے لیئے سونے کی زنجیر بنوانا چاہتی تھیں اور چچا نے اِنھیں اس اتوار کو شہر لے جانے کو کہا ہے۔ بس کام بن گیا۔ یہ لوگ صبح اتوار کو شہر جائیں گے، اور ہم اپنے خفیہ جزیرے کی سیر کریں گے"۔ حنیف نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم ضرور جائیں گے"۔ علی نے جواباً کہا۔

"مگر ہم وہاں پہنچیں گے کس طرح؟ بھئی ہم تو تیر بھی نہیں سکتے"۔ ناہید اور یاسمین نے اُلجھن آمیز لہجے سے کہا۔ اس بات پر حنیف بھی سوچ میں پڑ گیا کہ یہ لڑکیاں وہاں تک کس طرح تیر کر جائیں گی۔

"اس کا حل میرے پاس ہے۔ میرے پاس ایک پُرانی کشتی ہے۔ پچھلے سال خالو نے نئی کشتی لی تھی تو انھوں نے اس کو بےکار سمجھ کر پھینک دیا تھا، مگر میں نے اسے سنبھال کر رکھا اور اس کی مرمّت کر کے اُسے چلنے کے قابل بنا لیا ہے۔ میں نے سب سے پہلے اس کشتی میں سیر کرتے ہوئے جزیرہ دیکھا تھا اور پھر میں جزیرے کے اندر بھی گیا تھا۔ البتہ اس کشتی میں سوراخ ہے، مگر اس سے پانی اتنا زیادہ نہیں آتا ہے۔ ہم وہ پانی ساتھ ہی ساتھ نکال دیا کریں گے۔ بس ہم اُسی کشتی میں چلیں گے۔" علی نے کہا۔

"پھر تو مزہ آگیا۔ ہم ضرور اس کشتی میں سفر کریں گے۔" حنیف خوشی سے اُچھل پڑا۔ "بس تو پھر طے ہے، ہم اس اتوار کو ضرور اس جزیرے پر جائیں گے۔ اور ہاں چونکہ ہم وہاں تین چار گھنٹے گزاریں گے لہٰذا کچھ کھانے پینے کا بھی سامان لے لینا چاہیئے وہاں جزیرے میں کھائیں گے۔ علی نے کہا اور پھر وہ لوگ وہاں سے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ تینوں بچّوں سے وقت کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ انھوں نے باغ میں سے خوبانیاں اور آڑو بھی اکٹھے کر لیئے تھے۔ کھیتوں میں سے رات کو حنیف کھیرے ککڑی اور خربوزے توڑ لایا۔ اور یہ سب چیزیں انھوں نے اپنے کمرے میں چُھپا دی تھیں۔ حنیف کہا کرتا تھا کہ یہ سب چوری نہیں ہے۔ بلکہ ہم جتنا کام کرتے ہیں اتنا اگر نوکر کریں تو چچا جان کو بھاری تنخواہ ادا کرنی پڑے۔ ہم تو بغیر تنخواہ کے اتنا سب کچھ کرتے ہیں۔"

غرض کہ جو بھی ہاتھ لگا وہ جمع کر لیا۔ آخر خدا خدا کر کے اتوار آیا۔ چچا اور چچی شہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چچی نے حسبِ معمول انھیں تاکید کی کہ وہ گھر کے تمام باقی ماندہ کام کریں اور باہر گھومنے کے لیے جانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ تینوں بچّے سر جُھکائے ان کی باتیں سنتے رہے۔ جب یہ دونوں چلے گئے تو انھوں نے اپنے اپنے حصّے کی روٹیاں اور سبزی بھی لی، اور علی کے پاس جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ علی کے ہاتھ میں بھی ایک تھیلا تھا جس میں پھل اور گاجریں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ایک ڈبے میں مٹھائی بھی تھی۔ اس نے بتایا کہ "وہ آج دن بھر بابا فضلو کے کھیت میں کام کرتا رہا تو اس نے مجھے معاوضے کے طور پر یہ مٹھائی دی ہے، اور میں نے سوچا کہ جزیرے میں جا کر کھائیں گے۔"

"اچھا وہ کشتی کہاں ہے؟" حنیف نے بےچینی سے کہا

"اس کو میں نے اس طرح چُھپایا ہوا ہے کہ کسی کو بھی اس کا پتہ نہیں ہے۔ بس صرف تم تینوں کو پتہ چلے گا کہ کشتی کہاں ہے۔" علی نے کہا، اور انھیں لے کر ایک طرف چل دیا۔ تینوں بچّے بھی اس کے پیچھے چل دیئے۔ آخر علی ایک بڑی سی جھاڑی کے پاس رُکا اور اشارہ کر کے کہنے لگا کہ "میری کشتی اس جھاڑی میں چُھپی ہوئی ہے۔" چاروں بچّوں نے مل جل کر کشتی کو باہر نکالا۔ کشتی بالکل ٹھیک حالت میں تھی اور خاصی بڑی تھی۔ اس میں بارش کا پانی جمع تھا۔ علی نے سب کو بارش کا پانی نکالنے پر لگا دیا۔ حنیف دل میں کہنے لگا کہ "کاش علی مجھے بھی کشتی چلانے دے۔ مدّت ہوئی کشتی نہیں چلائی۔ پہلے ابو تھے تو وہ گھر کے سامنے والی جھیل میں ہر چھٹی کے دن کشتی چلاتے تھے۔ امّی ابو کا خیال آتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر اس نے انھیں

سب کی نظروں سے چھپا کر پونچھ لیئے۔ مگر علی نے اُسے روتے دیکھ لیا تھا۔ وہ خود بھی اُداس ہوگیا۔ آخر چاروں بچوّں نے مل کر کشتی کو جھیل میں گھسیٹ کر ڈال دیا۔

"چلو بھئی اب سب لوگ سوار ہو جاؤ"۔ علی نے کہا اُس کے لہجے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اس مہم کا کپتان ہو۔ "بھئی سفر لمبا ہے، حنیف تم بھی ایک چپّو لے لو۔ اس طرح ہم جلد ہی اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے"۔ علی نے کہا۔ حنیف تو اسی بات کا منتظر تھا۔ اس نے فوراً ہی دوسرا چپّو سنبھال لیا۔ دونوں لڑکوں نے پوری قوّت سے چپّو چلانا شروع کر دیئے۔ اس وقت بادل کا کوئی ٹکڑا سورج پر آیا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ ہوا بھی خوشگوار تھی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد انہیں اپنا جزیرہ نظر آنے لگا۔ اب وہ اس جزیرے کو دن کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ انہیں اپنی یہ پناہ گاہ جزیرہ نہایت بھَلا دکھائی دے رہا تھا۔

جُوں جُوں جزیرہ قریب آ رہا تھا' ان کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کب جزیرے پر پہنچیں گے۔ وہاں یقیناً رنگ برنگے پرندے ہوں گے۔ خرگوش اور گلہریاں بھی ہوں گی۔ پھولوں سے بھری ڈالیاں ہوں گی"۔ میرے خیال میں تو جزیرے میں اُترنے کے لیے یہ جگہ عُمدہ ہے"۔ علی کی آواز نے انہیں خواب سے جگا دیا"۔ یہاں بڑی صاف ستھری جگہ ہے۔ ہم کشتی کو کھینچ کر ریت پر چڑھا دیں گے"۔

یہاں واقعی ریت صاف ستھری ہے دونوں لڑکیوں نے دُور ہی سے چھلانگیں لگائیں اور ریت پر چلنے لگیں۔ حنیف اور علی نے کشتی کھینچ کر اوپر چڑھا دی اور جزیرے کے سب سے بڑے پہاڑ کی جانب دیکھ کر سکھ کا سانس لیا۔ ریت نے اس مقام کو ساحل کی جگہ دے رکھی تھی۔ مگر یہ ساحل نہایت صاف ستھرا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں کسی نے آج تک قدم نہ رکھا ہو۔ آس پاس کسی قسم کی گندگی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ البتہ کہیں کہیں خرگوش اور گلہریوں کے پنجوں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔

"ایسا کرتے ہیں کہ پہلے ہم اپنا سامان یہیں چھوڑ جاتے ہیں اور ذرا جزیرہ دیکھ لیتے ہیں"۔ علی نے کہا "ٹھیک ہے" تمام بچوّں نے یک زبان ہو کر کہا۔ پھر انھوں نے اپنا سامان وہیں رکھا اور گھنے درختوں کے اندر داخل ہو گئے۔ بید، شہتوت سفیدے اور چیڑ کے درختوں کے درمیان سے گزر کر وہ پہاڑی پر پہنچ گئے۔ پہاڑی پر بہت ڈھلوان تھی۔ چوٹی پر پہنچ کر انھوں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ دُور دُور تک جھیل ان کی نگاہوں کے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔

"اگر ہم یہاں رہنے لگیں تو"۔ علی نے کہنا شروع کیا"۔ یہ پہاڑی ہماری چوکی بن جائے گی۔ یہاں سے ہم اس جھیل کے ذریعے جزیرے کی طرف آنے والے تمام افراد کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اور اپنے بچاؤ کا بھی کوئی ذریعہ سوچ سکتے ہیں"۔

"ہاں اس طرح ہم محفوظ ہو جائیں گے اور کوئی اچانک ہمیں نہیں پکڑ سکے گا"۔ حنیف نے خوش ہوتے ہوئے کہا"۔ ہم

یہاں ضرور آئیں گے۔ ! ضرور آئیں گے۔!! یاسمین نے چلّا کر کہا" اُف ناہید باجی ذرا اس خرگوش کو تو دیکھیئے۔ کتنا خوبصورت ہے اور کتنی آزادی سے پھر رہا ہے۔ جیسے پالتو ہو" "اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں پہلے کسی انسان واسطہ نہیں پڑا ہے" حنیف نے سوچ کر کہا" ہاں میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہاں آج تک کوئی شخص نہیں آیا" علی بولا" مگر اس پہاڑی کے پیچھے کیا ہے؟" ناہید نے علی سے پوچھا۔

"اس پہاڑی کے دوسری جانب غار ہیں۔ اگر ہماری تلاش میں کوئی آیا تو ہم ان غاروں میں بھی چھُپ سکتے ہیں" علی نے جواب دیا۔ اب وہ پہاڑی کے دوسری جانب اُتر آئے۔ چاروں طرف ہری ہری سی گھاس بکھری ہوئی تھی۔ علی نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ ایک غار میں داخل ہو گئے۔ گرم دھوپ میں غار ائیر کنڈیشنر کی طرح ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔
"ہم ضرورت کے وقت یہاں چُھپ سکتے ہیں، اور یہاں ہماری ضروریات کی اشیاء بارش اور دُھوپ سے بھی محفوظ رہیں گی" علی نے کہا۔ یہ لوگ کچھ اور آگے گئے تو انھوں نے پانی کے بہنے کی آوازیں سنیں۔

"یہ کیسی آواز ہے؟" ناہید نے حیرت سے کہا۔

"ارے یہ تو چشمے کے بہنے کی آواز ہے" حنیف خوشی سے اُچھل پڑا۔

"ہاں یہاں ایک چشمہ بھی ہے، اور اس کا پانی نہایت صاف اور میٹھا ہے۔ پچھلی دفعہ جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے یہیں سے پانی پیا تھا۔ علی نے مسکرا کر کہا۔

پہاڑی کے دامن میں ایک گھنا جنگل تھا۔ اس میں موجود درختوں پر بیلیں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔
" یہ بیلیں انگور کی ہیں، جب یہ پک جائیں گی تو ہمارے کھانے کے کام آئیں گی۔ آگے چند درخت بادام اور سیب کے بھی ہیں اور شاید خوبانی اور اخروٹ کے بھی درخت ہوں" علی نے بتایا۔

"واہ مزہ آگیا۔ ہم ضرور اس جزیرے پر آئیں گے اور انشاءاللہ یہ ہماری آخری پناہ گاہ ثابت ہوگا" یاسمین نے کہا۔

"بھئی جزیرہ اتنا بڑا ہے کہ ہم آج کے مختصر دن میں اس کا جائزہ نہیں لے سکتے۔ ہم یہاں آئیں گے ضرور۔ اب تم لوگ بتاؤ کہ جزیرہ تمھیں پسند آیا۔ !!!" علی نے پوچھا۔

"بے حد پسند آیا ہے، ہمیں یہ جزیرہ" تینوں بچّوں نے ایک ساتھ کہا۔

"مگر علی ہم رہیں گے کہاں؟" ناہید بولی۔

"ہم لکڑی کا ایک گھر بنالیں گے" علی بولا "مجھے اس کی ترکیب آتی ہے اس میں ہم اپنی گرمیاں گزاریں گے، اور ویسے بھی جب سردیاں آئیں گی تو ہم غار میں بھی جا سکتے ہیں"

تینوں بچّوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، وہ سوچ رہے تھے کہ جب وہ اپنے ہاتھوں سے لکڑی کا گھر

بنائیں گے اور اس میں رہیں گے تو کتنا مزہ آئے گا۔

وہ خوش خوش واپس ساحل پر آئے۔ انھیں سخت بھوک لگ رہی تھی۔ جو کچھ بھی اپنے ساتھ لائے تھے انھوں نے وہ پیٹ بھر کر کھایا۔ آج کے کھانے کا تو کچھ اور ہی لطف تھا۔ ایک گلہری ان کے پاس آکر رُک گئی۔ وہ بھی شاید اُن نئے لوگوں کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی!! ناہید نے ایک روٹی کا ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا۔ وہ کُتر کُتر کر اُسے کھانے لگی۔

"میرا تو جی چاہتا ہے کہ بس یہیں رہ جاؤں اور واپس نہ جاؤں"۔ حنیف نے کہا۔

"بہر حال، اگر ہم یہاں آئے بھی تو کچھ عرصہ کے لیے تو ہمیں یہاں رہنا ہی پڑے گا۔ اب تو یہ سوچو کہ ہم یہاں کب آئیں"۔ علی نے کہا۔

"اور یہ بھی کہ ہمیں کیا کیا چیزیں لانی پڑیں گی" ناہید نے کہا۔

"ابھی تو ہمیں زیادہ اشیا کی ضرورت نہیں پڑے گی"۔ علی نے کہا۔ "رات کو سونے کے لیے ہم سوکھے گھاس کا بڑا اچھا سا بستر بنا سکتے ہیں۔ زیادہ ضرورت ہمیں گلاسوں، تھالیوں اور دیگچیوں کی پڑے گی۔ میرے پاس ایک شکاری چاقو ہے، اور ایک کلہاڑی بھی ہے۔ لکڑی کا گھر بناتے ہوئے ان کی ضرورت تو پڑے گی ہی"۔ علی نے کہا۔

"اور ہاں دیا سلائی کی بھی تو ضرورت پڑے گی۔ کیونکہ کھانا پکانے کے لیئے آگ جلانا تو لازمی ہوگا"۔ ناہید نے کہا۔

اور اس جھیل میں چونکہ مچھلیاں بھی ہیں۔ لہٰذا میں مچھلی پکڑنے کا کانٹا بھی لے آؤں گا"۔ حنیف نے کہا۔ جُوں جُوں سامان کی فہرست بنتی جارہی تھی، بچوں کا جوش و خروش اور اشتیاق بڑھتا جارہا تھا۔ آخر یہ طے پا گیا کہ کن کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ جھیل کے کنارے برگد کا ایک کھوکھلا درخت تھا۔ لہٰذا جس کے ہاتھ جو بھی چیز لگے وہ اس درخت کے کھوکھلے تنے میں چھپا دے۔ وہاں سے یہ چیزیں کشتی کے ذریعے جزیرے میں پہنچائی جائیں گی۔

"اب طے یہ کرنا ہے کہ ہمیں یہاں پر کب آجانا چاہیئے۔ میرے خیال میں تو اگلا اتوار ٹھیک ہے۔ کیا خیال ہے۔۔!!" علی نے پوچھا۔۔۔

"ٹھیک ہے۔۔! اگلا اتوار ہماری آزادی کا دن ہوگا" حنیف نے پُختہ عزم سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب ہم لوگوں کو واپس چلنا چاہیئے۔ وقت کافی ہو گیا ہے"۔ علی نے کہا۔ "حنیف تم چپّو چلاؤ۔ میں پانی نکالتا جاؤں گا اور ناہید اور یاسمین تم تمام چیزیں اکٹھی کر کے کشتی میں رکھّو"۔

"ٹھیک ہے کپتان صاحب"، یاسمین شرارت سے بولی۔ پھر وہ دونوں چیزیں اکٹھی کرنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی کشتی واپس جھیل میں سفر کر رہی تھی۔ وہ سب اگلے اتوار کے متعلق سوچ رہے تھے۔ ان کے ننھے ذہن اُمیدوں اور آرزوؤں سے بھرے ہوئے تھے۔

پورا ہفتہ تیاری میں گزرا۔ چچا اور چچی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر بچّوں کو ہو کیا گیا ہے۔ جو کسی بھی ڈانٹ اور مارپیٹ کو ہنسی خوشی برداشت کرنے لگے ہیں۔ اور تو اور یاسمین بھی اب بچّوں کی طرح نہیں روتی دھوتی تھی۔ انھوں نے اپنے چند کپڑوں کے جوڑے بھی کھوکھلے درخت کے تنے میں چھپا دیے تھے۔ حنیف چار گلاس دو تھالیاں اور ایک ڈونگا باورچی خانے سے اُڑا کر کھوکھلے درخت کے تنے میں پہنچا آیا تھا۔ یاسمین نے چچی کی ایک پرانی سی دری اُڑا کر وہیں پہنچا دی تھی۔

ناہید ایک فرائی پین اور ایک دیگچی بھی وہاں چھوڑ آئی تھی۔

جب چچی نے ان چیزوں کو باورچی خانے سے غائب پایا تو وہ ناہید پر بے حد برسی تھیں۔!! ادھر علی نے ایک دیگچی، ایک کلہاڑی اور ایک شکاری چاقو اور چھ چمچے بھی کہیں سے پیدا کر لیے تھے۔ "کیا کہیں سے خالی کنستر یا ڈبّے مل سکتے ہیں۔؟" علی نے ایک روز حنیف سے پوچھا "ہمیں کھانے پینے اور پکانے کی چیزیں رکھنے کے لیے اُن کی ضرورت پڑے گی۔۔۔"

"ہاں چچا کے پاس باغ کے اسٹور میں بہت سے خالی ڈبّے پڑے ہیں" حنیف نے کہا "میں ان میں سے کچھ کو صاف کر کے لے آؤں گا۔"

"ہاں یاد آیا۔ مجھے خالو نے کل کچھ پیسے دیے تھے۔ میں نے ان کی دالیں چینی وغیرہ بھی خرید لی ہے اور ہاں تم بتاؤ کیا کہیں سے ماچس مل جائے گی؟" علی نے پوچھا۔

"بھئی چچی بڑی کنجوس ہیں" حنیف نے کہا "وہ صرف ہمیں استعمال کے لیے ماچس دیتی ہیں، پھر بھی ہم اس سے کچھ تیلیاں علیحدہ کر لیں گے۔۔۔"

"خیر میں بھی کچھ انتظام کر لوں گا۔ ویسے بھی یہ دیکھو میرے پاس کیا ہے" علی نے جیب میں سے ایک گول شیشہ نکال کر دکھایا "اسے اگر سورج کے سامنے رکھیں اور اس کی شعاعیں کاغذ پر ڈالیں تو وہ آگ پکڑ لیتا ہے۔ ہم اس سے بھی کام لے سکتے ہیں۔"

"اور ہاں، چچا کے اسٹور میں مَیں نے کیلیں اور کُنڈیاں بھی دیکھی ہیں۔ اُن کی بھی ہمیں ضرورت پڑے گی" حنیف نے کہا "ہاں گھر بناتے ہوئے ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی اور اگر کبھی کشتی خراب ہو گئی تو یہ پھر بھی ہمارے کام آئے گی" علی بولا "کاش اتوار جلد آجائے۔" یاسمین بولی۔ "میرے پاس ہماری پرانی لڈو بڑی ہے اور حنیف کے پاس اُس کی شطرنج بھی ہے" ناہید نے کہا "اور ہاں، ہم اپنی کتابیں بھی لے جائیں گے۔ تاکہ وہاں پڑھائی بھی کرتے رہیں اور ہمیں غافل نہیں ہونا چاہیے"

"ہاں وہاں جا کر میں تم سے پڑھوں گا۔ مجھے پڑھنے کا بڑا شوق ہے" علی نے فوراً کہا۔

اب پُرانا کھوکھلا درخت طرح طرح کی چیزوں سے بھر چکا تھا۔ آخر خدا خدا کرکے اتوار کا دن آیا۔ بچے چچا چچی کے جاگنے سے پہلے ہی جاگ گئے۔ حنیف اور ناہید جلدی جلدی باغ میں گئے اور سبزیاں توڑ کر ٹوکری میں بھر لیں۔ بہت سی ہری مرچیں بھی لے لیں۔ پھر مرغیوں کے ڈبے سے چھ انڈے بھی نکال لیے۔ یاسمین باورچی خانے میں گھس گئی۔ وہاں اس نے پہلے سے لفافوں میں نمک، مصالحہ، چینی اور دوسری چیزیں بھر لیں۔ حنیف نے اوزاروں کا ڈبّہ اٹھا لیا، ناہید نے ٹوکری تھام لی، یاسمین کے ہاتھوں میں مسالے کی ٹوکری تھی۔ اچانک حنیف کو آٹے کا خیال آیا اُس نے ایک بڑے سے تھیلے میں آٹا بھر لیا۔ اب وہ جانے کے لیے تیار تھے۔ جھیل کے کنارے جب وہ پہنچے تو علی وہاں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی جیبیں خوبانیوں اور بادام سے بھری ہوئی تھیں۔

"تو تم لوگ پہنچ ہی گئے!! علی نے کہا۔" میں ایک بڑا رسّہ اور ترپال بھی لے آیا ہوں۔"

"اور ہم صابن اور گھی بھی لے آئے ہیں۔" ناہید نے کہا۔

"بہت خوب گھی کا تو مجھے بالکل خیال بھی نہیں رہا تھا۔ ٹھیک ہے کیا خیال ہے اب چلا جائے۔" علی تینوں بچّوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں اب ہم چلنے کے لیئے تیار ہیں۔" تینوں بچّوں نے ایک ساتھ کہا۔

"تو پھر اب ہمیں تمام سامان درخت سے نکال کر کشتی میں پہنچانا ہے۔" علی نے کہا۔ تھوڑی دیر ہی میں تمام درخت کا سامان تینے سے کشتی میں پہنچ چکا تھا۔ خوش قسمتی سے کشتی خاصی بڑی تھی۔ ورنہ اتنی بہت سی چیزیں اس میں کیسے سماتیں بس ذرا پیندے میں پانی بھر جاتا تھا۔ اس کا کیا تھا۔ دونوں لڑکیوں نے ٹین کے ڈبّے سے پانی نکال دینے کا انتظام کر لیا تھا۔ آخر روانگی کا وقت آ پہنچا۔ علی نے جھیل کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھا کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ پھر کہا۔ "چلو بچّو! اب سوار ہو جاؤ۔!! پھر چاروں بچّے سوار ہو گئے۔! حنیف اور علی نے چپّو سنبھال لیے اور لڑکیوں نے پانی نکالنے کے لیے ڈبّے سنبھال لیے۔ سامان کی وجہ سے کشتی کچھ بوجھل تھی۔ دونوں لڑکے پوری قوت سے چپّو چلا رہے تھے۔ جب کشتی ذرا گہرے پانی میں پہنچ گئی۔ تو وہ ذرا دم لینے کے لیے رُک گئے۔ اب زور سے چپّو لگانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لڑکیاں پانی نکالنے میں مصروف تھیں۔ یاسمین سوچ رہی تھی کہ نہ جانے ہمیں وہاں کیسے رہنا پڑے۔ گھاس کا بستر کیسا ہو گا۔

آخر وہ بولی "اُف ہمیں کتنی آزادی ہوگی۔! کوئی ہمیں ڈانٹنے والا بھی نہیں ہو گا۔! حنیف اپنی بہن کو خوش دیکھ کر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اُسے علی کے ساتھ اپنی دوستی پر فخر محسوس ہونے لگا۔ ابھی جزیرہ بہت دُور تھا۔ اس جزیرے کا کوئی نام نہیں تھا۔! ہوتا بھی کیسے وہ تو ان کا خفیہ جزیرہ تھا۔ علی اور حنیف مُسلسل چپّو چلا رہے تھے اِن کی نظریں مسلسل جزیرے کے سامنے ٹکی ہوئی تھیں۔ آخر کشتی جزیرے کے ساحل سے آ لگی۔ علی نے ایک جھُنڈ کے قریب کشتی کھڑی کر لی اور پھر یہ لوگ جزیرے پر آ گئے۔

"ہم پہنچ گئے ۔! ہم پہنچ گئے ۔!! اب ہم آزاد ہیں ۔!!! اب ہم یہیں رہیں گے ۔!!!!" یاسمین خوشی سے ناچنے لگی ۔

"اِدھر آؤ ۔ یاسمین پہلے تم یہ سب سامان کشتی سے جزیرے پر پہنچانے میں ہماری مدد کرو، ابھی ہمیں بہت کام کرنا ہے چلو جلدی سے ۔" علی نے حکم دیا ۔ گویا اب وہ اس ننھے خاندان کا سربراہ تھا ۔

ابھی تو وقتی طور پر سامان بید کے درختوں کے نیچے رکھ دیا گیا تھا ۔ اتنے میں بچّوں کو بھوک نے ستانا شروع کر دیا تھا اور انھیں پیاس بھی سخت لگ رہی تھی ۔

"ہائے پانی ۔!" حنیف مذاق میں چیخا ۔ "ناہید تم جاؤ اور اُسی چشمے سے پانی بھر لاؤ ۔ پھر ہم سب کھانا کھائیں گے" علی نے کہا ۔ ناہید نے ایک دیگچی لی اور پہاڑی پر چڑھ گئی ۔ پہاڑی کے دوسری طرف چشمہ تھا ۔ اُس نے چشمے سے پانی بھرا ۔ اور دیگچی واپس اٹھا کر لے آئی ۔ حنیف اور یاسمین نے اس عرصے میں درخت کے نیچے دسترخوان بچھا دیا تھا ۔ ۔ چار روٹیاں ، پانچ گاجریں ، چار کھیرے ، ایک تھالی میں تھوڑی مٹھائی ۔ کتنا عمدہ کھانا تھا ان کا ۔ جُونہی ناہید پانی کی دیگچی لے کر وہاں پہنچی تو حنیف نے سب سے پہلے اپنا گلاس پانی کے لیے بڑھایا : "ہائے پانی سب سے پہلے مجھے دو" جانے وہ کتنے عرصے کے بعد سچے دل سے ہنس رہا تھا ۔

کتنا مزیدار کھانا تھا ، اور کتنی ہنسی خوشی کھایا گیا تھا ۔ بات بات پر ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے تھے ۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں سو گئے تھے ، نہ جانے کب تک بے سُدھ سوتے رہے تھے ۔ سب سے پہلے علی جاگا ۔ وہ آنکھیں مَل کر کھڑا ہو گیا اور ان تینوں کو سوتا دیکھ کر بولا ۔ "نہیں بھئی ایسے کام نہیں چلے گا" یہ کہہ کر اس نے اِن تینوں کو جگایا اور بولا : "دیکھو ابھی ہمیں بہت کام کرنے ہیں ۔ سب سے پہلے تو رات کو سونے کے لیے ہمیں کوئی بھلی سی جگہ بھی ڈھونڈنی چاہیے اور بستر بنانے کے لیے گھاس بھی اکٹھی کرنی ہے ۔"

کام کرنا جو پہلے بُرا لگتا تھا اب اس جزیرے میں اچھّا لگ رہا تھا ۔ ناہید اور یاسمین نے سب سے پہلے برتن مانجھے ۔ اور انھیں جھیل کے پانی میں دھو کر دھوپ میں رکھ دیے ۔ لڑکوں نے سارے سامان کو ایک جگہ ترتیب دے کر رکھا اور ان پر ترپال ڈال دیا ۔ علی نے کہا " اگر بارش بھی ہو جائے تو پھر بھی ہمارا سامان محفوظ رہے گا ۔"

"گھر کب بنائیں گے ؟" یاسمین نے پوچھا "کل بنائیں گے ۔ اب سونے کے لیے ہمیں کوئی اچھی جگہ ڈھونڈ لینی چاہیے" علی نے کہا ۔

"آہا ۔ آہا آج ہم اپنے پیارے جزیرے میں سوئیں گے ۔" یاسمین خوشی سے بولی ۔

"ہاں یہ ہماری آزادی کی پہلی رات ہو گی ۔" حنیف نے کہا ۔

- بچّوں نے جزیرے میں پہلی رات کیسے گزاری ۔ ۔ ؟
- انھوں نے اپنا رہنے کا گھر کیسے بنایا ؟؟

(اگلی قسط میں پڑھئے)

نسیمِ سحر

برف کے بغیر اسکیٹنگ

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ کیا برف کے بغیر اسکیٹنگ کی جا سکتی ہے ؛ تو آپ کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ اسکیٹنگ شدید سردی اور برفباری کے موسم میں ان پہاڑی علاقوں میں کی جاتی ہے جہاں خوب برفباری ہوتی ہے، لیکن نیویارک میں اسکیٹنگ کے شوقین نوجوانوں نے اس مقولے کو سچ کر دکھایا ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" اور "شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا"۔ پندرہ سالہ کیل گلبرٹسن اور دیگر ساتھی شدید گرمی کے موسم میں جبکہ برف کا دُور دُور نام و نشان نہیں ہوتا، نہ صرف اسکیٹنگ کرتے ہیں بلکہ لوہے اور لکڑی کے بنے ہوئے مصنوعی پلیٹ فارموں سے ہوا میں چھلانگیں لگانے کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ وہ برف کے متبادل کے طور پر "پلاسٹک میٹنگز" استعمال کرتے ہیں۔

اسکیٹنگ کے متوالوں کی تو یقیناً یہی خواہش ہوتی ہے کہ سارا سال ہی برف پڑتی رہے اور وہ اپنے محبوب مشغلے میں مصروف رہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر اسکیٹنگ ہی ہو سکتی ہے کوئی اور کام تو ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ برفباری میں کاروبارِ زندگی معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔

نیویارک میں لیک پلیسڈ کے اولمپک اسکائی جمپ کمپلیکس میں زیرِ تربیت نوجوانوں کے ذہن میں پہلی بار برف کے متبادل کے طور پر پلاسٹک میٹنگز استعمال کرنے کا خیال آیا اور اس خیال کو سوچ بچار کے بعد اس طرح عملی جامہ پہنایا گیا کہ اب یہ کھیل اصلی برف پر پھسلنے سے زیادہ دلچسپ ہو گیا ہے۔ اس دلچسپ کھیل میں پلیٹ فارم سے چھلانگ لگاتے وقت بدن کو ہوا کے رُخ اور دباؤ کے مطابق متوازن رکھنا پڑتا ہے اور زمین پر پہنچتے ہی انتہائی تیزی کے ساتھ مصنوعی برف پر پھسلنے کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے۔

پلاسٹک میٹنگز کی شکل بالکل ان وائپرز جیسی ہوتی ہے جو عام طور پر گھروں اور دفتروں میں فرش صاف کرنے کے کام آتے ہیں بس ان کے ساتھ لمبے سے ڈنڈے کی کسر ہوتی ہے۔ پلاسٹک کے لمبے لمبے ریشمی نما ریشوں سے تیار کردہ ان "میٹنگز" کو ترتیب سے اس طرح زمین پر بچھا دیا جاتا ہے کہ ہر "میٹنگ" پر دوسری میٹنگ کا کچھ حصہ موجود ہوتا ہے جو پھسلنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

زمین سے کئی فٹ اونچی پھسلواں ڈھلان سے زمین پر بچھی ہوئی مصنوعی برف تک پہنچنے میں اسکائرز کو کئی سیکنڈ تک ہوا میں معلق رہنا پڑتا ہے اور یہی اس کھیل کے سب سے خطرناک اور سنسنی خیز لمحات ہوتے ہیں۔ ذرا سی غفلت یا بے احتیاطی کھلاڑی کو نیچے کی بجائے عالمِ بالا میں بھی پہنچا سکتی ہے۔ جی دار اسکائرز قلابازیاں کھاتے اور مختلف کرتب دکھاتے ہوئے مصنوعی برف تک پہنچتے ہیں جس کے فوراً بعد وہ تیر کی تیزی سے مصنوعی برف پر پھسلتے ہوئے برف کے بغیر اسکیٹنگ کا لطف اٹھاتے ہیں۔ امریکی نوجوانوں میں یہ کھیل تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔

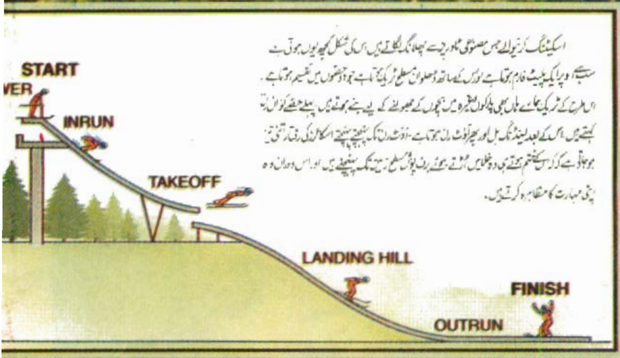

اسکیٹنگ کرنے والے جس مصنوعی ٹاور سے چھلانگ لگاتے ہیں اس کی شکل کچھ یوں ہوتی ہے سب سے اوپر ایک پلیٹ فارم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ڈھلوان سطح ٹریک ہوتا ہے جو دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس طرح کے ٹریک جہاں بھی پہاڑوں وغیرہ میں بچوں کے جھولنے کے لیے بنے ہوتے ہیں۔ پہلے حصے کو ان رن کہتے ہیں۔ اس کے بعد لینڈنگ ہل اور پھر آؤٹ رن ہوتا ہے۔ ٹیک آف تک پہنچتے پہنچتے اسکائر کی رفتار اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اس کے ختم ہوتے ہی وہ خلا میں اڑتے ہوئے برف پوش سطح زمین تک پہنچتے ہیں اور اس دوران وہ اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ویلکم کی کوپیکس
اینٹی لائس لوشن
جُوئیں ایک بچّے سے دوسرے بچّے اور بڑوں میں منتقل ہوجاتی ہیں۔ خون چُوستی ہیں اور بچّوں کی ذہنی نشوونما پر اثرانداز ہوتی ہیں :
جوؤں سے موثر نجات کیلئے
کوپیکس اینٹی لائس لوشن
کوپیکس ڈی۔ڈی۔ٹی ، بی ایچ سی اور میلاتھیان سے پاک ہے۔
کوپیکس لوشن میں جدید تحقیق پر مبنی کیڑے مار دوا پرمیتھرین شامل ہے جو سَر کی جوؤں اور لیکھوں کے خاتمہ کے لئے نہایت موثر ہے۔
COOPEX
ANTI-LICE LOTION
Wellcome Insecticides Division.
TRANSWORLD

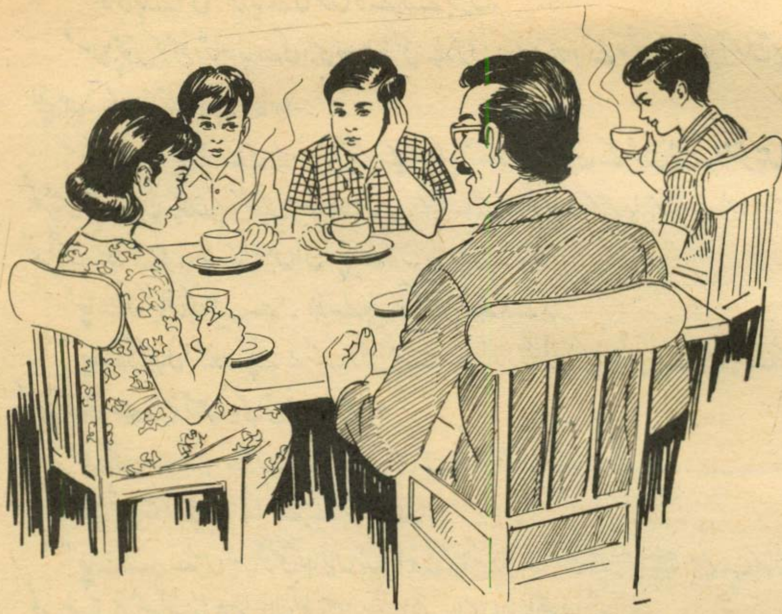

چائے کی داستان

عطا محمد تبسم

"امّی چائے"۔ مونا نے لان میں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

"ذرا صبر کرو۔ ابھی لاتی ہوں" امّی نے کچن کی کھڑکی سے جواب دیا۔ لیکن مونا، ہما اور صبا نے مل کر "چائے، چائے" کی گردان شروع کردی۔ "ارے بھائی آپ لوگوں نے اس قدر شور کیوں مچار کھا ہے"۔ ابّو نے لان کی جانب آتے ہوئے بچّوں کو ہلکے سے ڈانٹ پلائی۔ بچے خاموش ہوگئے۔ لیکن ہما نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ "امی چائے نہیں لا رہی ہیں"۔

" لو بھئی چائے آگئی" امی چائے کی ٹرالی لاتے ہوئے بولیں۔

" ان بچوں کو صبح و شام چائے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ ذرا دیر سویر ہو جائے تو شور مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں:" امی نے شکایتی لہجے میں کہا۔

" ارے بیگم۔ چائے ہے ہی ایسی چیز کہ کیا بچے اور کیا بڑے سب ہی اس کے شیدائی ہیں۔ دفتر میں، گھر میں، ہوٹل میں، پکنک پر، سفر میں، تقریبات میں، میٹنگ میں ہر جگہ چائے کا چرچا ہوتا ہے۔ ذرا دیر ہو جائے تو لوگ کہنے لگتے ہیں، چائے نہیں آئی۔ چائے میں کیا دیر ہے۔؟"

" چائے کی کہانی بھی عجیب ہے"۔ ابو نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

" چائے کی کہانی" تینوں بچوں نے بیک وقت حیرت سے آواز لگائی۔" کیا واقعی چائے کے بارے میں کوئی کہانی ہے۔ ابو ہمیں یہ کہانی ضرور سنائیں۔"

" ہاں بھئی چائے کے بارے میں بڑے مزے کی باتیں ہیں۔ جو ہم آج آپ کو بتائیں گے"۔

" بس شروع کر دیجئے"۔ ہما نے بے صبری سے کہا۔

" چائے کے بارے میں یوں تو کئی کہانیاں ہیں" ابو نے کہنا شروع کیا۔" ان میں سب سے دلچسپ کہانی چین کی ہے۔ آج سے تقریباً ۵ ہزار سال قبل چین پر شین ننگ نامی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔

یہ بادشاہ پانی کو اُبال کر پیتا تھا۔ ایک دن اس کے اُبلتے ہوئے پانی میں ہوا سے چند پتے اُڑ کر گر پڑے بادشاہ کو جب یہ پانی پیش کیا گیا تو اُسے اس پانی کا ذائقہ اچھا لگا۔ اس نے خادموں کو حکم دیا کہ پانی میں جو پتے گرے ہیں، وہ پیش کئے جائیں۔ اور یوں چائے کے یہ پتے چین میں مشہور ہو گئے"۔ ابو ایک لمحے کے لئے رُکے اور پھر بولے۔

" چائے کی دوسری مشہور کہانی کا تعلق برصغیر پاک و ہند سے ہے۔ برسہا برس قبل ایک سادھو درما نے سات برس تک مسلسل جاگنے کا ارادہ کیا۔ پانچ برس تک تو وہ مسلسل جاگتا رہا۔ لیکن چھٹے برس اسے نیند آنا شروع ہو گئی۔ اس نے نیند کو بھگانے کے لئے جنگل میں درختوں سے پتے توڑ کر چبانے شروع کر دیئے"۔

" پتے"۔ بچوں نے حیرت سے پوچھا۔

" ہاں بھئی۔ پتے۔ اور جانتے ہو کیا ہوا۔ ان پتوں نے اس سادھو کو مزید ۲ برس تک جاگنے میں مدد دی"۔

" یہ یقیناً چائے کے پتے ہوں گے"۔ مونا نے رائے دی۔

" ہاں بھئی تمہارا اندازہ درست ہے" یہ چائے کے پتے ہی تھے۔

چائے کو اُبال کر پیالیوں میں پینے کا رواج بھی چین ہی سے شروع ہوا۔ وہاں چائے کثرت سے پیدا ہوتی تھی۔ چائے کا ذائقہ انہیں پسند تھا۔ اور وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ چائے انہیں تازہ دم کر دیتی ہے۔"

"چائے ساری دنیا میں کیسے پھیل گئی"۔ ہما نے پوچھا۔

" بھئی چائے کے تاجروں نے ۸۰۰ قبل مسیح میں ایک صحافی یوچو سے چائے کے بارے میں ایک کتاب لکھوائی اور اس میں چائے کی خوب تعریف لکھی گئی اس کتاب کے ذریعے چائے ساری دنیا میں پھیل گئی۔

جاپان کے شہنشاہ کو چائے کی خصوصیت کا علم ہوا تو اس نے چائے کے پودے اور بیج منگوا کر اپنے ملک میں چائے کی کاشت کرائی اور یوں چائے جاپانیوں کے ملک میں بڑی اہمیت کی حامل ہو گئی۔

اُس وقت سے جاپان کے لوگ چائے کے لئے خصوصی تقریب کرتے ہیں اور ان کے چائے بنانے اور پینے کا سب سے منفرد طریقہ ہے۔

یورپ کے لوگوں نے ۱۵۹۹ عیسوی میں چائے کے بارے میں ایک کتاب میں پڑھا۔ ۵۰ سال بعد چائے سے لدا ہوا ایک جہاز ہالینڈ پہنچا اور چائے یورپ میں پھیل گئی۔ چند سال بعد ایک پُر خطر اور مشکل سفر کے نتیجے میں چائے روس بھی پہنچ گئی۔ انگلینڈ میں چائے ۱۶۵۰ء میں پہنچی۔ اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ابتدا میں چائے وہاں بہت مہنگی تھی اور صرف امیر افراد ہی چائے پیتے تھے۔"

" ابو کیا اس وقت چائے میں دودھ بھی ڈالا جاتا تھا۔" مونا نے سوال کیا۔

" ارے نہیں بھئی۔ چائے میں دودھ کا استعمال سب سے پہلے فرانس میں شروع ہوا۔ جہاں ۱۶۸۰ء میں سب سے پہلے چائے میں دودھ استعمال کیا جانے لگا۔

امریکہ میں چائے پر ٹیکس بھی عائد کیا گیا۔ لیکن امریکیوں نے اس فیصلے کو تسلیم نہ کیا اور بڑی تعداد میں چائے سمندر میں بہا دی گئی۔

چائے میدان جنگ میں بھی اہمیت کی حامل رہی جب نپولین کے خلاف نیلین اور ڈیوک آف ویلینگٹن جنگ لڑ رہے تھے تو انہوں نے فوج کے سپاہیوں کے لئے میدان جنگ میں چائے کی فراہمی کے خصوصی اقدامات کئے۔ ڈیوک تو چائے کا بے حد رسیا تھا۔ اس نے چائے پینے کے لئے چاندی کا کپ بنوایا ہوا تھا جو وہ ہر وقت ساتھ رکھتا تھا۔"

" ابو یہ بتائیں کہ شام کی چائے کا رواج کیسے پڑا۔"

ابو نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

" یورپ والوں نے ۱۸۲۵ء میں "شام کی چائے" کا سلسلہ شروع کیا اور اس وقت کی چائے کے ساتھ انہوں نے مکھن، کیک،

بسکٹ اور اسنیک کا سلسلہ بھی شروع کیا اور جلد ہی "شام کی چائے" پورے یورپ میں مقبول ہوگئی۔"

"چائے کیسے بنتی ہے؟"

ہما نے ایک اور سوال جڑ دیا۔

"چائے یوں تو پوری دنیا میں پیدا ہوتی ہے۔ تاہم بہترین چائے بلند مقامات پر پیدا ہوتی ہے جہاں آب و ہوا ٹھنڈی اور مرطوب ہوتی ہے۔

چائے کے پودے پہلے نرسری میں لگائے جاتے ہیں۔ انہیں جھونپڑوں میں ڈھانپ کر رکھا جاتا ہے۔ جب یہ پودے بڑے ہوجاتے ہیں۔ تو انہیں زمین میں لگایا جاتا ہے۔ ان چائے کے پودوں کے تیار ہونے میں پانچ سال کا عرصہ لگتا ہے۔ ایک چائے کا پودا تقریباً ۵۰ فٹ اونچے درخت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

جب چائے تیار ہوجاتی ہے تو ان باغات سے چائے کی پتیاں چن لی جاتی ہیں۔ یہ پتیاں فیکٹری میں لائی جاتی ہیں۔ جہاں انہیں گرم ہوا کے ذریعے خشک کیا جاتا ہے۔ پھر ایک رولنگ مشین ان پتوں کو باریک کردیتی ہے۔ چائے کے پتے ہرے سے بتدریج کتھئی رنگ اختیار کرلیتے ہیں۔

چائے کی پتی کی کئی اقسام ہیں۔

تاہم گرین چائے اور بلیک ٹی دو مشہور اقسام ہیں۔ چائے کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے اس میں مختلف ذائقے اور خوشبوجات بھی شامل کی جاتی ہیں۔ اس کام میں بڑی بڑی مشینوں کی مدد لی جاتی ہے۔

پھر یہ چائے مختلف پیکنگ میں ڈال کر بازار میں لے آئی جاتی ہے۔ چائے کی فروخت نیلام کے ذریعے ہوتی ہے اور تاجر حضرات بہترین چائے کی خریداری کے لئے بڑھ چڑھ کر بولیاں دیتے ہیں۔

جو چائے ہم پیتے ہیں ان کے ذائقے کو فروخت سے قبل چکھا بھی جاتا ہے۔

"ابو چائے چھوٹے چھوٹے پیکٹوں میں بھی تو آتی ہے۔؟"

"ہاں بھئی۔ چائے اب "ٹی بیگ" کی شکل میں آتی ہے۔ یہ بھی اتفاقیہ واقعہ ہے۔ ایک چینی تاجر نے چائے کے کچھ نمونے اپنے ایک دوست کو ملک کے تھیلوں میں بھر کر بھیجی اور پھر اس انداز پر "ٹی بیگ" مارکیٹ میں آنا شروع ہوگئے۔

یہ ہے بھئی چائے کی کہانی۔

ابو بولتے بولتے جیسے تھک گئے تھے۔

"کہانی ختم۔ چائے ہضم۔"

سب بچوں نے مل کر نعرہ لگایا۔

●●●

کون سا جانور تیز دوڑتا ہے

سیّد احمد ابو عاکف

شاید کبھی آپ کو ٹی وی پر جانوروں کی کوئی فلم دیکھتے ہوئے یہ خیال آیا ہو کہ کونسا جانور سب سے تیز دوڑتا ہے بظاہر اس سوال کا جواب آسان لگتا ہے مگر سچ پوچھئے تو یہ بہت مشکل سوال ہے اس مشکل کی پہلی وجہ یہ ہے کہ شاید ہی کبھی کسی شخص نے کسی دوسرے آدمی یا کسی جانور کی رفتار کسی خاص لمحے میں (جب رفتار سب سے تیز رہی ہو) اچھے آلات کی مدد سے دُرست طریقے سے ناپی ہو۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اس سوال کے ساتھ ایک شرط بھی عائد کرنی پڑے گی یا ایک اور سوال پوچھنا پڑے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ تیز ترین رفتار کتنے فاصلے پر ناپی جا رہی ہے اور کتنی دیر تک ناپی جا رہی ہے مثلاً ایک اچھا کھلاڑی جو کسی بین الاقوامی مقابلے میں سو میٹر کی دوڑ جیت چکا ہو اور اگر اس نے یہ فاصلہ دس سیکنڈ میں طے کیا ہو تو اس کی اوسط رفتار دس میٹر فی سیکنڈ رہی یعنی ایک منٹ میں چھ سو میٹر یا تقریباً ۳۶ کلو میٹر فی گھنٹہ۔ ہاں اگر یہی کھلاڑی ایک کلو میٹر کی دوڑ میں حِصّہ لے کر اسے جیتا ہو تو یہ فاصلہ دو منٹ دس سیکنڈ کے بین الاقوامی

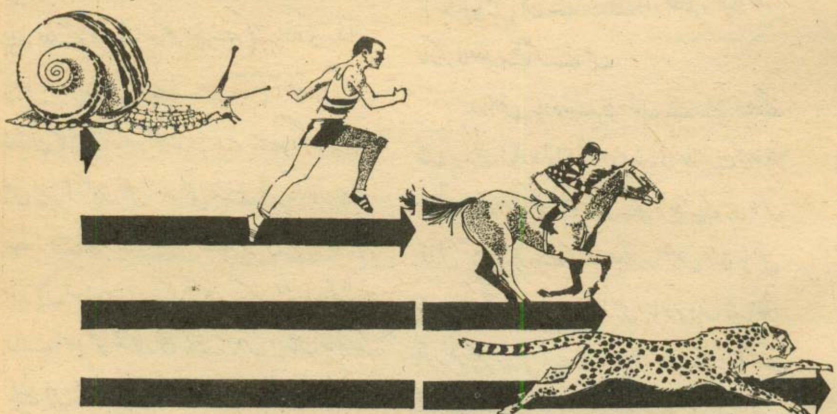

ریکارڈ سے کم میں طے نہیں ہوا ہوگا۔ یوں ایک کلومیٹر کے فاصلے پر اچھے کھلاڑی کی اوسط رفتار ۲۷ ۱/۲ کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اب اگر کوئی کھلاڑی چھبیس (۲۶) میل کے اصل میراتھون ریس میں جیت چکا ہو تو موجودہ بہترین وقت (ریکارڈ) کے لحاظ سے یہ فاصلہ دو گھنٹے دس منٹ سے زیادہ میں طے کیا گیا ہوگا یوں اس بہترین میراتھون دوڑ کے کھلاڑی کی اوسط رفتار انیس ۱۹ کلومیٹر فی گھنٹہ ہوئی۔ یہ تو ہوئی انسانوں کی رفتار جو دوڑ کے فاصلے اور دورانیے کے لحاظ سے کم یا زیادہ ہو جاتی ہے جانوروں میں بھی سفر کے فاصلہ اور وقت کے لحاظ سے رفتار کم یا زیادہ ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چیتا سب سے تیز زمینی جانور ہے (تقریباً ایک کلومیٹر کے محدود فاصلوں پر جیسا کہ شکار کے دوران دیکھا جاتا ہے) ہے۔ چیتے بھاگتے ہوئے سو کلومیٹر سے کچھ زیادہ کی رفتار حاصل کر لیتے ہیں۔ چیتے سے ملتا جلتا بلیوں کے خاندان کا ایک اور جانور تیندوا ہے جسے انگریزی میں لیپرڈ کہتے ہیں یہ بھی بہت تیز رفتار ہوتا ہے۔ اس کی رفتار چیتے سے کچھ ہی کم ہوتی ہے اور یوں تیندوے کے شکار کے لئے پالے جانے والے خصوصی شکاری کتے جنہیں افغان ہاؤنڈ کہتے ہیں بھی تقریباً سو کلومیٹر کی رفتار سے تھوڑے فاصلے تک دوڑ سکتے ہیں۔ پاکستان سمیت بہت سے ملکوں میں لوگ گرے ہاؤنڈ نامی کتوں کو دوڑ لگوانے کے لئے پالتے ہیں شاید آپ لوگوں میں بھی کسی نے لاہور کے میلۂ مویشیاں میں ایسے کتوں کی دوڑ دیکھی ہو۔

یہ گرے ہاؤنڈ بھی بہت تیز رفتار ہوتے ہیں مگر اکثر افغان ہاؤنڈ انہیں ایک میل (ڈیڑھ کلومیٹر سے کچھ زیادہ) کی دوڑ میں ہرا دیتے ہیں۔ بات ہو رہی ہے جانوروں کی دوڑ کی تو اصل دوڑ تو گھوڑوں کی ہوتی ہے۔ اچھے ریس کے گھوڑے تیز چال یا گیلپ میں ۶۵ سے ۷۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار تک بھاگتے ہیں اور زیادہ فاصلوں کے لئے زمین پر سب سے تیز رفتار جانور یہی ہیں ریس کے میدان کے باہر ہرن کی نسل کے جانور بہت تیز بھاگتے ہیں مگر بھاگنے سے زیادہ یہ اور آسٹریلیا میں ان کے رشتے دار کینگرو چھلانگیں مار کر فاصلہ طے کرتے ہیں۔

دراصل زیادہ لمبے فاصلوں کے لئے بھاگنے میں بہت زیادہ توانائی اور جسمانی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور کچھ جانوروں کے ڈھانچے ہی اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ بھاگ سکیں مثلاً ہاتھی یا دریائی گھوڑے وغیرہ۔ زمینی جانوروں میں عام طور پر کچھوؤں کو بہت سست رفتار سمجھا جاتا ہے مگر کچھوے اکثر ایک سے دو کلومیٹر فی گھنٹہ تک

چل لیتے ہیں ان کے مقابلے میں گھونگے ایک منٹ میں صرف ایک میٹر فاصلہ طے کرتے ہیں شاید بہتر یہ ہو گا کہ ان سست رفتار جانوروں کی اوسط رفتار کو کلومیٹر فی گھنٹہ کے بجائے گھنٹے فی کلومیٹر میں ناپا جائے۔ اس طرح گھونگوں کی رفتار ۷ ار گھنٹے فی کلومیٹر ہو گی اگر وہ کبھی اتنا فاصلہ ایک ساتھ طے کر سکیں اور ہاں کچھ کیڑوں کے مقابلے میں گھونگے بھی زیادہ تیز رفتار ہیں۔

یوں تقریباً تمام جانور تیز رفتاری سے صرف اس وقت بھاگتے ہیں جب یا تو وہ خود شکار کر رہے ہوتے ہیں یا پھر کسی دشمن کے شکار سے بھاگ رہے ہوتے ہیں

آبی اور فضائی جانوروں کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔ عام چھوٹی مچھلیاں دو سے سات آٹھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں عام حالات میں سب سے تیز رفتار مچھلی گرم سمندروں کی براکوڈا ہوتی ہے۔ ۱۰ کلوگرام وزنی اور ایک میٹر لمبی براکوڈا ۴۵ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے تیر سکتی ہے دودھ پلانے والی آبی مخلوق ڈالفن بھی ۳۵ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے تیرتی ہے۔ یہ رفتار ایک اچھے پانی کے جہاز کی رفتار کے برابر ہے کم فاصلوں پہ شکار کرنے کے لئے کلر وہیل (مارنے والی وہیل) ۵۵ میل فی گھنٹہ تک بھاگ سکتی ہے۔ تمام جانوروں میں سب سے تیز رفتار فضائی جانور یعنی پرندے ہوتے ہیں۔ پرندے نہ صرف وزن میں بہت ہلکے ہوتے ہیں بلکہ ہوا کی موجوں کو استعمال کرتے ہوئے زیادہ فاصلہ طے کر لیتے ہیں۔

ایک چڑیا جس کا نام ہی سوفٹ یعنی تیز رفتار رکھا گیا ہے، ۱۵۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑ سکتی ہے لیکن فضا میں اڑنے والے پرندوں کی رفتار میں خود ہوا کی رفتار سے بھی بہت فرق پڑ سکتا ہے۔

اگر تیز ہوا آگے کی طرف سے چل رہی ہو تو ظاہر ہے کہ پرندے کی رفتار کم ہو جائے گی اور اسی طرح اگر ہوا پیچھے سے چل رہی ہو تو اُڑان میں مدد ملے گی اور رفتار تیز ہو جائے گی۔

اُمید ہے اس مضمون سے آپ کے سوال کا جواب مل گیا ہو گا۔

●●●●●

قرآنی آیات، احادیث مبارکہ اور مقدس نام آپ کے مطالعے اور معلومات کے لئے شائع کئے جاتے ہیں۔ ان کا احترام اور انہیں بے حرمتی سے بچانا آپ کا دینی فرض ہے۔۔ اگر کوئی ایسا کاغذ کہیں گرا ہوا نظر آجائے جس پر آیات، احادیث یا متبرک نام لکھے ہوئے ہوں تو آپ انہیں کسی محفوظ مقام پر رکھ دیں یا پاک صاف پانی میں بہا دیں۔

اس بلّی کے سائے میں چوہے کے بچّے کتنے آرام سے ہیں۔ کیا بلّی کا پیٹ بھرا ہوا ہے یا اس نے چوہے کھانے چھوڑ دیئے...؟

انور سعد

الطاف حسین حالی

ایک ناصح - ایک شاعر

خلیفہ ہارون نے مصر کا ملک ایک جاہل غلام کے حوالے کر دیا۔ اسی سال سیلاب آیا اور کپاس کی فصل بہہ گئی۔ لوگ حکمران کے پاس اپنی مصیبت بیان کرنے گئے۔ اس نے کہا غلطی تمہاری ہے۔ کپاس کے کھیت کے بجائے تمہیں چاہیئے تھا کہ اُون کے درخت لگاتے۔ وہ سیلاب میں نہ بہتے۔ مولانا حالی نے اسے شعر میں باندھا ہے۔

فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اُون
ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اٹھایا

مولانا حالی کی ایک منظوم حکایت ہے جس میں ایک فضول خرچ ایک کفایت شعار کو طعنہ دیتا ہے کہ تم پیسے کو اس طرح جوڑ جوڑ کے رکھ رہے ہو جیسے تم کو دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔ اس پر کفایت شعار جواب دیتا ہے تم دولت کو اس طرح ضائع کر رہے ہو جیسے دنیا سے ابھی رخصت ہونے کا اِرادہ ہے۔

آج ہی گویا نصیبِ دشمناں
آپ کا دنیا سے ہے عزمِ سفر

ایک فقیر ہمیشہ انگریز کے سامنے ہی ہاتھ پھیلاتا تھا لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کرتے ہو کہنے لگا کہ مجھے بھیک مانگنے کی لَت پڑ گئی ہے اور میں اسے چھوڑنا چاہتا ہوں۔ دیسی شرفا سے سوال کروں تو وہ کچھ نہ کچھ دے ڈالتے ہیں۔ اس کے برعکس گورا گالی بکتا ہے۔ ٹھڈّے مارتا ہے، اور گردن پکڑ کر کہتا ہے چل کام کر اور کھا۔ اس نظم کے اشعار سُنیئے

پہلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک
آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا

پر جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدار
منت سے عجز سے کبھی ملت نہیں ٹلکا

اور سنیئے! مولانا کی ایک نظم ہے "کالے اور گورے کی صحت کا طبی امتحان" ایک کالا (ہندوستانی) اور ایک گورا (انگریز) دونوں کو بیماری کی چھٹی چاہیئے تھی۔ جس کے لئے میڈیکل کا سرٹیفکیٹ ضروری تھا۔ دونوں سول سرجن کے دفتر کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں کسی بات پر تکرار ہو گئی۔ گورے نے کالے کی پٹائی کر دی۔ وہ پہلے ہی بیمار تھا اَدھ مُوا ہو گیا۔ لوگ اٹھا کر سول سرجن کے دفتر لے آئے۔ سرجن کو جب حالات کا علم ہوا تو اس نے گورے سے کہا تو واقعی بیمار ہے کہ تو نے ایک کالے کو پیٹا اور وہ بچ گیا۔ تجھے سرٹیفکیٹ ملنا چاہیئے۔ کالے کو سرجن نے کہا اے مُوذی تو کہاں کا بیمار ہے۔ گورے سے پٹ کر بھی نہ مرا۔ تو ٹھیک ٹھاک ہے تجھے بیماری کا سرٹیفکیٹ کیسے دے دوں چل جا کر کام پر حاضر ہو۔ دیکھئے نظم میں حالی مرحوم نے کیسے لکھا۔

اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سَنَد
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار

ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیوں کر اعتبار!

کیا خوب چوٹ لگائی مولانا نے انگریز کے انصاف اور اس کی ذہنیت پر۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کو زبردست شکست ہوئی اور انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ کئی سال تک مسلمانوں پر انتہا درجے کے مظالم ڈھائے جاتے رہے ان کا خون بے دریغ بہتا رہا۔ ان واقعات کا حالی کی طبیعت پر بڑا گہرا اثر تھا۔ خوشیاں ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں۔ اس کے باوجود کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریر، تقریر اور نظم میں طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونے چھوڑے لیکن اسے کبھی شرافت کے معیار سے گرنے نہیں دیا۔ حالی بڑے ہی بردبار اور نیک دِل انسان تھے۔ ان کا دِل پھولوں سے زیادہ نازک تھا۔ اپنی قوم کے حالِ زار پر حالی نے جتنے آنسو بہائے ہیں۔ شاید ہی کسی قومی رہنما نے بہائے ہوں۔ ان کی مشہور نظم مدّ و جزرِ اسلام ہے جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی شعر اور نثر کے مجموعوں کے علاوہ کئی اہم تصانیف ہیں۔ آپ قوم کے غم میں روئے بھی اور

اصلاح کی کوششیں بھی کیں۔ اپنی امت کی ان بیماریوں، خامیوں اور عیوب کا زبردست احساس تھا جس کی وجہ سے وہ اس حال کو پہنچی تھی۔

غیبت کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ یہ برائی اس قوم میں پھیلتی ہے جسمیں کوئی خوبی نہ رہے بس

اوروں کی برائی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں

حالی خود شاعر تھے لیکن کہتے ہیں کہ شعر کسی مقصد کے لیئے کہا جانا چاہیئے محض شاعری تپ دق کی بیماری ہے۔ ان کے نزدیک فضول اور تہذیب سے گرے ہوئے شعر کہنے والے جہنمی ہیں۔

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے
عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

حق اسکواڈ

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سلسلہ تحریر
اخلاق احمد کی مہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

- برائیوں سے برسرِ پیکار ۴ کمسن مجاہدوں کے کارنامے ۔
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات ۔
- خوبصورت اسکیچز ۔۔۔ بہترین کتابت ۔۔۔ اعلیٰ طباعت
- حسین سرورق اور ۱۰۰ سے زائد صفحات ۔

قیمت صرف ۱۰ روپے

- حق اسکواڈ کے حصول کے لئے ۱۰ روپے کا منی آرڈر بھجوادیں ۔
- دوکاندار/ایجنٹ حضرات آرڈر سے مطلع کریں ۔

پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی گرین گائیڈ اکیڈمی ڈی۔ ۱۱۲ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

کچھوا اور خرگوش

امجد اسلام امجد

راوی ـــ سنو پیارے بچو کہانی سنو ـــ کہانی ہماری زبانی سنو
ایک کچھوا تھا اور ایک خرگوش تھا ـــ ایک جنگل میں دونوں کا ملنا ہوا

بچے (کورس کے انداز میں)

پرانی کہانی سنائیں نہیں ـــ ہمیں آپ اُلّو بنائیں نہیں
بہت مرتبہ ہم اسے سُن چکے ـــ اب خدارا ہمیں بور مت کیجیے

راوی۔ (خاموش کراتے ہوئے، سمجھانے کے انداز میں)

مگر تم سنو تو سہی دوستو ـــ یہ کہانی ہے بالکل نئی دوستو

بچے ـــ (ہنستے ہیں)

معاف کیجیے ہمیں کچھ ہنسی آ گئی ـــ جسے آپ کہتے ہیں بالکل نئی
نانی اماں سے ہم نے سنا ہے اسے ـــ سب کتابوں میں ہم نے پڑھا ہے اسے
گر نہیں مانتے تو سنا دیں ابھی ـــ کیسے جیتا تھا، کچھوا، بتا دیں ابھی

راوی۔ (محبت سے)

بات کرنے دو پوری اگر تم مجھے ـــ میرے کہنے کا مطلب بھی تم پر کھلے
نانی اماں نے جو کچھ سنایا تمہیں ـــ اور کتابوں نے جو کچھ بتایا تمہیں
وہ حقیقت نہیں ہے مرے دوستو! ـــ اصل قصّہ ہے کیا آج مجھ سے سنو

بچے۔ (ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتے ہیں)

آپ کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں ہم ـــ اصل قصّہ ہے کیا جان لیتے ہیں ہم
ہاں سنائیں ذرا کیا کہانی ہے یہ ـــ کتنی تازہ ہے کتنی پرانی ہے یہ

راوی۔ تو سنو پیارے بچو ذرا غور سے ـــ اک پرانی کہانی نئے طور سے
ایک کچھوا تھا اور ایک خرگوش تھا ـــ ایک جنگل میں دونوں کا ملنا ہوا
جب تعارف ہوا بات چلنے لگی ـــ بات چلنے لگی رات ڈھلنے لگی

کھانے پینے کی تنگی کی باتیں ہوئیں ——— امن کی، خانہ جنگی کی باتیں ہوئیں

گرچہ رہتے تھے جنگل میں وہ دُور دُور ——— دن میں اک بار ملتے تھے دونوں ضرور

یوں ہی آپس میں دونوں جو ملتے رہے ——— دوست اک دوسرے کے وہ بنتے گئے

ایک دن شام کو جب وہ دونوں ملے ——— باتیں جنگل کے بارے میں کرنے لگے

خرگوش۔ یار کچھوے سُنی تم نے تازہ خبر ——— ایک ہاتھی نے توڑا ہے بندر کا گھر

وہ شکاری جو تھا راہ میں کل ملا ——— بھاگتے بھاگتے جھیل میں گر پڑا

سخت گرمی سے کل دو ہرن مر گئے ——— آٹھ طوطے کسی جال میں پھنس گئے

ایک بکری کے پاؤں میں موچ آ گئی ——— جتنے انگور تھے لومڑی کھا گئی

بھیڑیئے پانچ مرغے پکڑ لائے تھے ——— شیر صاحب انہیں دیکھنے آئے تھے

ایک چیتا تھا ہرنوں کے پیچھے لگا ——— اس قدر تیز تھا چلتا جیسے ہوا

میں نے بھی دوڑتے اس کو دیکھا تو تھا ——— میرے آگے مگر اس کی ہستی ہے کیا

میں جو دوڑوں تو آندھی سے آگے چلوں ——— سارے جنگل کو رفتار میں مات دوں

میرا ثانی نہیں ہے جہاں میں کوئی ——— ساری دنیا میں ہیں میری دھومیں مچی

کچھوا —— تم بہت تیز ہو میں نے مانا مگر ——— اس پہ کرتے ہو تم کیوں غرور اس قدر

بھاگنے میں کئی تم سے بہتر بھی ہیں ——— تم اکیلے نہیں اور ہم سر بھی ہیں

اپنی رفتار پر تم کو گر ناز ہے ——— مجھ کو بھی اپنی اس بات پر ناز ہے

خرگوش —— (مذاق اُڑانے والے انداز میں ہنستا ہے)

مرغی لڑنے چلی ہے ببر شیر سے ——— خیر کچھ بھی ہو، اچھا لطیفہ ہے یہ!

تم میرے دوست ہو بھائی کچھوے سُنو ——— لب پہ لانا نہ پھر اس خرافات کو

تم کہاں اور کہاں میرے بجلی قدم ——— تم سے احمق زمانے میں ہوتے ہیں کم

کچھوا —— گر تمہیں وہم ہے اپنی رفتار کا ——— آؤ کرلیں یہیں آج ہم فیصلہ

میں بھی دیکھوں کہ تم کتنے پانی میں ہو ——— حوصلہ ہے تو آؤ، چلو بھاگ لو

خرگوش۔ (سمجھانے کے انداز میں)

دیکھ پاگل نہ بن ہوش کی بات کر ——— پاؤں مٹی پہ رکھ، آسماں سے اُتر

فائدہ کیا ہے بے معنی تقریر کا ——— فیصلہ دیکھ لیتے ہیں تقدیر کا

نہر کے پُل کو منزل بناتے ہیں، ہم ——— اپنی قسمت ابھی آزماتے ہیں، ہم
جیت جاؤ تو دوں گا تمہیں سو روپے ——— ورنہ دینا پڑیں گے تمہیں وہ روپے
اپنی رفتار پر تم جو مغرور ہو ——— ہاں چلو گر تمہیں شرط منظور ہو
خرگوش ——— تم کو ضد ہے اگر تو چلو یوں سہی ——— گرچہ اس میں مری کوئی عزّت نہیں
تم مگر اس حماقت پہ پچھتاؤ گے ——— ساری دنیا میں بدنام ہو جاؤ گے
کچھوا ——— حوصلہ ہے تو آؤ کرو فیصلہ ——— یوں بہانے بنانے سے کیا فائدہ !
خرگوش ——— ٹھیک ہے تو چلو دیکھ لیتا ہوں میں ——— دیکھنا کیا سبق تم کو دیتا ہوں میں
کچھوا ——— دوڑ کی ابتدا، ہو گی اس پیڑ سے ——— جا کے منزل پہ اب ہوں گے سب فیصلے
راوی ——— کہہ کے یہ دونوں پھر روانہ ہوئے ——— دوڑتے بھاگتے، ہانپتے کانپتے
چال خرگوش کی تھی ہوا کی طرح ——— کچھوا چلتا تھا کالی گھٹا کی طرح
کچھوے صاحب گو زوروں میں بھاگے بہت ——— دو منٹ میں تھا خرگوش آگے بہت
مُڑ کے دیکھا جو اک بار خرگوش نے ——— کوئی کچھوا نہ کچھوے کے آثار تھے
دائیں دیکھا تو اک خوشنما باغ تھا ——— اپنے دل میں وہ خرگوش کہنے لگا
خرگوش ——— کیوں نہ کچھ دیر اس باغ میں رک چلوں ——— پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں لیٹا رہوں
راوی ——— پیڑ کے سائے میں لیٹ کر سو گیا ——— میٹھے سپنوں کے انبار میں کھو گیا
شام کے سائے جب ہر طرف چھا گئے ——— کچھوے صاحب بھی اس باغ میں آ گئے
غور سے اُس نے دیکھا تو خرگوش تھا ——— نیند کے گہرے نشے میں مدہوش تھا
کچھوا ——— کچھوا کہنے لگا جیت جاؤں گا میں ——— نیچا خرگوش کو اب دکھاؤں گا میں
راوی ——— نہر کے پُل کی جانب وہ بڑھنے لگا ——— کچھ گھٹنے لگا تھوڑا چلنے لگا
یک اک کر کے لمحے گزرتے گئے ——— کچھوے صاحب سُوئے نہر بڑھتے گئے
دن مہینے، مہینے ڈھلے سال میں ——— سال کٹتے گئے اس بُرے حال میں
آخرِ کار منزل کی پائی جھلک ——— اس کی آنکھوں میں اُتری نرالی چمک
نہر کے پُل پہ خرگوش پہنچا نہ تھا ——— کچھوا جیسے ہواؤں میں اُڑنے لگا
جم کے بیٹھا وہ منزل پہ یہ سوچ کے ——— آئے خرگوش تو اس سے لوں سو روپے

آیا خرگوش اتنے میں اُس کو نظر ———— مسکراتا ہوا، بے جھجک، بے خطر

پاس آیا تو سیٹی بجاتے ہوئے ———— پوچھا..............

خرگوش— ———— بیٹھے ہو کچھوے میاں کس لئے

راوی —— کچھوا بولا.............

کچھوا —— کہو شرط کیسی رہی! ———— اب کہاں ہے وہ رفتار کی برتری

شرط کے سو روپے پہلے رکھو یہاں ———— پھر سُنانا مجھے اپنی یہ سیٹیاں

راوی —— بولا خرگوش.......

خرگوش— کیا کہہ رہے ہو میاں ———— چھیڑ دی ہے یہ کیسی عجب داستاں

کون سی شرط کے مانگتے ہو روپے ———— آپ پاگل تو صاحب نہیں ہو گئے

راوی —— کچھوا بولا...........

مُکرنے سے کیا فائدہ! ———— لاؤ وہ سو روپے، مانو اپنی خطا

یاد کر لو یہی نہر کا پُل ہے وہ ———— اس کو اچھی طرح غور سے دیکھ لو

شرط اس تک پہنچنے کی تھی یا نہیں؟ ———— ذہن میں یاد روشن ہوئی یا نہیں

راوی —— اس پہ خرگوش کچھ سوچ میں پڑ گیا ———— پھر اچانک اسے جیسے یاد آگیا

ہنس کے کہنے لگا........

خرگوش— بھائی کچھوے میاں ———— شرط کے سو روپے تم ہی رکھو یہاں

تم نے آنے میں اِک نسل کی دیر کی ———— شرط مجھ سے نہیں، میرے ابا سے تھی

دوسرا خرگوش (بیمار سی آواز میں)

پیارے بیٹے سنو نہر کے پُل پہ ہی ———— ایک کچھوا ملے گا کبھی نہ کبھی

اس سے لینا مرے شرط کے سو روپے ———— میری جانب سے تم پھر یہ کہنا اُسے

حد سے آئندہ اپنی نہ بڑھنا کبھی ———— یہ حماقت دوبارہ نہ کرنا کبھی

آئیے بنیں آرٹسٹ

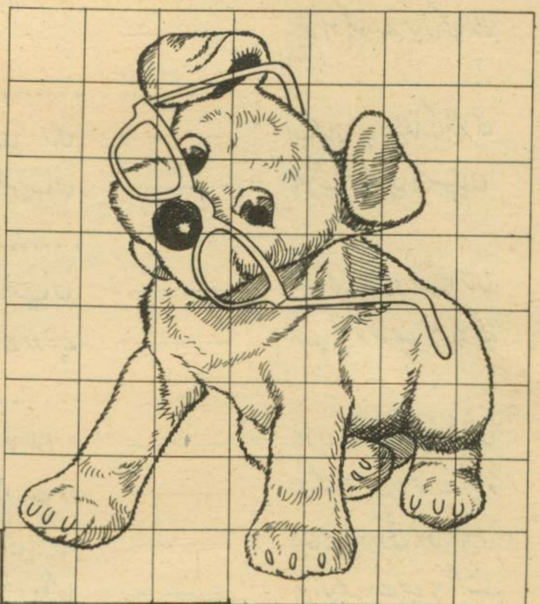

Langnese
شہد کی مکھیوں
500g
Langnese
Bee Honey
100% Pure
Selected Quality
NATURE'S GOLDEN GIFT
تیس سے ساٹھ ہزار شہد کی
مکھیوں کی انتھک کوشش میں
خالص اور غذائیت سے بھرپور
شہد کے صرف چند قطرے تحفے
کی صورت میں مہیا کرتی ہیں
اور وہ اپنی کوشش کے اس ثمر
کو لینگنیز کھلانا
پسند کرتی ہیں۔

اپنے دانتوں کو مزے سے صاف کیجئے

کرسٹل کے تین ذائقے، تینوں مزے دار
کرسٹل ریڈ جیل میں چیری، گرین جیل میں
منٹ اور کرسٹل وہائٹ میں منٹ فریش۔

کرسٹل سے برش کیجئے، ٹوتھ پیسٹ کا مزا
لیجئے دانت ہمیشہ صاف، چمکدار اور کیڑا
لگنے سے محفوظ۔

Crystal

سانس خوشگوار، دانت چمکدار

۱۵,۰۰ روپے کے انعامات - آپ کے لئے

"آنکھ مچولی" مقابلہ پیشگوئی

میں حصہ لیجئے.... اور قیمتی انعامات حاصل کیجئے!

ساتھیو! ورلڈ کپ کرکٹ ٹورنامنٹ شروع ہو رہا ہے، جس میں دنیا بھر کی بہترین کرکٹ ٹیمیں حصہ لے رہی ہیں۔ ابھی سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سی ٹیم جیتے گی اور کس کھلاڑی کی کارکردگی سب سے اچھی رہے گی۔ لیکن تمام ٹیموں اور کھلاڑیوں کی پچھلی کارکردگی کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ پیشگوئی تو کی جا سکتی ہے۔ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ ورلڈ کپ کے سلسلے میں اپنے اپنے اندازے کے گھوڑے دوڑائیے اور پیشن گوئیاں کیجئے۔

جس ساتھی کی ساری پیشگوئیاں درست ثابت ہوں گی، اسے پانچ سو روپے کا پہلا انعام دیا جائے گا۔ ایک غلطی کرنے والے دو ساتھیوں کو ڈھائی ڈھائی سو روپے کے دو انعامات دیئے جائیں گے۔ دو غلط پیشن گوئیاں کرنے والے دو ساتھیوں کو دو دو سو روپے کے دو انعامات دیئے جائیں گے۔ اور دو سے زیادہ غلطیاں کرنے والے پچاس ساتھیوں کو دلچسپ کتابوں کے سیٹ بطور تحفہ دیئے جائیں گے۔ زیادہ درست حلوں پر انعامی رقم شرکائے مقابلہ میں مساوی تقسیم کر دی جائے گی۔ اب مقابلے میں شرکت کا طریقہ کار بھی سمجھ لیجئے۔ پچھلے صفحے پر دو کوپن شائع کئے جا رہے ہیں۔ ان میں پوچھے گئے سوالوں کا سامنے دی گئی خالی جگہ میں جواب لکھ کر ۸۰ پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ہمراہ ۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء تک ہمیں ارسال کر دیں۔ بغیر ٹکٹ اور کوپن کے جوابات مقابلے میں شامل نہیں کئے جائیں گے۔ اگر آپ دونوں کوپن بھر کے بھیجنا چاہتے ہیں تو ۸۰ پیسے کے دو ٹکٹ ارسال کریں۔

کوپن ورلڈ کپ پیشن گوئیاں

ورلڈکپ ٹورنامنٹ میں کس ملک کی ٹیم فاتح رہے گی ؟ ________

کون سے ملک کی ٹیم دوسرے نمبر پر رہے گی ؟ ________

کس ملک کی ٹیم تیسرا نمبر حاصل کرے گی ؟ ________

کون سا کھلاڑی سب سے اچھا بیٹسمین ثابت ہو گا ؟ ________

کس کھلاڑی کی بولنگ شاندار رہے گی ؟ ________

کون سا کھلاڑی کامیاب آل راؤنڈر کا اعزاز حاصل کرے گا؟ ________

نام ________

مکمل پتہ ________

____

کوپن ورلڈ کپ پیشن گوئیاں

ورلڈکپ ٹورنامنٹ میں کس ملک کی ٹیم فاتح رہے گی ؟ ________

کون سے ملک کی ٹیم دوسرے نمبر پر رہے گی ؟ ________

کس ملک کی ٹیم تیسرا نمبر حاصل کرے گی ؟ ________

کون سا کھلاڑی سب سے اچھا بیٹسمین ثابت ہو گا ؟ ________

کس کھلاڑی کی بولنگ شاندار رہے گی ؟ ________

کون سا کھلاڑی کامیاب آل راؤنڈر کا اعزاز حاصل کرے گا؟ ________

نام ________

مکمل پتہ ________

____

اُردو کے مقبول افسانہ نگار
غلام عباس کی دلچسپ کہانی

ایک ٹانگ کا بادشاہ

ایک تھا بادشاہ۔ اسے شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ آئے دن اپنے امیروں، وزیروں کے ساتھ آس پاس کے جنگلوں میں جاتا اور ہرنوں ہرنیوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کا شکار کھیلا کرتا۔

اس بادشاہ کو گھوڑے پالنے کا بھی بہت شوق تھا۔ جہاں کوئی چالاک اور پھرتیلا گھوڑا دیکھ لیتا، جھٹ اُس کے مالک سے منہ مانگی قیمت پر خرید لیتا۔

ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا، کہ اس بادشاہ کے دربار میں عرب سے گھوڑوں کا ایک سوداگر آیا، جھک کر آداب بجالایا اور عرض کی "حضور، غلام ایک گھوڑا لایا ہے۔ ایسا پھرتیلا کہ پل بھر کو اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے، آنکھ کے اشارے پر ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ لیکن حضور، اس میں ایک نقص بھی ہے۔ یہ مزاج کا بہت کڑوا ہے کسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ ہر وقت دولتیاں چلایا کرتا ہے۔ اگر حضور اس گھوڑے کو لینا چاہیں تو غلام حاضر کر سکتا ہے۔"

بادشاہ نے ہنس کر کہا "میاں سوداگر، تم بے فکر ہو کر اپنا گھوڑا لے آؤ۔ یہاں بڑے بڑوں کو سیدھا کر ڈالا ہے۔"

دوسرے دن عرب سوداگر گھوڑا لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا گھوڑے کو دیکھ کر بادشاہ کی باچھیں کھل گئیں ایسا خوبصورت اور پھرتیلا گھوڑا بادشاہ نے اپنی عمر میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ خوش ہو کر سوداگر کو انعام سے مالامال کر دیا اور گھوڑا اپنے اصطبل میں بھجوا دیا اور کہا "کل ہم اس گھوڑے پر سوار ہو کر امیروں وزیروں کے ساتھ شکار کھیلنے جائیں گے۔"

دوسرے دن صبح سویرے بادشاہ اپنے نئے گھوڑے پر سوار امیروں وزیروں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا۔ کچھ دیر تو خیر گزری لیکن جب بادشاہ ایک شیر کو شکار کر رہا تھا تو یکایک شیر بادشاہ کی طرف جھپٹا۔ شیر کے جھپٹنے سے بادشاہ کا عربی گھوڑا بھڑک اٹھا۔ اور بادشاہ کو زمین پر پٹخ کر سرپٹ دوڑ گیا۔ جب تک بادشاہ کے ساتھی مدد کو پہنچیں شیر نے اپنے تیز دانتوں سے اس کی بائیں ٹانگ چبا ڈالی۔

وزیر بادشاہ کو اُٹھا کر محل میں لائے اور حکیموں ویدوں کو بلایا، حکیموں ویدوں نے اپنی کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی۔ لیکن بادشاہ کی ٹانگ اچھی نہ ہوئی اور آخر سب نے یہی فیصلہ کیا کہ بادشاہ کی جان اسی صورت میں بچ سکتی ہے کہ ٹانگ کاٹ ڈالی جائے۔

تھوڑے ہی دنوں میں زخم بھر گیا۔ اور بادشاہ اچھا ہو گیا لیکن ٹانگ کٹ جانے کا اسے بہت رنج تھا۔ اب وہ ہر وقت اُداس اُداس رہتا نہ کہیں آتا نہ جاتا، ہر وقت مسہری پر پڑا رہتا۔

اس بادشاہ کی ایک خوبصورت بیٹی تھی۔ اس کا نام تھا مہ جبیں، وہ اپنے باپ کا دل بہلانے گھنٹوں اس کی مسہری کے پاس بیٹھی رہتی اور ستار بجا بجا کر اپنی میٹھی آواز سے اس کو گیت سنایا کرتی۔ لیکن اس کا غم کسی طرح دور نہ ہوتا تھا۔

بادشاہ کے محل سے دور ایک پہاڑی تھی اُس پر ایک بڈھا رہتا تھا جو بہت عقلمند اور دانا تھا۔ دُور دُور سے لوگ اس کے پاس آتے اور اپنی اپنی مصیبتیں بیان کرتے اور وہ طرح طرح کے مشورے دے کر ان کی حاجتیں پوری کیا کرتا ایک دن بادشاہ کے وزیروں نے سوچا کہ اس بڈھے کو بلانا چاہئے شاید وہی بادشاہ کا غم دور کر سکے۔

جب بڈھا بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا تو بادشاہ نے کہا "بڑے میاں تم میرے ملک میں سب سے زیادہ عقلمند ہو۔ اگر تم کسی طرح میرا غم دور کر دو تو میں تم کو آدھی بادشاہت دے دوں گا اور اپنی بیٹی کی شادی بھی تم سے کر دوں گا۔"

بڈھے نے مسکرا کر کہا "حضور میں پہاڑی پر ایک چھوٹی سی کٹیا میں رہتا ہوں تخت تاج لے کر کیا کروں گا۔ میری عمر ای

برس کی ہو چکی ہے اور شہزادی جوان ہے بھلا بڈھے اور جوان کا کبھی ساتھ ہوا ہے۔ آپ ایسا کیجئے کہ اپنے ملک میں ڈھنڈورا پٹوا دیجئے کہ جو کوئی بادشاہ سلامت کے لئے نئی ٹانگ لائے گا اسے آدھی سلطنت دے دیں گے اور اپنی بیٹی کی شادی بھی اس سے کر دیں گے۔ کیا پتہ کوئی ایسا عقلمند شخص نکل آئے جو حضور کی خواہش پوری کر دے۔"

یہ سن کر بادشاہ خوشی سے اُچھل پڑا، اور بولا "مجھے تمہاری رائے بہت پسند آئی، میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔"

دوسرے دن بادشاہ نے سارے شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جو کوئی ہمارے لئے نئی ٹانگ لے کر آئے گا ہم بدولت اسے آدھا تخت و تاج دیں گے اور اپنی دخترِ نیک اختر کی شادی بھی اس سے کریں گے۔

یہ ڈھنڈورا سن کر سینکڑوں لوگوں کا جی للچایا اور وہ جلدی جلدی ٹانگیں بنا بادشاہ کے محل کے سامنے آ جمع ہوئے اور لگے ایک دوسرے کو دھکے دینے اور چلاّ چلاّ کر کہنے "بادشاہ سلامت ٹانگ حاضر ہے۔" ہر شخص کی یہ کوشش تھی کہ میں سب سے پہلے بادشاہ کے سامنے پہنچوں اور اپنی بنائی ہوئی ٹانگ پیش کر کے انعام حاصل کروں۔

انہوں نے اتنا شور مچا رکھا تھا کہ محل کے داروغہ نے انہیں ڈانٹ کر کہا "اگر تم چپ نہ ہوئے تو میں ابھی تم سب کے سر اڑا دوں گا۔"

آخر بادشاہ نے حکم دیا کہ انہیں ایک ایک کر کے ہمارے سامنے لے آؤ۔

پہلا شخص بادشاہ سلامت کے سامنے پیش ہوا۔ وہ لکڑی کی ٹانگ لایا اور کہنے لگا "بادشاہ سلامت ذرا اس ٹانگ کو تو آزمایئے۔ اگر ٹھیک نہ آئے تو میں اپنی ناک کٹوا دوں۔"

جب بادشاہ نے اسے اپنی کٹی ہوئی ٹانگ پر لگایا تو وہ ایسی بھاری نکلی کہ بادشاہ کو ہلنا جلنا دوبھر ہو گیا۔ اُس نے غصہ سے آگ بگولا ہو کر وہی لکڑی کی ٹانگ اس کے سر پہ ماری۔

دوسرا شخص ٹین کی بنی ہوئی ٹانگ لایا لیکن جب بادشاہ نے اُسے کٹی ہوئی ٹانگ پر لگایا تو وہ وہیں پھنس گئی۔ ٹانگ لانے والے کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اس نے اور بادشاہ نے بتیری کوشش کی کہ کسی طرح یہ ٹین کی ٹانگ اُتر آئے، لیکن کچھ کامیابی نہ ہوئی، آخر لوہار کو بلوایا گیا اور اس نے بادشاہ کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلوایا۔ اس پر بادشاہ نے حکم دیا کہ اس شخص کے گلے میں یہی ٹین کی ٹانگ باندھ کر اسے بطخوں والے تالاب میں پھنکوا دیا جائے۔

اس کے بعد دوسرے لوگ پیش ہوئے۔ ان میں کوئی رُوئی اور کپڑے کی ٹانگ بنا کر لایا تو کوئی بانس کی، غرض طرح طرح کی ٹانگیں بادشاہ کے سامنے پیش کی گئیں۔ لیکن ان کے لانے والوں کا بھی بُرا حال ہوا اور انہیں دھکے دے کر محل سے نکال دیا گیا۔

اب بادشاہ پھر اُداس اُداس رہنے لگا۔ سارا سارا دن غم کی مورت بنا تخت پر بیٹھا رہتا۔ نہ کسی سے بات کرتا نہ کہیں آتا جاتا ہر وقت فکر میں ڈوبا رہتا۔ کئی مہینے بیت گئے مگر اس کے ہونٹوں پر ہنسی نہ آنی تھی نہ آئی۔ آخر حکیموں اور ویدوں نے ایک دوسرے

سے کہا کہ اگر ہمارا بادشاہ اس طرح غم کھاتا رہے گا تو تھوڑے ہی دنوں میں مرجائے گا۔

اسی طرح کچھ عرصہ اور گزر گیا۔ ایک دن بادشاہ کے دربار میں ایک خوبصورت نوجوان شہزادہ آیا اور بادشاہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ بادشاہ نے اسے اپنے پاس بلالیا۔ اس وقت اس کی بیٹی مہ جبین بھی اس کے تخت کے پاس ہی ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھی تھی وہ شہزادے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

شہزادے نے کہا "بادشاہ سلامت! غلام کو آپ کے دکھ کا سب حال معلوم ہے۔ کل آپ اپنے سب امیروں، وزیروں کو اپنے پاس بلالیں۔ اس وقت میں حضور کی خدمت میں ایک سچ مچ کی ٹانگ پیش کروں گا۔ لکڑی، ٹین، کپڑے کی ایسی واہیات ٹانگ نہیں بلکہ خون اور گوشت کی بنی ہوئی ٹانگ!"

بادشاہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں "سچ کہتے ہو؟"

شہزادے نے کہا "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، کل حضور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے" یہ کہہ کر شہزادے نے جھک کر بادشاہ کو سلام کیا اور دربار سے چلا گیا۔

دوسرے دن بادشاہ نے اپنے سب امیروں، وزیروں کو اپنے تخت کے گرد جمع کرلیا۔ اس کی بیٹی مہ جبیں کل کی طرح آج بھی اس کے پاس ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھ گئی اور سب لوگ بڑی بے صبری سے شہزادے کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد شہزادہ دربار میں حاضر ہوا اُس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا بکس تھا وہ بادشاہ کے تخت کے پاس پہنچ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور کہنے لگا "لیجیے بادشاہ سلامت یہی وہ گوشت اور خون کی بنی ہوئی ٹانگ ہے جس کا میں نے کل آپ سے وعدہ کیا تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے بکس کھولا اور ایک ہرن کی ٹانگ نکال کر بادشاہ کے سامنے پیش کردی۔

تمام دربار پر سناٹا چھا گیا۔ امیروں وزیروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں بادشاہ کا چہرہ غصّے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے شہزادے کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ پھر ایکا ایکی اس کا سارا غصّہ اُتر گیا اور اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ یہ دیکھ کر دربار کے لوگ پہلے تو بہت حیران ہوئے مگر جب انھوں نے بادشاہ کو ہنستے ہوئے دیکھا تو خود بھی ہنسنے لگے اور مہ جبیں کا تو یہ حال تھا کہ ہنسی کے مارے اُس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

بادشاہ نے کہا "اے نوجوان شہزادے تم نے جس ہوشیاری اور عقل مندی سے مجھ سے شرط جیتی۔ میں اس کی داد دیتا ہوں اور اب میں کبھی غمگین نہ رہوں گا کل تمہاری اور مہ جبیں کی شادی ہوجائے گی۔"

دوسرے دن شہزادے اور مہ جبیں کی شادی ہوگئی۔ اور اس روز بادشاہ نے اپنے سب امیروں وزیروں کی دھوم دھام سے ضیافت کی اور بادشاہ، مہ جبین اور شہزادے نے وہ ہرن کی ٹانگ مزے لے لے کر کھائی۔

صالحہ بلال حسین

پھر بارش آئی

ننھّا سا ایک مرغی کا بچہ تھا یہ تھا تو پیارا پیارا مگر ہر وقت اُداس رہتا تھا اس لئے کہ اس کے ساتھی صحت مند اور گداز تھے اور اس کا جسم لاغر سا تھا ایک دن وہ درخت کے نیچے دانہ چگتا پھر رہا تھا جب ایک ہرے بھرے درخت نے اس سے کہا تھا" تمہارے پروں کا رنگ کس قدر خوبصورت ہے۔ گلابی گلابی۔ شہابی شہابی"۔ اس نے جب دیکھا تو واقعی شرما گیا۔ اسی وقت ایک گیند اچھلتی ہوئی آئی اور وہ کانپ کر رہ گیا۔ بہت سے لڑکے زور شور سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ بہت دیر تک درخت کے تنے سے دبک کر خود کو گیند سے محفوظ محسوس کرتا رہا۔

ایک دوپہر اچانک بارش آگئی۔ وہ بیچارہ بھیگتا رہا اور اِدھر اُدھر گھبرا کر دوڑنے لگا۔ اس وقت وہ دور ایک کھیت میں کھیلتا پھر رہا تھا۔ اس نے سوچا آس پاس کی جھاڑیوں میں پناہ لے لے اور خود کو بھیگنے سے بچالے مگر اس کے دل نے کہا "نہیں میں اپنے اس درخت کے سائے میں جاؤں گا جس نے مجھ سے پیار سے باتیں کی تھیں اور میرا دل موہ لیا تھا۔ اس کے مضبوط تنے میں اس دن کی طرح مجھے کتنا سکون ملے گا۔ اس کی شاخوں کے نیچے آج تو سوندھی سوندھی خوشبو بھی ہوگی" وہ جذبات سے بے قابو ہو کر اس درخت کی سمت تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

چلتے چلتے اس کے قدم تھکن سے چور ہوگئے۔ راستے میں بہت سے چھوٹے اور بڑے درخت تھے جو اسے بلاتے تھے۔ کہتے تھے آؤ ہم تمہیں پناہ دیں مگر وہ نظریں جھکائے چلا جارہا تھا۔ ان آوازوں سے بےخبر اور بے پروا... اور اپنے دوست درخت کی یاد میں بے قرار حتیٰ کہ وہاں پہنچ گیا اور جب بالکل نزدیک آیا تو اس نے دیکھا کہ آج بھی چھوٹے چھوٹے کچھ لڑکے وہاں کھیل رہے تھے لیکن بارش کے سبب کھیل روکنا پڑا تھا۔ وہ سب گیند بلّے اٹھائے اُداس اُداس لوٹ رہے تھے اور درخت ان سے مخاطب تھا "تفریح میں وقفہ تو تفریح کے لطف کو دوبالا کردیتا ہے"۔

پھر اس درخت کی نظر اس ننھّے چوزے پر پڑی۔ اس درخت نے بے رخی سے پوچھا "کون ہو تم"؟

" میں وہ ہوں میرے دوست جسے تم نے حوصلہ دیا تھا۔ میں وہ ہوں جو تمہارا احسانمند ہوں۔ میں بہت دور سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم مجھے اپنی چھاؤں میں کچھ دیر جگہ دیدو"

ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ٹھنڈی ٹھنڈی مہک چاروں طرف پھیل گئی۔ چوزے کو پھُریری سی آگئی۔ اور اس نے کہا۔

" تمہیں میرے پروں کا رنگ پسند ہے نا؟ بس تھوڑی سی دیر کے لئے پناہ چاہیئے"

" اچھا اچھا اب یاد آیا" درخت نے بے رُخی سے اجازت دے دی اور ٹہنیوں سے چھَنا چھَن قطرے ٹپک پڑے۔

وہ بارش میں کھڑا بھیگتا رہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رَواں ہوگئے۔ آنسوؤں اور بارش کا پانی مل مل کر اس کے گلابی شہابی جسم کو بھگوتے رہے۔ جن میں دبا ہوا ایک مختصر سا دل دھڑک رہا تھا۔ کمزور اور ڈرپوک دل اس وقت اس دل میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ قدم بڑھا کر اس درخت میں اپنا منہ چھپالے جس کے علم کی پختگی نے اسے اور بھی لرزا دیا تھا اور بھی لاغر محسوس کرنے پر مجبور کردیا تھا۔

اتنے میں ان بچوں کی نظر چوزے پر پڑی اور ننھی ننھی معصوم آغوش نے ہر جانب سے اُسے سمیٹ لیا۔ مسکراہٹوں سے ساری فضا رجگمگا اٹھی۔ چوزہ حیران تھا کہ لوہے جیسی مضبوطی اور عجیب سا قرار اس کے دل میں کہاں سے اتر آیا ہے۔

بارش تھم چکی تھی اور کرکٹ کا وقت تھا لیکن چوزے کی دوستی میں سب مگن تھے اس بُردبار درخت کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں خوشی سے لبریز دل لئے وہ ننھا چوزہ بھی۔

ماہنامہ
آنکھ مچولی

اچھا پڑھیے

آگے بڑھیے

آپ کی علمی ضرورت بھی ہے اور آپ کے ادبی ذوق کی تسکین بھی
اسے باقاعدگی سے پڑھنے کے لئے اور اس کے حصول کو آسان بنانے کے لئے

ہماری خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہوجایئے

اس میں مالی منفعت بھی ہے اور علمی فائدہ بھی
اسے حاصل کرنے کی ذمہ داری ہم پر ڈال دیجئے

ماہنامہ آنکھ مچولی (خصوصی بچت اسکیم) گرین گائیڈ اکیڈمی ڈی۔۱۱۲ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

خصوصی بچت اسکیم

۱۲ شماروں کی قیمت (مع خصوصی شمارے) رجسٹرڈ ڈاک سے ~~۱۲۰~~ ۹۰ روپے

۲۴ شماروں کی قیمت (مع خصوصی شمارے) رجسٹرڈ ڈاک سے ~~۲۴۰~~ ۱۸۰ روپے

مالی فائدے کے علاوہ زحمت سے نجات رسالے کی بحفاظت ترسیل اور ۲ سالہ ممبرشپ پر قیمتی کتب بلا معاوضہ

- -

میں ماہنامہ "آنکھ مچولی کی خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہونا چاہتا / چاہتی ہوں
اس کوپن کے ساتھ ۱۲/۲۴ شماروں کی قیمت مبلغ ...... روپے کا بینک ڈرافٹ / پوسٹل آرڈر
منی آرڈر کی رسید منسلک ہے ـــــ میرے نام حسب ذیل پتے پر ماہ ...... سے ماہنامہ
جاری کردیا جائے۔

نام ____________________

مکمل پتہ ____________________

کوئی ضروری ہدایت ____________________

فون نمبر ____________ دستخط ____________

راہنما کتابیں

آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کیلئے

گرین گائیڈ اکیڈمی کے تحائف

اِن کا مطالعہ —— علم بڑھائے گا
اِن کی موجودگی —— مفید ثابت ہو گی۔

قرآنی حکایات کا ۱۰۴ صفحات پر مشتمل خوبصورت مجموعہ۔
اس کے حصول کے لئے ۱۰ روپے کا منی آرڈر بھجوائیں

خاکِ وطن سے سرزمین حرم تک، معلومات بھی راہنمائی بھی
حجاج اور زائرین کے لئے نادر تحفہ۔ ۲۰۳ صفحات

اسلام کی بنیادی معلومات جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ کی تالیف (چار حصے)

سفرِ مبارک اور تعلیم الاسلام مفت حاصل کرنے کے لئے فی کتاب ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھجوائیں۔ رقم یا کم ڈاک ٹکٹ قابل قبول نہ ہوں گے

کتاب منگوانے کے لئے اِس پتے پر خط لکھیں۔

گرین گائیڈ بک سیریز گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲ ڈی۔ سائٹ کراچی ۱۶

افغانستان کے پس منظر میں لکھا ہوا سلسلہ وار ناول

ایف ملک سلیم

پاسبان

قسط نمبر ۴

میں دوسرے افغان مجاہدین کے ساتھ ایک کیمپ میں قید تھا۔ جورگن نام کا ایک فوجی مجھ سے یہ راز معلوم کرنے آیا کہ جلال آباد کا پل کس نے تباہ کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے مجھ پر اتنا تشدد کیا کہ میں بے ہوش ہوگیا۔ دوسری جانب کے جی بی کا ایک ایجنٹ راک آرکنڈ افغان مجاہدین کی سرکوبی کے لیے قندھار پہنچ چکا تھا۔ اُسے ابلال، ارفع اور ارمغان کی تصویریں دکھائی گئیں۔ یہ تینوں روسیوں کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ ایک روسی فوجی ایڈرک مذہب اسلام قبول کرکے مجاہدین کا ساتھ دے رہا تھا۔ راک آرکنڈ کو اس پر شک ہوا اور اُس نے اُسے گولی ماردی۔ وہاں جب میں ہوش میں آیا تو جورگن میرے سرپر بدستور موجود تھا۔ دوسری طرف ابلال، ارفع اور ارمغان نے فیصلہ کیا کہ ایڈرک کی موت کا بدلہ لیا جائے گا۔ اگلے دن کوڑے کے ڈرم سے ایڈرک کی مسخ شدہ لاش ملی اور تمام اخباروں میں شہ سُرخیوں کے ساتھ یہ خبر چھپی۔ اِدھر اسپتال میں ایک ڈاکٹر کی مدد سے، جو میرا ہمدرد بن گیا تھا، میں فرار ہونے والا تھا

----کہ یکایک جورگن آموجود ہُوا لیکن میں اُسے جُل دے کر بھاگ نکلا۔ روسی جاسوس کتوں کے ساتھ میری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، لیکن میں بحفاظت اپنے ٹھکانے تک جا پہنچا۔ ابلال، ارفع اور ارمغان، راک کو قتل کرنے کے لیے چھُپ کر اس کے کمرے میں داخل ہوئے مگر راک ان کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا اور اُس نے عہد کیا کہ وہ روسیوں کے خلاف جدّوجہد میں مجاہدین کا ساتھ دے گا۔ اس کا نام حبیب بحر رکھا گیا۔ ہم پانچوں مل کر مجاہدین کے سب سے بڑے دشمن وائزمین کو ٹھکانے لگانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور حبیب بحر نے اطلاع دی کہ مکان کو چاروں طرف سے گھیرا جاچکا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیں

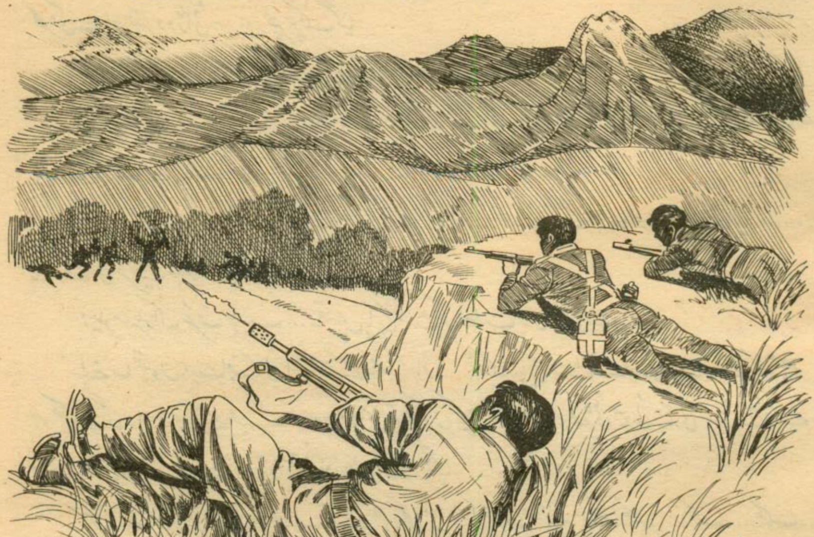

حبیب کے ادا کئے ہوئے الفاظ ناقابلِ یقین تھے..... ایک لمحہ کے لئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری رُوح قبض کرلی گئی ہے اور اب میں پتّھر کا ہو کر رہ گیا ہوں.. میری نگاہیں اَبلال کی طرف اُٹھیں وہ بھی دَم سادھے بیٹھا تھا اور اس حیرت انگیز انکشاف سے دو چار تھا۔

حبیب کی حالت سب سے مختلف تھی میں صاف دیکھ رہا تھا کہ اِس کا پورا جسم ایک انجانے خوف سے لرز رہا ہے..... نہ جانے کیوں جب کہ وہ ایک بہادر اور جانباز مرد تھا.....

" تم..... تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو! میں نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا.....

"شاید..... شاید تم "کے جی بی" سے ناواقف ہو..... شیر زمان..... وہ..... وہ لوگ مرے ہوئے جسم میں بھی جان ڈال کر اپنی تحقیقات مکمل کرتے ہیں..... ایک زمانہ میں..... میں بھی اِسی تنظیم سے وابستہ تھا اس لئے میں انہیں بہ آسانی سمجھ سکتا ہوں" حبیب نے لرزتے ہاتھوں سے پانی کا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ گھبراہٹ میں پانی اس کے کپڑوں پہ گر رہا تھا۔

" لیکن ہم اس طرح باآسانی گرفتار نہیں ہو جائیں گے"۔ ابلال نے جلدی سے کہا..

ہاں ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا اور باہر اَرمغان اور اَرفع بھی تو موجود ہیں ۔" مجھے جیسے یاد آگیا تھا..... میں نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی..... اور پھر چونک گیا۔

باہر کئی مُسلح افراد مکان کی طرف رُخ کئے کھڑے تھے......

" واقعی گھر کے باہر سخت پہرہ ہے اور ہمارے بھاگنے کے ایک فیصد بھی امکان نظر نہیں آرہے" میں نے پردہ برابر کرتے ہوئے کہا۔

ٹرن..... ٹرن..... فون کی گھنٹی نے ماحول کو تھرّا دیا..... حبیب آگے بڑھا اور ریسیور اُٹھا لیا...... میں نے بھی قریب جاکر کان لگالیا.....

" ہیلو مسٹر راک عُرف حبیب..... تمہیں پانچ منٹ کی مُہلت دی جاتی ہے......"

" اپنے ساتھیوں سمیت بغیر کوئی ہنگامہ کئے باہر آجاؤ..... ٹھیک پانچ منٹ کے بعد یہ عمارت راکھ کا ڈھیر ہو چکی ہوگی۔ اور اس کے ملبہ کے اندھیروں میں تم لوگوں کی سسکتی اور دم توڑتی ہوئی زندگی ہمیشہ کے لئے ڈوب جائے گی" وہاں سے آواز آئی اور فون رکھ دیا گیا۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا..... حبیب بھی گھڑی ہی کی طرف متوجہ ہوا تھا ٹک..... ٹک..... ٹک.. گھڑی کی سوئی دھیرے دھیرے ہماری موت قریب ترلاتی جا رہی تھی.....

حبیب نے رومال سے ماتھے پر موجود پسینہ صاف کیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔گھبراہٹ ہمارے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی ہوش اور ہمّت سے ہی کام لے کر شاید ہم کامیاب ہو سکیں ' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

" مگر..... مگر..... حبیب نے بمشکل تھوک نگلا۔

" سنو باہر ہمارے آدمی موجود ہیں..... ہوسکتا ہے وہ دھیان بانٹنے میں کامیاب ہو جائیں..... "

" شاید تمہیں پتہ نہ ہو..... ہمارا ایک خاص اِشارہ ان کو ہماری ناکامی کی طرف متوجہ کر سکتا ہے" میں نے کہا اور سامنے موجود ٹارچ اُٹھالی اور اس پر لال کاغذ چڑھا کر کھڑکی کی طرف لایا اور آن آف کرنے لگا۔ مجھے اُمید ہے کہ جی بی کے نمائندے کچھ نہیں سمجھے ہوں گے لیکن اَرفع اور اَرمغان سمجھ گئے ہوں گے میں نے ٹارچ رکھتے ہوئے کہا۔

' یعنی اب ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا " ابلال نے کافی دیر بعد زبان کھولی۔

ہاں! میں نے مختصر سا جواب دیا اور ہلکا سا پردہ اُٹھا کر باہر جھانکنے لگا۔

تم دونوں تیّار رہو جیسے ہی وہاں سے جواب ملا ہم بھی حملہ کر دیں گے..... ہمارے پاس مورچہ موجود ہے لیکن وہ لوگ کُھلی جگہ پر ہیں یا تو بھاگیں گے یا اپنی جان قربان کر دیں گے" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ روسی نمائندوں کے پیچھے شعلے لپکے اور دو چیخیں سُنائی دیں.....

" اللہ اکبر! حملہ ہوگیا آؤ میدانِ جنگ میں کود پڑو....." میں نے کہا اور گیلری کی طرف چھلانگ لگائی..... اور مشین گن کا ایک برسٹ مارا..... رات کی تاریکی میں شعلے لپکے اور انسانی چیخوں سے زمین ہل گئی۔

" اِنہوں نے ہم پر دو طرف سے حملہ کر دیا ہے..... تیّار ہو جاؤ" نیچے سے ایک گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

اور پھر وہ لوگ اِدھر اُدھر ہٹنے لگے..... اِن کی گھبراہٹ ہمارے لئے اچھا موقع تھا..... دونوں اطراف کی فائرنگ سے وہ پہلے بوکھلا گئے..... اور اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔

" بے وقوفوں اپنے آپ کو دو گروہوں میں تقسیم کرو..... ایک پچھلے اور ایک اگلے حصّہ میں فائرنگ کرے" وہ ہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

" یس..... یس..... سر" بہت سے اَفراد کی خوف سے بھری لرزش کی آواز سنائی دی" اب ہمیں ان پر سبقت حاصل ہے..... میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے..... اگر ان میں سے کوئی بھی زندہ بچ گیا تو آگے ہمارے لئے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے..... سو اس کا ایک ہی حل ہے کہ ایک بھی آدمی زندہ نہ بچے اس کے لئے ہمیں چاروں

سمت سے حملہ کرنا ہوگا...." میں نے کہا بات سمجھ میں آگئی...." میں سیدھے ہاتھ کی طرف سے اور تم ابلال کے ساتھ الٹے ہاتھ کی طرف جاؤ۔ اور تم یہیں سے حملہ کرتے رہو" حبیب نے کہا اور بالکونی کے آخری حصّہ کی طرف بڑھ گیا۔ شاید وہ کونے سے چھلانگ لگا کر ساتھ والے مکان کو اپنا مورچہ بنا کر فائرنگ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ابلال بھی دوسری طرف روانہ ہوگیا اور پھر چیخوں اور آہوں کا بازار گرم ہوگیا...."اللہ کے فضل سے ہم لوگ ایسے مقامات سے فائرنگ کر رہے تھے جو سو فیصد محفوظ تھے ورنہ ہمارا حشر بھی شاید اِن ہی جیسا ہوتا۔"

کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی.... میں یہ دیکھ رہا تھا کہ کوئی فرار تو نہیں ہو رہا لیکن مجھے کسی کے بھاگنے یا سر کنے کی آواز نہیں آئی..... کچھ زخمی اپنے بہتے ہوئے خون اور درد سے کراہ رہے تھے۔

سب سے پہلے میں قریب پہنچا ٹارچ کی روشنی میں مجھے ویران اور مُردہ چہرے نظر آئے کسی کے سر پر گولی لگی تھی خون چہرے پر موجود ہونے کی وجہ سے وہ پہچانا بھی نہیں جارہا تھا کسی کے پیٹ کسی کے دِل کے پاس ....ایک دو مرتے ہوئے روسی کتوں کو میں نے سانس روک کر موت کی وادی تک پہنچا دیا نا معلوم ان کافروں کو مارنے سے ہمیں کتنا ثواب ملے گا....

کُل دس کے قریب آدمی تھے....ان میں ہر ایک کا لباس دوسروں سے مختلف تھا۔اور شاید یہ وہ ہی تھا جو چلّا چلّا کر صدائیں دے رہا تھا۔

ہمیں جلد از جلد یہاں سے فرار ہو جانا چاہیئے، میں نے اُٹھتے ہوئے کہا اور پھر کسی خیال سے بیٹھ گیا۔
میں ہر ایک کی تلاشی لینے لگا اور پھر مجھے کامیابی ہوگئی۔

"یہ کیا کر رہے تھے تم.....؟" حبیب نے سوال کیا۔

میں اِن کے ہاتھ سے کپڑے کے وہ پٹے اُتار رہا تھا جو انہیں کے جی بی کا نمائندہ ثابت کرتے ہیں..... اس سے ہمیں آگے فائدہ ہو سکتا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اوگڈ!" ابلال نے کہا۔

ارمغان اور ارفع بھی اب ہمارے ہی ساتھ تھے۔

اپنی گاڑی اِسٹارٹ کرو.....ہمیں واپس پہاڑیوں کی طرف چلنا چاہیئے۔ میں نے کہا اور تینوں جانباز لڑکوں کی طرف دیکھنے لگا۔

تمہاری ایجاد کردہ بوتل بم اور وہ دَوا جو اگر کسی کو سونگھا دی جائے تو وہ آدمی لمحہ بھر میں موت کی وادیوں میں چلا جاتا ہے کے چرچے میں نے سنے اور تم یقین کرو.....ان ایجادات کا توڑ اب تک وہ لوگ نہیں کر پائے

ہیں" حبیب نے ماشیر کے متعلق بات مکمل کرتے ہوئے کہا......

"ہاں یہ بات تو ہے..... لیکن اب ایک مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ماشیر تک پہنچنے کے لئے اِن تاروں سے گزرنا ہو گا جن میں ہزاروں وولٹ کی بجلی دوڑ رہی ہے..... اس کے متعلق ابلال تم نے کچھ سوچا ہے" ارفع شاید اس سوال کا جواب حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"میں نے کل رات اس مسئلہ پر سوچا تھا.... اور پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔"

ابلال نے سسپنس پیدا کرنے کی کوششیں کی۔

"وہ کیا؟" سب ہی چونک پڑے ان میں میں بھی شامل تھا۔

"سنا ہے..... ہزاروں وولٹ کی اس دوڑتی ہوئی بجلی سے اگر کوئی ربڑ ٹکرائے تو اندر ساٹرن وغیرہ نہیں بجتا" ابلال نے کہا تو حبیب نے حمایت میں سر ہلا دیا۔

میں اس تار پر ربڑ کی ایک سیڑھی پھینکوں گا آپ سب کو پتہ ہی ہو گا کہ ربڑ اور کرنٹ دو الگ الگ چیزیں ہیں سو یہ سیڑھی کافی موٹی ہو گی اور اس کو پھینکنے میں آپ سب ہماری مدد کریں گے.... اور پھر اس سیڑھی کو رسّی سے کسی درخت سے باندھ دیا جائے گا اس طرح ہم تار سے دور رہ سکیں گے..... پھر اس پر لٹک کر ہم دوسری طرف چھلانگ لگالیں گے...."

"ویری گڈ آئیڈیا..... میں تمہیں سلام پیش کرتا ہوں" حبیب نے متاثر کن لہجے میں کہا۔

رات کی سیاہ تاریکی میں ہم نے فیز نمبر ۳ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ایک دِن کی مسافت کے بعد ہم لوگ کابل پہنچے تھے یہ سفر ہم نے گاڑی میں کیا تھا اس وقت تقریباً رات کے تین بج رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم فیز نمبر ۴ کے اگلے اور فیز نمبر ۲ کے پچھلے حصّہ میں کھڑے تھے۔

دوڑ دوڑ کر اس کرنے کے بعد ہم لوگ اس جگہ پہنچ گئے جہاں ماشیر کا گھر تھا.... یا یہ کہہ لیں کہ اس کی حفاظت گاہ... ربڑ کی بھاری سیڑھی ہمارے پاس موجود تھی ایک طرح سے ہم زندگی کا رِسک لے کر یہ کام کر رہے تھے..... ہو سکتا تھا اوپر چڑھتے ہوئے پاؤں یا جسم کا کوئی بھی حصّہ اگر تاروں سے لگ جائے تو موت یقینی ہے لیکن ملک کو دشمنوں سے آزاد کرانے کے لئے ہمیں یہ رِسک لینا ہی پڑے گا سیڑھی کے آگے ربڑ کے ہی کُنڈے بھی لگے ہوئے تھے جو تاروں میں پھنس کر ہمیں اوپر چڑھنے میں مدد دے سکتے تھے۔

سب نے مل کر اللہ کا نام لیا اور سیڑھی پھینکی.... اللہ کے نام میں کتنی برکت ہے اس کا اندازہ آپ اس

بات سے لگا سکتے ہیں کہ پہلی ہی دفعہ تاروں میں کُنڈے پھنس گئے۔

سب نے مل کر جلدی سے قریبی درخت سے دونوں حصّوں کو باندھا اور پہلے میں لٹکتا ہوا اُوپر چڑھنے لگا۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور مجھے احساس تھا کہ نیچے والوں کا بھی یہی حال ہو گا۔

اللہ کے فضل سے میں اُوپر چڑھا اور رسّی پر پاؤں رکھ کر دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ دوسری طرف زمین تھی۔ میں گرا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک طوفان میرے اُوپر سے گزر گیا ہے کیونکہ سخت زمین پر گرنے سے کافی چوٹیں مجھے لگی تھیں۔ دھیرے دھیرے وہ سب لوگ اُوپر آنے لگے ... ایک لمحہ ایسا بھی آیا جس نے ہم سب کے دل ہلا کر رکھ دیئے۔ ارمغان اوپر چڑھ کر بوجھ نہ سنبھال سکا اور تاروں کی طرف گرنے لگا۔ اچانک وہ سنبھل سا گیا اور ایک دم سیڑھی کی رسّی کو پکڑ لیا.... پھر وہ سنبھل کر میری طرف کودا۔

"سنو تم وہ دوا نکالو جو سب کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے" میں نے اجلال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک اسپرے میری طرف بڑھا دی۔ ہم چاروں نے ماسک چڑھائے اور دروازوں کے سوراخ سے اسپرے کا بٹن دبا دیا۔ گیس بہت معمولی سی نکلی۔ ہم لوگ پیچھے کھڑے ہو گئے۔ اندر سے کھانسی کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ لوگ یقیناً جہنم رسید ہو گئے تھے۔ میں نے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے اندر کا حال عجیب سا تھا۔ سب ہی کے ہاتھ اپنے گلے کی طرف بڑھے ہوئے تھے۔ چہرے عجیب سے ہو گئے تھے۔ اور منہ کھلا ہوا تھا۔ شاید وہ ناگہانی آفت سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے دم گھٹتے ہوئے سانس کو روکنے کے لئے کھڑے بھی ہونے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ دوسری منزل پر بھی کوئی نہیں تھا۔ اور گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

میں اوپر چڑھ گیا۔ تیسری منزل پر ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ دو فوجی اس دروازے پر پہرہ دے رہے تھے یہی کمرہ ماتیر کی آرام گاہ تھا۔ میں سیڑھیوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ اور بے آواز ریوالور سے اُن کا نشانہ لیتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ گولی پہلے والے شخص کی کنپٹی پر لگی اور وہ بغیر آواز نکالے زمین پر آگرا۔ دوسرا اس پر جھکا لیکن دوسرے ہی لمحے دوسری گولی نے اُسے بھی زمین پر گرنے پر مجبور کر دیا۔

"آؤ!" میں نے سرگوشی کی اور اُوپر چڑھ گیا۔ بغیر آواز پیدا کیے ہم اس دروازے تک پہنچے اور پھر خاموشی سے دروازہ کھول دیا۔

اندر زیرو کا بلب جل رہا تھا۔ اور سامنے وہ ہی آدمی جس کی ہم نے تصویر دیکھی تھی گہری نیند سو رہا تھا۔ سب اندر آگئے تو میں نے دروازہ بند کر دیا اور کنڈی لگا دی۔ اور ماتیر کے قریب جا کر اسے ہلانے لگا۔ کچھ لمحوں تک تو وہ بے سُدھ رہا۔ اور پھر اچانک چونک کر اُٹھ بیٹھا .... دُوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں: "آواز نہیں نکالنا ورنہ یہ"....

میں نے ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ "تم لوگ ۔۔۔ تم لوگ ۔۔۔"

"سب سوالوں کے جواب تمہیں مل جائیں گے۔ لیکن سرگوشی شرط ہے۔ اگر تم نے چلّانے یا زور سے بولنے کی کوشش کی تو ہمیں معلوم ہے تم دل کے مریض ہو اور تیسرا ہارٹ اٹیک تو ویسے بھی جان لیوا ثابت ہوتا ہے"۔ ارمغان نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

"مجھے ۔۔۔ مجھے پیاس لگی ہے" اس نے تھوک نگل کر کہا۔ "لو یہ دودھ پی لو۔ شاید آج تم نے دودھ نہیں پیا۔ اس لئے میز پر رکھا ہوا ہے"۔ آرفع نے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ کانپتے ہاتھوں سے دودھ پینے لگا۔ اس کے کپڑے گرتے ہوئے دودھ سے گیلے ہو گئے تھے۔

"ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہا تم نے زہر ملا دودھ پی لیا"۔ حبیب نے اچانک کہا۔

"ہیں ! ۔۔۔ کیا اس میں زہر تھا۔؟" ماشیر نے دل کو تھامتے ہوئے کہا۔

"ہاں ۔ اگر تم ہماری مدد کرو تو ہم بھی تمہاری مدد کرنے کو تیار ہیں۔ یہ زہر دس منٹ بعد اثر کرے گا۔ اتنی دیر میں تم اپنے خفیہ اڈے جہاں اسلحہ موجود ہے اور دوسری معلومات کی فائلیں ہمیں دے سکتے ہو"۔ میں نے مسکرا کر کہا "۔ ہاں ہاں کیوں نہیں" اس نے کہا۔ اور اپنے گلے میں موجود ہار میں سے چابی علیحدہ کی اور بھاگتے ہوئے سیف کھولا۔ اور کچھ فائلیں وغیرہ نکالنے لگا۔ اس کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ اسے زندگی بہت عزیز ہے۔

"یہ ۔۔۔ یہ لو۔ یہ ساری فائلیں ہی خفیہ رازوں اور دیگر اہم معلومات سے بھری ہوئی ہیں۔ اب تو مجھے وہ دوائی دے دو نا"۔۔۔۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "نہیں اب یہ بتاؤ وائزمین کہاں ہے"؟

حبیب نے سوال کیا۔ "وہ ۔۔۔ وہ ایک ہفتہ بعد جلال آباد آرہا ہے۔ اس کا قیام پہاڑیوں کے پاس والے علاقے میں ہوگا۔ بس اب مجھے نہ تڑپاؤ"۔۔۔۔ "ٹھیک ہے یہ لو" میں نے ایک شیشی زمین کی طرف پھینکی۔ وہ زمین پر گر کر ٹوٹ گئی اور اس میں موجود دوائی زمین پر پھیل گئی۔ "لو اب اسے چاٹ کر اپنی زندگی بچا سکتے ہو تو پی لو اسے"۔ حبیب نے مسکرا کر کہا۔

ماشیر کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ زمین پر لیٹ گیا اور دوائی چاٹنے لگا۔ اس کی کیفیت اس وقت بالکل اُس کتے کی مانند تھی جو بھوکا اور پیاسا ہو اور پھر اچانک اسے روٹی کا باسی ٹکڑا یا زمین پر گرا ہوا دودھ مل گیا ہو۔ ماشیر کے پورے چہرے پر دوائی لگ گئی تھی۔

میں قہقہہ لگانے لگا۔ "مسٹر ماشیر سنو"! میں نے کہا تو وہ چونک کر میری طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"کیا...... کیا" وہ ہکلاتا ہوا بولا۔

میں اس کے قریب آیا اور بولا" دودھ میں زہر نہیں تھا بلکہ زہر تو یہ ہے جسے تم چاٹ رہے ہو"۔

•— کیا واقعی ماشیر زہر چاٹ رہا تھا۔؟

•— وطن کے پاسبان آگے کیا کرتے ہیں؟

•— وائزمین سے ان کی ٹکر کن حالات میں ہوتی ہے۔؟ (باقی آئندہ)

قرآنِ پاک کا معجزہ

کافی سال پہلے کی بات ہے۔ ملتان میں قرآنِ مجید کا جھوٹا حلف اُٹھانے والا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہ عبرتناک واقعہ مقامی تھانہ حرم گیٹ (ملتان) میں پیش آیا۔ کہا جاتا ہے کہ کالے منڈی کے ایک شخص نے تھانے میں جاکر درخواست دی کہ مخالف پارٹی غلام مصطفےٰ عرف مستو نے اس پر خنجر سے حملہ کیا ہے۔ دونوں پارٹیوں کے افراد تھانے پہنچ گئے۔ ملزم کی طرف سے ایک باریش بزرگ شیخ بھاگاں نے تجویز پیش کی کہ اگر درخواست گزار قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ دے کہ اس پر لیاقت نامی شخص نے واقعی خنجر سے حملہ کیا ہے تو مستو کے خلاف مقدمہ درج کرکے اُسے گرفتار کر لیا جائے۔ اس پر شیخ نصیرالدین نامی شخص قرآنِ مجید اٹھانے پر تیار ہو گیا۔ اُس نے قرآنِ مجید سر پر رکھ کر کہا کہ لیاقت خنجر سے حملہ آور ہُوا ہے اور اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو مجھ پر قرآن کی مار پڑے۔ قسم کھانے کے فوراً بعد شیخ نصیرالدین کی حالت غیر ہو گئی۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے قرآنِ پاک کو نیچے رکھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے گھر واپس پہنچا۔ جہاں اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اُسے خطرناک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں وہ دم توڑ گیا۔

آدابِ طعام

اگر کھانا کھاتے وقت بسم اللہ نہ پڑھی جائے تو شیطان اس کھانے کو اپنے لئے حلال سمجھتا ہے، اگر بسم اللہ پڑھنا بھول جاؤ تو بِسمِ اللہِ اَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ پڑھ لیا کرو۔ کھانا ہمیشہ اپنے سامنے ہی سے کھاؤ، سب مل کر کھانا کھاؤ کیونکہ مل کر کھانے سے برکت ہوتی ہے، اور خوب سیر ہو کر کھانا بھی بے برکتی کا باعث ہے۔

پریاں کہاں رہتی ہیں

قرۃ العین مسلیم

فیصل ایک بہت پیارا اور ذہین بچہ تھا۔ خوب پڑھ لکھ کر کلاس میں اوّل آنے والا، سب کے کام آنے والا۔ اسے کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ پیاری پیاری پریوں والی، تاج پہنے ہوئے بادشاہ والی، نیک دل لکڑہارے اور بہادر شہزادے والی ایسی ڈھیر ساری کہانیاں اس کے پاس تھیں۔ اسکول سے فارغ ہوکر آئے ہیں۔

"فیصل کھانا کھا لیجئے کیا پڑھ رہے ہیں"؟

"نیلی پری کی کہانی پڑھ رہے ہیں"

"فیصل آپ کے دوست کرکٹ کھیلنے کے لئے بلا رہے ہیں کیا کر رہے ہیں؟"

"نیک دل لکڑہارے کی کہانی پڑھ رہے ہیں۔"

"فیصل میاں اتنی رات گئے کون سی کہانی پڑھی جا رہی ہے؟"

"جی "جادو کی چھڑی" ہے۔"

صبح، دوپہر، شام، رات جب بھی فرصت ملتی کوئی کام نہ ہوتا، وہ ہوتے، کہانیاں ہوتیں اور اُن کے اور کہانیوں

کے درمیان ایک موٹی سی عینک جو انہوں نے کہانیاں پڑھ پڑھ کر لگوالی تھی۔

پیارے بچو! فیصل صاحب یہ کہانیاں پڑھ پڑھ کر خود کو بھی نیک اور بہادر شہزادہ سمجھنے لگے تھے۔ ان کا بھی بہت دل چاہتا کہ وہ نیک دل شہزادے کی طرح سب کے کام آئیں۔ کسی بوڑھے فقیر کو سڑک پار کرائیں تو لال پروں والی پری انعام میں ڈھیر ساری چاکلیٹ اور کھلونے دے، روپوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی دے جس سے وہ فوراً کہانیوں کی کتابیں خریدیں۔ کبھی مشکل میں پھنسیں، امتحان کے سوال یاد نہ ہو رہے ہوں، تو نیلی پری اُن کی مدد کو آئے اور انہیں جادو کی چھڑی دے جس سے ہر کام فوراً ہو جائے۔ وہ ہمیشہ بوڑھے لوگوں کو سڑک پار کرا دیتے۔ اُن کا سامان اٹھا کر گھر چھوڑ آتے مگر کبھی کسی پری نے انہیں چاکلیٹ نہیں دیئے۔ ٹمی کے کتے کو سخت سردی میں جا کر کمبل اوڑھا آئے۔ کسی پری نے خوش ہو کر جادو کی چھڑی نہیں دی۔ نیک دل لکڑ ہارے کی طرح اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام آئے مگر رنگ برنگی پریوں نے آکر خوشی کا رقص نہیں دکھایا۔ اب تو فیصل سخت مایوس ہونے لگے تھے۔ دنیا میں کوئی پری نہیں ہے جو آکر خوشی سے ناچ کر دکھائے، چاکلیٹ کھلائے، کہانیوں کی کتابیں دلائے غصے میں آکر انہوں نے بادشاہ اور پریوں والی کہانیاں پڑھنا چھوڑ دیں۔ اب وہ نائٹ رائیڈر دیکھنے لگے تھے اور فرصت کے وقت کہانیاں پڑھنے کے بجائے ویڈیو گیم کھیلتے۔

آج اسکول سے آکر وہ بہت اُداس تھے۔ کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا تھا۔ بار بار اس بوڑھے شخص کا خیال آ رہا تھا جو کسی نیک دل بچے کا منتظر تھا جو اسے سڑک پار کرا دے۔ مگر انہوں نے اسے سڑک پار نہیں کرائی تھی اور گھر آگئے تھے۔ مگر اب انہیں خود پر غصہ آ رہا تھا۔ میں اتنا لالچی ہوں کہ ایک جادو کی چھڑی کے لئے نیک کام کروں جبکہ امی کتنی بار کہہ چکی تھیں کہ آپ کے ہاتھ جادو کی چھڑی سے زیادہ مضبوط ہیں۔ اُن سے محنت کر کے سارے کام لئے جا سکتے ہیں۔ میں بہت برا ہوں۔ انہوں نے سخت غمگین ہو کر سوچا۔ اس بوڑھے شخص نے کتنی مشکل سے سڑک پار کی ہوگی۔ انہیں رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ اسی غم میں وہ شام کو دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے بھی نہ گئے۔

"کیا بات ہے فیصل آج آپ اتنے خاموش کیوں ہیں؟"

آخر امی نے پوچھ ہی لیا۔ امی کا پوچھنا تھا کہ فیصل اُن کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

"امی میں بہت برا ہوں شاید لالچی بھی ہوں" انہوں نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

"کیوں، کیوں؟" امی نے حیران ہو کر کہا۔

"آپ تو بہت اچھے ہیں۔ سب کے کام آتے ہیں" امی نے ان کے بال ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"مگر امی آج میں نے ایک بوڑھے شخص کو سڑک پار نہیں کرائی اس لئے کہ مجھے کسی پری نے آکر جادو کی چھڑی نہیں دی جسے ہلا کر میں چاکلیٹ منگوالوں۔ کہانیوں کی کتابیں منگوالوں اور کرکٹ کا سامان منگوالوں۔ میں بہت برا ہوں امی، مگر یہ پریاں

رہتی کہاں ہیں، ملتی کیوں نہیں ہیں۔ مجھے جادو کی چھڑی نہیں چاہئے مگر مجھے یہ تو معلوم ہو وہ رہتی کہاں ہیں"۔

فیصل اسی طرح امی کے گلے سے لگے روتے رہے اور رو رو کر کہتے رہے۔

"اچھا آپ یہاں میرے برابر میں بیٹھئے میں آپ کو بتاتی ہوں کہ پریاں کہاں رہتی ہیں"۔

فیصل کی امی نے فیصل کو اپنے برابر میں بٹھا کر ان کے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ فیصل کا دل دھڑک اٹھا۔ امی کو معلوم ہے پریاں کہاں رہتی ہیں؟ "امی جلدی بتائیے پریاں کہاں رہتی ہیں"! انہوں نے جھٹ آنسو پونچھ کر خوشی سے پوچھا۔

"بیٹا پریاں دل میں رہتی ہیں۔ جب آپ کوئی اچھا کام کرتے ہیں تو ناچتی ہیں، گاتی ہیں اور بہت خوش ہوتی ہیں"

دل میں رہتی ہیں فیصل کی سمجھ میں نہ آیا کیا مطلب؟ وہ کوئی اچھا کام کرکے دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کیسے ناچتی اور گاتی ہیں۔

کھانا کھا کر وہ یہی سوچتے ہوئے باغ میں آگئے۔ باغ میں رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ مگر ان کا دل اداس تھا۔ وہ ایک کرسی پر آ بیٹھے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے تب ہی آم کے درخت میں بنے ایک گھونسلے سے چڑیا کا ایک بچہ گھاس پر آ گرا۔ چڑا اور چڑیا بھی گھبرا کر اپنے گھونسلے سے باہر نکل آئے اور چوں چوں کرکے بچے کے اردگرد پھرنے لگے۔ وہ بہت پریشان لگ رہے تھے اور ان کا بچہ بے بسی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ فیصل نے جلدی سے اسے اُٹھالیا۔ میں کیسے اسے دوبارہ گھونسلے میں رکھوں یہ تو بہت اونچا ہے۔ فیصل نے پریشانی سے سوچا۔ ایک لمحے کے لئے ان کے دل میں خیال آیا کہ جادو کی چھڑی ہوتی تو وہ فوراً .... مگر انہیں یاد آیا کہ امی نے کہا تھا کہ آپ کے ہاتھ جادو کی چھڑی سے زیادہ قیمتی اور مضبوط ہیں۔ آپ کا ذہن جادو کی چھڑی سے زیادہ تیز کام کرسکتا ہے۔ وہ جلدی سے اسٹور کی طرف چلے گئے اور اپنے ننھے ہاتھوں سے سیڑھی کھینچ کر باغ میں لے آئے۔ ان کے ہاتھ زخمی ہوگئے مگر انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی۔

"فیصل نائٹ رائیڈر شروع ہوگئی ہے۔ آجائیے"۔

امی نے کمرے ہی سے آواز لگائی۔ مگر انہوں نے بالکل پرواہ نہیں کی۔ اور سیڑھی کو درخت سے ٹکا کر اوپر چڑھ گئے۔ اور چڑیا کے بچے کو گھونسلے میں رکھ دیا۔ وہ شکر گزار نظروں سے فیصل کو دیکھنے لگا چڑیا اور چڑا بھی فیصل کے گرد خوشی سے چکر لگانے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ شکریہ ادا کر رہے ہوں اور دعا دے رہے ہوں۔ فیصل اب اداس نہیں رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھے بہت زیادہ۔ انہیں نائٹ رائیڈر کے نکلنے کا بالکل بھی افسوس نہیں ہو رہا تھا۔ دل میں خوشی کی پیاری پیاری سی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ تب انہیں یاد آیا کہ امی نے کہا تھا کہ پریاں دل میں رہتی ہیں اور نیک کام کرنے پر ناچنے لگتی ہیں۔ ان کے دل میں خوشی کی جو لہریں اُٹھ رہی تھیں وہ بہت پیاری، بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

چاکلیٹ سے بہت اچھی، کہانیوں کی کتابوں سے بھی اچھی، کرکٹ کے سامان اور جادو کی چھڑی سے بھی اچھی۔ فیصل کو لگا جیسے اُس کے دل میں پریاں ناچ رہی ہیں۔

بیجنگ

اب کراچی سے ہفتہ میں تین پروازیں

جمعرات کو کراچی سے سیدھے بیجنگ

اتوار اور منگل کو براستہ اسلام آباد

۶ر مئی ۱۹۸۷ء سے پی آئی اے نے بیجنگ کیلئے
اپنی تینسری پرواز دوبارہ شروع کردی ہے۔
قراقرم کی بلند و بالا، خوبصورت اور پرشکوہ
چوٹیوں پر سے گزرتی ہوئی تین آرام دہ پروازیں...
ایک عظیم منزل کی طرف رواں دواں!

دن			منگل	جمعرات	اتوار
فلائٹ نمبر			۷۵۴	۷۵۰	۷۵۲
جہاز			بی ۷۰۷		
درجہ			ایف/وائی		
کراچی	روانگی		۰۵۲۰	۰۶۰۰	۰۴۰۰
اسلام آباد	آمد		۰۷۱۵		۰۵۵۵
	روانگی		۰۸۲۰		۰۷۰۰
بیجنگ	آمد		۱۷۵۰	۱۶۵۰	۱۶۳۰

۶ر مئی ۱۹۸۷ء سے نافذالعمل — تمام اوقات مقامی ہیں۔

مزید معلومات کے لئے قریبی پی آئی اے بکنگ آفس یا اپنے ٹریول ایجنٹ سے رابطہ قائم کیجئے۔

پی آئی اے PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ - لاجواب پرواز

PID(ISLAMABAD) IAL-IPP-8-87

نُور کا ہالہ

تسنیم شکیل احمد

فضل دین بڑی دیر سے اُداس بیٹھا تھا۔ آج اُس کے کانٹے میں کوئی مچھلی نہ پھنسی تھی۔ اُس کے بیٹے ناصر کے اسکول کی فیس ادا کرنے کی آخری تاریخ بہت قریب آگئی تھی۔ "اگر فیس نہ دی گئی تو ناصر کا نام اسکول سے کاٹ دیا جائے گا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اب مزید مُہلت نہ دیں گے۔ وہ پہلے ہی ایک ہفتہ کا وقت دے چکے ہیں...... تو کیا پھر ناصر بھی ایک مچھیرا ہی بنے گا؟" جیسے وہ خود اسکول ٹیچر بننے کا خواب دیکھتے دیکھتے مچھیرا ہی بن سکا۔ فضل دین کا دماغ پریشان کُن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا...... "لیکن میں تو ناصر کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا ہوں"۔ اس نے حسرت سے سوچا "جبکہ میرے بابا تو سِرے سے میری تعلیم ہی کے خلاف تھے"۔ سوچوں کے سمندر میں اس کے خیالات کی کشتی بچپن کے جزیرے میں جا پہنچی جب وہ ننّھا فضلو تھا اور اسے پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔ اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ صاف ستھرا لباس پہن کر گلے میں بستہ ڈال کر روزانہ اسکول جایا کرے۔ خوب ڈھیر سارا علم حاصل کرے اور ایک دن خود بھی استاد بن جائے۔ اور واقعی اُسے جب بھی موقع ملتا وہ بچّوں کو اکٹھا کر کے لسوڑھے کے درخت کے نیچے آجاتا اور اسکول اسکول کھیلتا۔ خود ماسٹر صاحب کا رُوپ دھار لیتا' دوسرے بچّے شاگرد بن جاتے اور پھر وہ انہیں پڑھانے لگتا۔ جو بھی اچھی اچھی باتیں اسے معلوم تھیں' بچّوں کو بتاتا۔ ایسے میں اکثر ہی اُس کے بابا اُسے ڈھونڈتے ہوئے آجاتے اور بہت ناراض ہوتے۔ "پڑھ لکھ کر تجھے کیا ملے گا۔ کیوں اپنا وقت برباد کرتا ہے؟" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کھیل چھوڑ چھاڑ بابا کے ساتھ ہو لیتا کیونکہ وہ ایک بہت ہی فرماں بردار بچّہ تھا اور اپنے بابا سے بہت مُحبّت بھی کرتا تھا۔ بابا ہی اس کے باپ بھی تھے

اور مال بھی۔ راستہ بھر بابا بولتے چلے جاتے" پڑھ لکھ کر بھی تجھے محنت مزدوری ہی کرنی ہے۔ ایک مچھیرے کے بیٹے کو کون اچھی نوکری دے گا۔ غریب کی کیا عزّت ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ کیونکہ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں، دنیا دیکھی ہے۔" وہ چپ چاپ سر جھکائے بابا کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ گھر پہنچ کر ٹوکرا اٹھاتا اور دونوں باپ بیٹا مچھلیاں پکڑنے دریا کے کنارے نکل جاتے۔ لیکن مچھلیاں پکڑتے ہوئے بھی وہ سوچ و فکر ہی الجھا رہتا۔۔۔۔ اُس کا علم حاصل کرنے کا شوق کسی طور ختم نہ ہوتا بلکہ شاید بڑھتا ہی جاتا تھا۔

ایک دن وہ مسجد سے باہر کھڑا پُر شوق نگاہوں سے بچّوں کو قرآن پاک پڑھتے دیکھ رہا تھا کہ مولوی صاحب کی نگاہ اس پر پڑی۔ مولوی صاحب اُس کے ذوق شوق سے بہت متاثر ہوئے اور وہ ان سے قرآن پڑھنے مسجد جانے لگا۔ وہ دل لگا کر پڑھتا رہا اور مولانا صاحب اس کی ہمّت افزائی کرتے رہے۔ وہ ان کی سب باتیں بہت دھیان سے سنتا۔ انہوں نے اسے اسلام کی بنیادی باتیں بہت آسان اور اچھے طریقے سے سمجھائیں۔ اُسے ہمیشہ ایمانداری اور سچّائی سے کام کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ ہر روز ہی وہ ان سے کوئی نہ کوئی اچھی بات سیکھتا رہا اور علم کی اہمیت اس پر بہت اچھی طرح اُجاگر ہوگئی۔ اُس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ علم صرف اچھی نوکری حاصل کرنے کیلئے نہیں حاصل کیا جاتا بلکہ اچھا انسان بننے کیلئے۔ اور اللہ ہمیشہ اچھے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جب وہ بابا کو اچھے موڈ میں دیکھتا تو کہتا" بابا علم حاصل کرنا بڑی عزّت کی بات ہے نا؟ علم انسان کو اچھے برے کی تمیز سکھاتا ہے۔ علم ایک روشنی ہے جس میں سیدھا اور سچا راستہ صاف دکھائی دیتا ہے"۔ اُس کے لہجے میں بڑا اعتماد ہوتا۔ لیکن اس کے سیدھے سادے بابا کو اس کی باتوں کی سمجھ نہ آتی۔ وہ اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیتے بلکہ اپنی شفقت اور محبت کا اظہار اچھی اچھی چیزیں کھلا پلا کر کرتے۔" جا دیکھ میں تیرے لئے مٹھائی لے کر آیا ہوں، طاق میں رکھی ہے جلدی سے لے کر کھالے!"

وقت کا کام تو گزرتے ہی چلے جانا ہے۔ وہ ایک سعادت مند بیٹے کی طرح کے کام میں اُن کا پورا پورا ہاتھ بٹاتا رہا۔ اور ساتھ ہی ساتھ مولوی صاحب سے اچھی اچھی باتیں بھی سیکھتا رہا، اور نہ صرف سیکھتا رہا بلکہ ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ آج جب کہ نہ مولوی صاحب رہے تھے اور نہ ہی اس کے بابا تھے لیکن فضل دین مچھیرا ہونے کے باوجود ایک منفرد شخصیت کا مالک تھا۔ گاؤں بھر میں اُس کی بہت عزّت تھی۔ سب کو اُس سے بڑی محبّت تھی۔ وہ ان کے دکھ سکھ میں کام آتا۔ اپنی اوقات سے بڑھ کر دوسروں کی مدد کرتا اور ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا۔

جو کچھ بھی اُس نے مولوی صاحب سے سیکھا تھا وہ ننھے ناصر کے ذہن میں منتقل کرتا رہتا۔ اپنے اللہ اپنے رسولؐ اور اپنے دین سے محبّت اور عقیدت کی باتیں، وطن سے وفاداری کا جذبہ، اللہ کے بندوں سے ہمدردی اور حُسنِ سلوک کی تلقین۔ سچائی اور دیانتداری کا سبق، میانہ روی سے چلنے کا درس۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عنایت تھی کہ ناصر بھی نہایت

ذہین اور فرماں بردار بچہ تھا۔اس کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔اسکول بہت خوش دلی سے جاتا۔سبق بھی بڑی جلدی یاد کرلیتا۔اُس کا لباس بھی بے حد صاف ستھرا ہوتا اور کتابیں سلیقے سے بستے میں سجی ہوتیں۔اُس کی یہ سج دھج کشادہ پیشانی اور چمکتی ہوئی ذہانت سے بھرپور آنکھوں کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک مچھیرے کا بیٹا ہے۔پھر اُس کا رکھ رکھاؤ اُس کا اخلاق اور اس کی شخصیت کی گوناگوں خوبیاں یقیناً ایسی چیزیں تھیں کہ لوگ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اور یہ اُس علم کا عملی مظاہرہ تھا جس کا درس اُس کے بابا اُسے بچپن سے دیتے آئے تھے۔سچ ہے علم کسی کی میراث نہیں۔

مغموم اور اُداس چہرہ لے کر فضل دین جب گھر پہنچا تو ناصر اسکول سے آچکا تھا۔ناصر سے اُس کی اُداسی چھپی نہ رہ سکی اور وہ اُس سے پوچھ بیٹھا "بابا کیا بات ہے آپ بہت فکرمند نظر آرہے ہیں؟"

"ہاں آں آں.....نہیں تو بیٹے۔ایسی تو کوئی بات نہیں۔تم سناؤ تمہارا کوئی ٹیسٹ تھا آج؟ کیسا رہا؟"

"جی ہاں بابا۔آج میرے دو ٹسٹ تھے۔سائنس اور حساب کے۔میں نے تمام جوابات درست لکھے ہیں"۔ ناصر اسے اسکول کی اور بھی کئی دوسری باتیں بتاتا رہا مگر فضل دین اپنی ہی سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ناصر نے دیکھا بابا نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا ہے۔اب ناصر سے نہ رہا گیا۔وہ اٹھ کر فضل دین کے گلے میں جھول گیا۔

"میرے اچھے بابا اب بتا بھی دیں آپ کیوں پریشان ہیں؟" ناصر کے اصرار پر فضل دین کو بتانا ہی پڑا کہ وہ کیوں پریشان ہے۔ناصر فوراً اٹھ کر کوٹھری میں چلا گیا اور ایک ڈبہ اُٹھا لایا۔اُس نے اس کا ڈھکنا کھول کر وہیں الٹ دیا۔بے شمار سکے ڈھیر ہوگئے۔"یہ کیا ہے بیٹا؟" فضل دین حیران رہ گیا۔

"بابا آپ مجھے روزانہ آٹھ آنے دیتے تھے نا!" "میں ان میں سے کچھ نہ کچھ بچالیا کرتا تھا اور عید لقرعید جو عیدی ملتی وہ بھی زیادہ تر جمع کرلیا کرتا......آپ ہی نے تو مجھے یہ بات بتائی تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور بچانا چاہیئے تاکہ آڑے وقت میں کام آئے۔" ناصر نے سب سکے جمع کرکے گنے تو ایک سو دو روپے اور بارہ آنے نکلے۔فضل دین کے سر سے جیسے منوں بوجھ اتر گیا۔اس کا بیٹا اتنا سمجھدار ہے۔اُس کا دل اللہ کے لئے شکر کے جذبے سے بھر گیا۔اُس کی تربیت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ناصر بہت صحیح راستہ پر جارہا تھا۔

"بابا ایک خوشخبری سنیں" ناصر کی بات سُن کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"آج ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے اپنے آفس میں بلایا اور بتایا کہ ذہین لڑکوں کو جو تعلیمی قابلیت کی بنیاد پر وظیفہ ملتا ہے اُس کیلئے مجھے بھی منتخب کرلیا گیا ہے"۔ فضل دین سجدے میں گر گیا۔وہ اللہ کا شکر ادا کئے جارہا تھا جو کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔آج اللہ نے علم کے ذریعہ ایک مچھیرے کے لڑکے کو عزت دی تھی۔اس نے سجدے سے سر اٹھایا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے نور کا ایک ہالہ ہے اور اس میں مستقبل کے ناصر کا چہرہ جگمگا رہا ہے۔کامیابی و کامرانی، سرفرازی و سربلندی کی منزل دور نہیں تھی۔

●●●

United

PID—I-42/86

جوجی میاں جاسوس بنے

سعیدہ نازش

"جو نوالہ کھاؤ حلال کا کھاؤ" سر سمجھا رہے تھے اور جوجی ان کے تمام ترارشادات کو ذہن میں اُتار رہا تھا۔

"دیکھو بیٹا اگر کوئی شخص ایک کلو دودھ کا سودا کر کے اس میں پانی ملا کر فروخت کرتا ہے تو اس کی کمائی حلال نہ ہوگی۔"

"سر اگر کوئی بچہ میرے جتنا چھوٹا ہو اور اس کے ابو ملاوٹ کرتے ہیں، کم تولتے ہیں یا کوئی اور ناجائز طریقہ اختیار کر کے کمائی کرتے ہیں تو وہ بچہ کیا کرے" جوجی نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔

"بڑا پیارا سوال کیا بیٹے آپ نے۔ یو سِٹ ڈاؤن پلیز۔"

"دیکھو بیٹا اس بچے کے پاس دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ وہ اگر اپنے گھر میں آنے والی کمائی سے آگاہ ہے تو والدین پر ظاہر کرے کہ وہ اس سے واقف ہے اور اسے اچھا نہیں سمجھتا وہ انہیں اپنے طریقے سے منع کرے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا انتظار کرے اور جب وہ خود کو کچھ کرنے کے لائق سمجھ لے تو مزید اس رزق کو کھانے سے انکار کردے اور خود کما کر کھائے۔"

"اور اگر سر وہ کسی ایسے کام کو دیکھے جو قانون کی خلاف ورزی ہو اور معاشرے کی تباہی کا باعث بنتا ہو" ایک اور بچے نے سوال کیا۔

" مجھے خوشی ہے کہ آٹھویں جماعت کے طلباء میں ذہانت ہے اور وہ کسی بھی بات کو مجھنے کے اہل ہیں۔ بچو تم لوگ ہمارا سرمایہ ہو۔"

" ہاں بیٹے اس سوال کا جواب یہی ہے کہ قانون کے محافظوں کو کسی طرح اطلاع کردی جائے۔ دیکھو نا والدین بچوں کی اصلاح کے لئے بہت کچھ کرتے ہیں۔ اگر بچے اپنے اردگرد ایسی ہی کوئی بات دیکھیں تو ان کا فرض ہے اسے روکیں۔ دیکھو کسی ایسے کام سے معاشرے کا اجتماعی نقصان ہوگا اور اگر ایسے کسی کام کے نتیجے میں کوئی فرد پکڑا جائے تو وہ نقصان تو ذاتی ہوگا۔ مگر معاشرے کو فائدہ ہوگا جو کہ اجتماعی فائدہ ہے۔"

" دیکھو بچو ہر شخص اپنے اپنے محاذ پر ایک سپاہی ہے۔ بس اسے ایک بہادر کی طرح اپنا فرض نبھانا چاہیئے۔"

" کوئی اور سوال" سر نے اپنی بات ختم کرکے بچوں کی طرف رُخ کیا۔

" نو سر تھینک یو۔ سر چلے گئے مگر جوجی کے ذہن میں رات کا واقعہ گھومتا رہا۔ وہ واقعہ جو اس نے حقیقت میں دیکھا تھا اور اس کا معصوم ذہن پریشان ہوگیا تھا۔

رات اسے جانے کیوں ٹھیک طرح نیند نہیں آئی تھی۔ کافی دیر تک پڑھتا رہا پھر سونے کے لئے لیٹا تو نیند غائب تھی، اپنے کمرے کی لائٹ بجھا کر وہ لیٹ گیا مگر نیند اب بھی غائب تھی۔

ایک دم اس نے تیز آہٹ سنی اس نے تیزی سے کھڑکی میں جا کر دیکھا یہ پپا تھے جو باہر کی طرف جا رہے تھے۔ یہ خلافِ معمول تھا، اس کے علاوہ وہ شب خوابی کے لباس میں تھے۔ جوجی نے فوراً بستر چھوڑ دیا۔ اس کے پپا گیٹ کے قریب کسی سے باتوں میں مصروف تھے اس نے اپنے کان ان لوگوں کی طرف لگا دیئے چند اڑتے اڑتے سے جملے اس کے کانوں میں پڑ گئے۔

" دیکھو خیال سے جو کچھ کرو بڑی احتیاط سے کرنا ہوگا کسی کو پتہ نہ چلے۔"

" ہاں میرا خیال ہے زیادہ لوگوں کو معلوم ہوا تو یہ راز باہر بھی کسی کو معلوم ہو سکتا ہے۔"

" بس ٹھیک ہے جاؤ اپنے حصّے کا کام انجام دو۔ یہ ہماری کامیابی کی بنیاد ہوگا۔"

وہ پپا کی واپسی سے پہلے ہی لوٹ آیا تھا۔

پپا کی جاسوسی کرنی چاہیئے۔ پتہ نہیں اسمگلنگ کا کیس تو نہیں ہے۔ باتیں تو اسی طرح کر رہے تھے۔ میں ضرور پتہ کروں گا اگر ایسا ہوا تو ہم حلال کی کمائی تو نہیں کھا رہے۔

اور بس جوجی میاں سب کچھ بھول کر پپا کی ٹوہ میں لگ گئے۔

اس رات پپا گھر لوٹے تو خاصے تھکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر جوجی ان کی ایک ایک حرکت کو نوٹ

کرنے میں لگا ہوا تھا۔

"جوجی میاں کیا آج سونے کا ارادہ نہیں ہے۔" پپا نے اسے بدستور ڈرائنگ روم میں ڈٹے دیکھ کر پوچھا۔

"جی پپا بس ایسے ہی۔"

"چلو اپنے کمرے میں چلو۔ اب آرام کرو۔ رات دیر تک جاگنا اچھی بات نہیں ہے۔" پپا فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

جوجی نے بظاہر تو باہر کی راہ لی۔ مگر دروازے پر رک گیا۔

تو میرا خیال درست نکلا۔ اندر سے آنے والی آوازوں پر اس نے سوچا۔

"ٹھیک ہے۔ اچھا۔ تو خبر درست ہے۔ مال کل رات ہی پہنچ رہا ہے نا۔ ہاں۔ کیا مجھے مال ایسے وصول کرنا ہے کہ کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ او کے۔ پلاننگ بہترین کرنا ہوگی۔"

"ہاں باہر والوں کو بالکل پتہ نہ لگے۔ ہاں کروڑوں روپے کا معاملہ ہے میں خود اس معاملے کو ڈیل کروں گا۔"

پپا کہہ رہے تھے اور جوجی کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ مارا زبردست کامیابی ہے یہ۔

مجھے ضرور پولیس کو اطلاع دینی چاہئیے۔ مگر نہیں پولیس کو تو نہیں، کیا پتہ وہاں بھی مجرموں کے آدمی ہوں۔

اللہ پپا یہ آپ نے کیا کیا؟ وہ سوچنے لگا۔ اب کیا کروں۔ اچھا ٹھیک ہے۔ سر کو بتائے بغیر معلوم کروں گا کہ ایسے معاملات کی اطلاع کہاں کرنی چاہئیے۔ سوچتے سوچتے جانے کب سو گیا۔

"جوجی۔ جوجی بیٹا اٹھو اسکول نہیں جانا کیا آج نماز بھی گول کر دی آپ نے۔ یہ پپا تھے جو اسے جگا رہے تھے۔"

وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

ناشتہ بھی برائے نام کیا۔ اب وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں پپا کو پولیس نہ لے جائے، ہائے کیا کروں۔ مگر یہ تو پپا کو بھی پتہ ہونا چاہئیے تھا کہ کیا ہوگا۔

"تم ناشتہ نہیں کر رہے بیٹا۔" امی نے اسے مخاطب کیا۔

"جی کر تو رہا ہوں امی کر رہا ہوں۔" بدحواسی میں اس نے خالی کپ منہ سے لگا لیا۔ "ارے یہ تو خالی ہے۔"

"پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے اس کو الٹی الٹی حرکتیں کر رہا ہے۔" پپا نے کہا۔

"کچھ نہیں ہو رہا پپا کچھ نہیں۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔ آئیے۔"

اسکول آ کر بھی سوچتا ہی رہا اور موقع ملتے ہی سر کے پاس جا پہنچا۔

" سر کل جو آپ نے سبق پڑھایا تھا نا میں اس میں پھنس گیا ہوں۔ میری رہنمائی فرمائیے۔"

" ہوا کیا ہے بیٹے۔ بتاؤ اگر سر کرنے کا ہوا تو میں ضرور تمہاری الجھن والے کام کو کر دوں گا۔"

سر کے حوصلہ دلانے پر اس نے تمام بات اگل دی۔

" اچھا بیٹا کوئی بات نہیں۔ ہم اور تم مل کر ڈائریکٹر آف انٹیلی جنس کو فون کرتے ہیں۔ ویسے ہو سکتا ہے انہیں معلوم ہو۔"

" آؤ چلیں" وہ فون کرنے کے لئے ہیڈ ماسٹر کے آفس میں پہنچے اتفاقاً وہ موجود نہ تھے۔

" یہ تو بڑا اچھا ہوا ہم آزادی سے بات کریں گے۔"

انہوں نے نمبر ملا کر کہا۔ "سر میں ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ جی ڈائریکٹر صاحب ہی سے بات کروں گا۔"

" ٹھہریئے" سکریٹری نے کہا۔

" جی وہ دیکھئے وہ معاملہ اسمگلنگ کا ہے۔"

انہوں نے جوجی سے سنی جانے والی بات بتادی۔

" اچھا ذرا اس بچے کو فون دیں" جوجی میاں کیا کیا سنا تھا آپ نے" کسی نے بھاری لہجے میں پوچھا۔

جوجی نے ساری بات بتادی۔

" بہتر ہے دیکھو اب کسی اور سے نہ کہنا اور کل کا اخبار ضرور دیکھ لینا۔ وش یو گڈ لک۔"

اسکول سے واپس آکر وہ تمام وقت خاموش رہا۔ کیا یہ میں نے اچھا کیا۔ پپا کی نگرانی ہو رہی ہو گی پھر۔ پھر کیا ہو گا۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔

" جوجی بیٹا کھانا کھالو۔"

" مجھے بھوک نہیں ہے امی۔"

" تمہیں آخر کیا ہے آخر کل سے۔"

" کچھ نہیں ہوا مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

" اچھی بات ہے۔"

" امی یہ پپا کب آئیں گے۔"

" کیوں کوئی خاص کام ہے کیا۔ وہ آج شاید رات تک نہ آئیں بڑا اہم کام ہے۔"

" امی پپا کا بہت بڑا کاروبار ہے نا۔"

" جو بھی سمجھ لو۔"

"اچھا۔ امی" وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آج اس کا دل کسی بھی کام میں نہ لگ سکا۔ شام کو کھیلنے گیا تو وہاں سے بھی اُکتا کر واپس آگیا۔

کیا ہوگا جب پپا کو پتہ چلے گا کہ میں نے یہ سب کچھ بتایا ہے۔

وہ خود ہی گھبراتا رہا۔ امی کو بھی وجہ نہیں بتائی۔

رات پھر دیر سے نیند آئی بار بار آنکھ کھلتی رہی۔

"امی پپا آگئے۔ صبح اٹھتے ہی اس نے سوال کیا۔"

"نہیں بیٹا وہ اسپتال میں ہیں ان کے آفس سے فون آگیا تھا۔ بہرحال فکر نہ کرو وہ ٹھیک ہیں۔ ہم اسپتال چل رہے ہیں۔ واپسی میں تم اسکول آجانا۔"

"اچھا امی اخبار آگیا۔"

"اخبار پڑھنے کا وقت نہیں ہے۔ چلو تیار ہو کر آجاؤ۔"

ناشتے کے بعد وہ امی کے ساتھ اسپتال جارہا تھا۔

پپا جاگ رہے تھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مسکرا اُٹھے۔

"آیئے مسٹر ننھے جاسوس ...."

"پپا میں بہت بُرا ہوں۔ انہیں اطلاع میں نے دی تھی مگر میں کیا کرتا۔"

وہ رونے لگا۔

"نہیں بیٹا تم نے کوئی بُرا کام نہیں کیا میں خوش ہوا ہوں۔ تم نے ایک اچھے انسان کا فرض ادا کیا مگر ذرا اخبار بھی تو دیکھو۔"

"ہیں یہ کیا پپا" ڈائریکٹر جنرل آف انٹیلی جنس۔ ان کی تصویر کے نیچے لکھا تھا مقابلے کے زخمی۔ اخبار میں پپا کی زبردست تعریف تھی۔

"میں تمہاری آواز پہچان گیا تھا اسی لئے آواز بدل کر بات کی۔ ویسے میں سوچ رہا تھا کہ یہ باہر کے آدمی کو کیسے پتہ چلا۔ مگر مان گئے ہو تو آخر میری اُولاد نا۔"

پپا کی بھرپور ہنسی نے اسے بھی ہنسنے پر مجبور کردیا۔

"میں شرمندہ نہیں ہوں پپا۔ اُس نے کہا۔ ویسے آپ نے مجھے کبھی بتایا نہیں کہ آپ ڈائریکٹر محکمۂ جاسوس ہیں۔ مگر بھانڈا پھوٹ ہی گیا نا۔" پپا ایک بار پھر ہنس پڑے۔

فیلڈنگ کے دوران ایک کھلاڑی بار بار ایمپائر کے قریب جاکر کھڑا ہو جاتا اور تقریباً ہر گیند پر آؤٹ کی اپیل کرتا مگر ایمپائر ٹس سے مس نہ ہوتا۔ اس کی اپیلیں جب شدّت اختیار کر گئیں تو ایمپائر نے پلٹ کر کھلاڑی کو گھورتے ہوئے کہا "پچھلے آدھ گھنٹے سے میں تمھاری حرکات دیکھ رہا ہوں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" کھلاڑی نے سنجیدگی سے کہا "آخر آپ کھیل کیوں نہیں دیکھتے؟"

شازیہ سلطانہ ـــ اورنگی ٹاؤن کراچی

استاد: ناکام کرکٹر کیا بنتا ہے؟

ٹیپو: "ایمپائر"

بشریٰ بصیر ـــ گلشن اقبال کراچی

خواتین کرکٹ ٹیم کی مایۂ ناز کھلاڑی صرف تین رنز بنا کر آؤٹ ہو گئیں تو ان کی کپتان نے تعجّب سے پوچھا "ارے چندا تم اتنی جلدی کیسے آؤٹ ہو گئیں؟"

چندا تماشائیوں کی گیلری کی جانب تیزی سے جاتے ہوئے بولیں "مجھے ایک تماشائی خاتون کا ہیر اسٹائل پسند آگیا ہے اور وہ اسٹیڈیم سے نکلنے ہی والی ہیں۔"

سہیل منصور صدیقی ـــ ملیر کراچی

کسی علاقے میں خشک سالی ہو گئی، بارش نہ ہونے سے فصلیں نہیں ہوئیں، اور جو ہوئیں وہ سوکھ گئیں۔ قحط کے آثار پیدا ہو گئے۔ مقامی باشندوں کی آہ وزاری بھی کسی کام نہ آئی۔ بالآخر علاقے کے سب سے معمّر اور جہاندیدہ بوڑھے کی تجویز پر نوجوانوں نے کرکٹ میچ کا پروگرام بنایا اور انتظامات شروع کر دیے۔

اور کرکٹ میچ شروع ہونے سے پہلے ہی علاقے میں سیلاب آگیا تھا۔

زبیدہ عثمانی ـــ الفلاح ہاؤسنگ سوسائٹی ملیر کراچی

"سُنا ہے مائیک گیٹنگ اور آئن بوتھم کو اب خواب میں بھی عمران خان اور جاوید میانداد ہی نظر آتے ہیں اور ان کی نیند اُڑ جاتی ہے:"

"تو پھر سنیل گواسکر اور کپیل دیو کو کون نظر آتا ہوگا؟"

"سلیم ملک اور توصیف احمد"

شبنم نعمانی ــــ الفلاح ہاؤسنگ سوسائٹی ملیر کراچی

عمران خان، جاوید میانداد، سلیم ملک اور سلیم یوسف کو پاکستانی ٹیم میں شامل نہ کیا جائے

ورلڈ کپ میں کھیلنے کے لیے برطانوی کرکٹ ٹیم کے کپتان مائیک گیٹنگ کی شرط۔

نگہت آرام ــــ ناظم آباد کراچی

ماسٹر صاحب نے پوری کلاس کو کرکٹ میچ کے عنوان سے مضمون لکھنے کے لیے کہا۔ ایک طالب علم نے صرف اتنا لکھا "آج بارش کی وجہ سے میچ نہیں ہو سکا"

ماسٹر صاحب نے اس کے نیچے لکھا "جب میچ شروع ہوگا تو نمبر بھی مل جائیں گے"

جاوید انور ــــ وحدت روڈ لاہور

ایک مشہور معروف کرکٹر اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا "ڈاکٹر نے مجھے کرکٹ چھوڑنے کا مشورہ دیا ہے" اس کے ساتھی نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا "کیوں؟" اس نے تمھیں کرکٹ کھیلتے ہوئے دیکھ لیا ہے کیا؟"

محمد رشید ــــ جعفر طیار ہاؤسنگ سوسائٹی ملیر کراچی

کرکٹ کا کھلاڑی ڈاکٹر کو اپنا حال بتا رہا تھا، "مجھے ضعفِ دل کا عارضہ لاحق ہے، بیٹنگ کرتا ہوں تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے، بولنگ کراتا ہوں تو ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں "اب تو دکھائی بھی کم دیتا ہے اور ہاتھوں میں رعشہ آگیا ہے"

"تو آخر تم کرکٹ چھوڑ کیوں نہیں دیتے"؟ ڈاکٹر نے ہمدردی سے پوچھا، کرکٹر نے سُن کر جواب دیا۔

"اب میں کرکٹ کیسے چھوڑ سکتا ہوں، مجھے قومی ٹیم میں شامل کر لیا گیا ہے"

کلیم اختر ــــ ملیر کالونی کراچی

ریحانہ: جب میں چار سال کی تھی تو چھت سے گر گئی تھی"۔

سائرہ: "تو کیا تم بچ گئی تھیں"۔

ریحانہ: "پتہ نہیں دراصل اُس وقت میں بہت چھوٹی تھی"۔

طارق رحیم ــــ ناظم آباد کراچی

لڑکا: ابو میں کس چیز کا بنا ہوا ہوں؟

باپ: بیٹا مٹی سے۔

لڑکا: پھر مجھے زیادہ نہ مارا کریں ورنہ کسی

دن میں ٹوٹ جاؤں گا۔

ذکاء الدین خان ——— ضلع میانوالی

تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی آرٹسٹ صاحب کونے میں کھڑے اپنی ہی ایک تصویر دیکھ رہے تھے ایک صاحب پیچھے سے آئے اور بولے۔ واہ کیا جاندار تصویر ہے۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

آرٹسٹ بولے حیرت ہے غروبِ آفتاب کا منظر دیکھ کر آپ کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ وہ صاحب حیرت سے بولے۔ اوہ غروبِ آفتاب کا منظر! میں تو اسے فرائی انڈا سمجھا تھا۔

مُرسلہ: ممتاز احمد قریشی ——— مکلی

عدیل: سواری کے دوران کوئی گڑھا یا رکاوٹ آجائے تو وہ چھلانگ لگا کر پار کرنے کی بجائے اچانک رُک جاتا ہے جس کے نتیجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی میں اُس پار پہنچ جاتا ہوں۔

رخسانہ حبیب ——— کراچی

"وہ ایک ماہر ہوا باز تھا لیکن نسیان کا مرض اُسے لے ڈوبا۔"

"وہ کیسے؟"

"ایک بار ہزاروں فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اُس کے طیارے میں آگ لگ گئی اُس نے بڑی مہارت سے پیراشوٹ باندھ کر طیارے سے چھلانگ لگا دی لیکن بدقسمتی سے پیراشوٹ کھولنا بھول گیا۔"

ایم سلیم - میمن ——— کراچی

اچھّی خبر: کل اسکول میں ہر طالب علم کو مشروب کی ایک ایک بوتل مفت ملے گی۔

بُری خبر: ہر بوتل کے ساتھ نلکی بھی ہوگی جس کی قیمت تین روپے ہوگی۔

ایم جے شمشیر ——— کراچی

سوال:۔ اس جانور کا نام بتاؤ جو ذہنی طور پر تمام جانوروں سے بلند ہے۔

جواب:۔ زرافہ

محمّد رفیق ——— کراچی

ایک ہوٹل میں ریڈیو پوری آواز سے بج رہا تھا۔ اُس وقت ریڈیو سے کرکٹ کی کمنٹری نشر ہو رہی تھی۔ ایک صاحب جو کمنٹری سُن رہے تھے اُن کے کانوں میں اس طرح کے جملے پڑ رہے تھے۔ اوئے چھوٹے پانچ کپ چائے دو رَن بنائے جاوید میانداد چھکّا لگا کر چاول لاؤ۔ سلیم مَلک چار رَن ڈبل چائے۔ دال کیچ آؤٹ۔ عمران خان دو پلیٹ آؤٹ اور ایک انڈا الگ رَن آؤٹ۔

اسماعیل عبدالرحمٰن ——— میٹھادر کراچی

خالِص دیسی گھی سے تیار کردہ
احمد
فریش ویل سوئیٹس
آپ کے اعلیٰ ذوق کی بھرپور تسکین کیلئے
Freshwel
منفرد ذائقہ
انوکھی سوغات
احمد کے حلوہ جات
آپ کیلئے، آپ کے احباب کیلئے
لذت اور تازگی کا
بلند ترین معیار
صرف ۲ دو کلو مٹھائی
فریش ویل سوئیٹس کے کسی بھی سیلز پوائنٹ سے خریدیں اور پشت پر دیا گیا کوپن دے کر ایک پلیٹ رس گلہ یا
رس ملائی مفت حاصل کریں۔ یہ پیشکش صرف ۱۵ ، اکتوبر تک ہے

یہ کوپن اپنے قریبی فریش ویل سوئیٹس کے سیلز پوائنٹ
پر لے جائیں اور ۲ ؍کلو مٹھائی کی خریداری پر ایک پلیٹ رس گلہ یا
رس ملائی مُفت حاصل کریں۔ یہ پیشکش صرف ۱۵ ؍اکتوبر تک ہے

نام سیلز پوائنٹ ---------------------------

تاریخ ---------------------------

یہ کوپن اپنے قریبی فریش ویل سوئیٹس کے سیلز پوائنٹ
پر لے جائیں اور ۲ ؍کلو مٹھائی کی خریداری پر ایک پلیٹ رس گلہ یا
رس ملائی مُفت حاصل کریں۔ یہ پیشکش صرف ۱۵ ؍اکتوبر تک ہے

نام سیلز پوائنٹ ---------------------------

تاریخ ---------------------------

یہ کوپن اپنے قریبی فریش ویل سوئیٹس کے سیلز پوائنٹ
پر لے جائیں اور ۲ ؍کلو مٹھائی کی خریداری پر ایک پلیٹ رس گلہ یا
رس ملائی مُفت حاصل کریں۔ یہ پیشکش صرف ۱۵ ؍اکتوبر تک ہے

نام سیلز پوائنٹ ---------------------------

تاریخ ---------------------------

کہانی کی تلاش

سیّد عبدالودود شاہ

جب ہمارے پاس "آنکھ مچولی" کے لئے کہانی لکھنے کی فرمائش آئی تو ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ آخر ہم اب کس موضوع پر کہانی لکھیں کیونکہ لکھنے والوں نے شہزادوں، شہزادیوں کی دنیا، ملکاؤں اور بادشاہوں کی دنیا، جن بھوتوں کی دنیا، مسخروں کی دنیا، چڑیلوں دیوؤں کی دنیا سے لے کر دنیا بھر کی دنیا پر لکھ لکھ کر ہمارے لئے اور کوئی دنیا نہیں چھوڑی جس پر ہم لکھ سکیں، اب لے دے کر ایک ہی دنیا رہ جاتی ہے۔ یعنی دوسری دنیا۔ لیکن چونکہ وہاں جانے کے احکامات تادم تحریر موصول نہیں ہوئے لہٰذا ابھی اسی دنیا میں رونق افروز ہیں۔ مسئلہ پھر یہی آن پڑا کہ اب کیا اور کس پر لکھا جائے۔

اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں ـــ ہم قلم ہاتھ میں لے کر اور کاغذات کا پلندا، بغل میں دبا کے گھر میں داخل ہوئے تو عجیب نقشہ نظر آیا۔ برآمدے میں بے شمار اقسام کی اشیاء بکھری ہوئی تھیں، کتابیں کاپیاں، بستے، قلم، رنگین پنسلیں جیومیٹری بکس کاغذوں کے چھوٹے بڑے درمیانے ہر رنگ اور ہر سائز کے پُرزے ـ جن میں اکثر تجریدی آرٹ کے نمونے بنے ہوئے تھے۔ ہم یہ حال دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے آگے بڑھے ہی تھے کہ دھائیں سے کوئی ہم سے آٹکرایا اور ہم گرتے گرتے بچے ـ ورنہ چشمہ تو یقیناً شہید ہو جاتا۔ معلوم ہوا کہ ہماری منجھلی بھتیجی ہیں ـ پیچھے پیچھے پورا لاؤ لشکر ـ ہم نے اس گھڑ دوڑ پر ڈانٹا تو انہوں نے منہ بسورتے ہوئے اپنے سیاہی بھرے ہاتھ ہماری سفید قمیض سے پونچھتے ہوئے فریاد کی ـ ”تتا (چچا) چھوٹے بھیّا نے ہمیں مارا ہے ہم اِدھر بھاگ آئے۔“

ابھی ہم ان کی فریاد پر پوری طرح غور نہیں کر پائے تھے کہ ڈرائنگ روم سے زوردار چھناکا ہوا۔ ہم فریادی لشکر کو وہیں چھوڑ کر اندر دوڑے ـ دیکھتے ہیں کہ ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں رکھا ہوا خوبصورت ایکوریم چکنا چور ہو چکا ہے۔ جیسے کسی غریب بستی پر بُلڈوزر چلا دیا جائے۔ ننھّی ننھّی سنہری مچھلیاں قالین پر پڑی تڑپ رہی تھیں اور پانی سارے ڈرائنگ روم میں پھیل چکا تھا ـــ ہمارے بھانجے نمبر چار ایک طرف سہمے ہوئے کھڑے ہیں۔ ہم نے ان کی اس مہم جوئی پر انہیں داد و تحسین دینے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ہمارے بیڈ روم سے گڑیا کے چیخنے کی آواز آئی ـ ہم ایکیوریم پر فی الحال فاتحہ پڑھ کر ادھر لپکے ـ یا اللہ خیر۔ گڑیا ہمارے رائٹنگ ٹیبل کے نیچے دبی پڑی تھی۔ چونکہ ساتھ ہی بیڈ بھی تھا لہٰذا اس کے ہاتھ پاؤں مارنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ ہم نے جلدی جلدی میز ہٹائی اور گڑیا کو ڈانٹا وہ ابھی تک کانپ رہی تھی۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“ ہم نے دھاڑ کر پوچھا۔ گڑیا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی پپّو میاں نے جھٹ کہا۔ ”بھائی جان۔ گڑیا آپ کی میز کے اُوپر لٹکے کیلنڈر سے تصویریں پھاڑنے چڑھ رہی تھی کہ میز اوندھی ہو گئی۔“ ابھی ہم نے گڑیا کی خبر لینے کے لئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ دھڑام سے پھسل کر گر پڑے ـ وہ تو بیڈ کا کونا ہاتھ آ گیا ـ ورنہ شاید پلاسٹر کی نوبت آ جاتی۔ ”یہ کیا نامعقول حرکتیں ہیں“ ہم نے کھڑے ہوتے ہی دھاڑ کر پوچھا ـ ”جی یہ ٹنّو کی بچّی نے گوند پھیلا دی ہے۔“

گڑیا نے جلدی سے بندر کی بلا طویلے کے سر ڈال دی ـ ”امّی کہاں ہیں، بڑی باجی اور چھوٹی باجی کدھر ہیں“ ہم گرجے ـ ”جی۔ وہ سب مارکیٹ گئے ہوئے ہیں۔“ گڑیا نے پُر تشّر لہجے میں اطلاع دی۔ ابھی اس نے مکمّل رپورٹ پیش نہیں کی تھی کہ یوں لگا غسلخانے میں زلزلہ آ گیا ہے ـ ہم کو اس طرف لپکنا پڑا ـ معلوم ہوا کہ غسلخانے میں ٹوٹو ـ ٹیپو، گڈو، ببلی اور ٹینا سب کے سب ایک ساتھ گھسے ہوئے ہیں اور ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوبوں اور برشوں سے غسلخانے کے در و دیوار پر وہ پھول بوٹے بنائے جا رہے ہیں کہ ان استادوں کے سامنے کسی کا کیا چراغ جلتا ہے۔ ”باہر نکلو“ ہم نے للکارا ـ سب ایک دوسرے کو دھکیلتے باہر تشریف لائے۔ سب کے ہاتھوں کپڑوں اور چہروں پر ٹوتھ پیسٹ یوں لگا ہوا تھا۔ جیسے صابن کی جگہ ٹوتھ پیسٹ استعمال کیا گیا ہو۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے“ ہم چنگھاڑے۔ ”جی۔ ہم لوگ اپنے اپنے دانت صاف کر رہے تھے“ ٹیپو نے تازہ ترین اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ ”نالائقو۔ دانت اس طرح صاف کئے جاتے ہیں چلو باہر نکلو۔ باری باری اپنے منہ ہاتھ دھوؤ“ ہم نے ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں لائن اپ کیا۔ اور پہلے ببلی نے دوبارہ غسلخانے میں قدم

رکھا اور رکھتے ہی یوں پھسل کر باہر آ پڑیں جیسے کسی نے اندر سے دھکا دے دیا ہو۔ ہم نے پہلے بیلی کو سنبھالا پھر غسلخانے کے فرش کا معائنہ کیا۔ جہاں بے تحاشا ٹوتھ پیسٹ سے فرش پر ڈیزائن بنا دیا گیا تھا اور ساتھ ہی پورے فرش پر پانی پھیلا ہوا تھا۔ ہمارا جی چاہا کہ اپنے ہی بال نوچ لیں۔ اب بیلی واپس نہ پھسلتی تو اور کیا ہوتا۔ "پہلے تو فرش صاف کرو پھر باری باری منہ دھوؤ۔ ورنہ۔" ہم نے ٹوٹو کو دھمکی دی اور وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا تھا کہ سامنے کھلے دروازے پر نظر پڑی جہاں فریج رکھا تھا۔ جی دھک سے رہ گیا۔ فریج کے دونوں دروازے فریاد کے لئے بازو پھیلائے ہوئے تھے۔ اس کے اگرد پورے فرش پر پھلوں کے چھلکے، دودھ کے دھبے، سالن کے نشانات، ادھ کھائے پھل، اور خدا جانے کیا کیا بکھرا پڑا تھا۔ ہم نے صورت احوال کا جائزہ لینے کے لئے اس کمرے کا رخ کیا۔ وسط میں پہنچتے ہی ایک مرتبہ پھر ہمیں سہارا لینا پڑا۔ ورنہ ایک بار تو ضرور فرش پر ہوتے۔ فرش پر بے تحاشا شہد پھیلا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی نے شہد کا مرتبان نکال کر خود بھی کھایا ہے اور ساتھ میں دوسرے بچوں نے بھی اس ثواب میں شرکت کی ہے جس کے نتیجے میں پورے کمرے میں۔

جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے۔

کا نقشہ بنا ہوا تھا ایک کونے میں مرحوم مرتبان کے بچے کھچے آثار بھی اس واقعے کی شہادت دے رہے تھے۔ دوسری جانب اسٹور روم کسی تباہ شدہ شہر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جب ہمارے حواس بجا ہوئے تو امی اور باجیاں واپس تشریف لا چکی تھیں۔ اور گھر میں بچوں کی آدھے دن کی بادشاہت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ شام تک جب گھر کا کچھ حال حلیہ درست ہوا تو ہمیں پھر "آنکھ مچولی" کے لئے کہانی لکھنے کا خیال آیا۔ لیکن۔ شاید اب کسی کہانی کی تلاش کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ●●

سیرتِ طیبہ پر انعامی مقابلہ مضمون نگاری

ربیع الاوّل کے مبارک مہینے کے حوالے سے ادارہ "آنکھ مچولی" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر انعامی مقابلۂ مضمون نگاری منعقد کرا رہا ہے۔ بہترین مضمون پر دو سو روپے کی کتب دی جائیں گی۔ مضامین وصول کرنے کی آخری تاریخ ۲۰ نومبر ہے۔ درج ذیل موضوعات میں سے کسی ایک پر آپ مضمون ارسال کر سکتے ہیں۔

۱ حضورؐ کا بچپن

۲ حضورؐ اور بچے

۳ حضورؐ اور بچوں کی تعلیم و تربیت

۴ حضورؐ کے پسندیدہ کھیل

۵ سیرتِ طیبہ کا ایک پہلو جس نے مجھے متاثر کیا

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت۔ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
مستقبل کی بڑی ذمّہ داریوں کے لئے ابھی سے اپنے ذہن کو تروتازہ اور جسم کو توانا رکھئے
غیر متوازن غذائیں انسانی جسم کی تمام ضروریات پوری نہیں کرتیں۔
دودھ واحد غذا ہے جو انسانی جسم کو زیادہ سے زیادہ قوّت فراہم کرتی ہے۔
سارے خواب پورے ہوں
سارے سُکھ پاؤ.... مگر
دُودھ تو پیو
قدرت کی عطا کردہ اِس انمول نعمت میں کیلشیم، پروٹین، وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا شامل ہیں۔ دُودھ کا روزانہ استعمال۔ اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہے
دن میں دوبار دودھ پینا اپنی عادت بنالیجئے۔
چاہیں تو دُودھ میں چاکلیٹ یا شربت ڈال کر پی سکتے ہیں۔
یوں گویا۔
غذا کی غذا
مزے کا مزا
اِشتہار برائے بہبود اطفال؛ منجانب ماہنامہ آنکھ مچولی، کراچی

MASS

کلثوم واحد

محبت کا کرشمہ

عمران کے اسکول کی وین گیٹ پر آکر رکی۔ اسکی آواز سنتے ہی مُنی گھبرا کر اُٹھی۔

"آگئے بھائی جان"۔ اس نے جیسے خطرے کی گھنٹی بجائی اور جلدی جلدی اپنی گڑیاں سمیٹنے لگی۔

ذیشان جو چند لمحے پہلے مزے سے سائیکل چلا رہا تھا جھٹ اسے ایک طرف کھڑی کر کے پودوں کو دیکھنے لگا۔ گیٹ کھلا اور عمران اندر داخل ہوا۔ آنکھیں سکڑی ہوئی، تیوریوں پر بل، کپڑے پسینے میں بھیگے ہوئے۔ اس نے آتے ہی چھوٹے بھائی کو دیکھ کر ہانک لگائی، "نظر نہیں آتا، تھکا ہوا آ رہا ہوں، اتنا نہیں ہو سکتا کہ بیگ ہی پکڑ لیں" ذیشان نے آگے بڑھ کر سعادت مندی سے بیگ اٹھایا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کہہ دے" بھائی جان

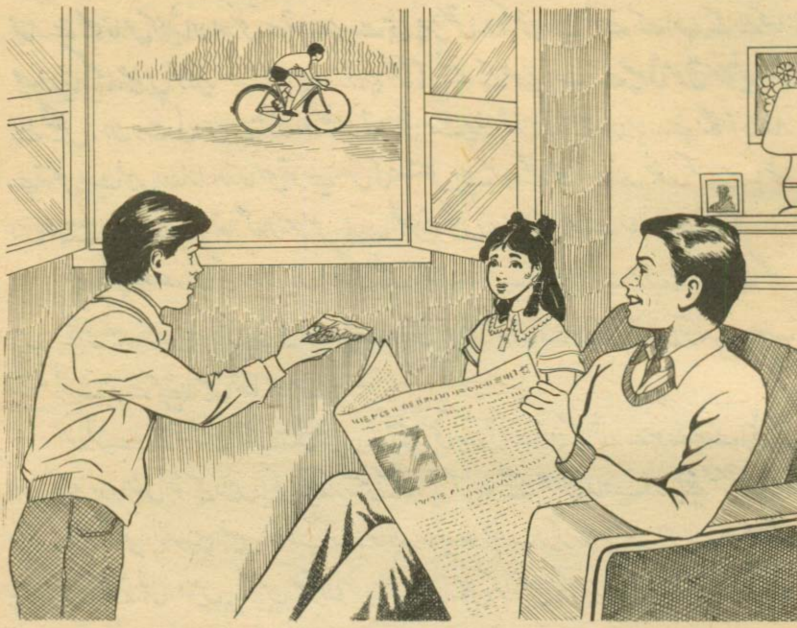

آخر میں بھی تو اسکول جاتا ہوں اور چونکہ میرا اسکول قریب ہے اس لئے پیدل ہی جانا پڑتا ہے۔ لیکن میں نے کبھی کسی پر رُعب نہیں جھاڑا۔ لیکن یہ سب باتیں اس نے اپنے دل میں سوچی تھیں۔ کہہ دیتا تو عمران کی باتوں کے ساتھ ساتھ اسکی لاتیں بھی سہنا پڑتیں۔ اب "بادشاہ سلامت" کی نظر "منی" پر پڑی حکم ہوا۔ "یہ بوتل پکڑو اور بھاگ کر میرے کمرے کا پنکھا کھولو"۔ منی دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی۔

آج ہی نہیں بلکہ، عمران کی عادت ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ وہ پانچ سال کے انتظار اور دُعاؤں کے بعد پیدا ہوا تھا اور مزید پانچ سال تک اکلوتا رہ کر امی ابو کا پیار سمیٹتا رہا تھا۔ آندھی اور طوفان ٹل سکتے تھے مگر اس کا کہنا نہیں ٹلتا تھا۔ وہ اس گھر کا بے تاج بادشاہ تھا، والدین، ددھیال اور ننھیال میں گویا سب اسی کو خوش رکھنے کی خاطر زندہ تھے۔ اتنا بہت سا پیار پاکر اس میں غرور اور خود غرضی پیدا ہوگئی تھی،

امی، ابو کی توجہ قدرتی طور پر چھوٹے بچوں کی طرف بٹ گئی، عمران بھنا گیا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے علاوہ کوئی اور بھی پیار کے قابل ہے۔ اپنی برتری ظاہر کرنے کے لئے وہ چھوٹے بہن بھائی پر رُعب جمانے لگا بات بات پر انہیں ڈانٹتا اور کبھی کبھار تو پیٹ بھی ڈالتا۔ ظاہر ہے کہ ماں باپ کو اُسے ٹوکنا ہی تھا پہلے نرمی اور پھر سختی سے ـــــ سمجھانے کی کوشش کی گئی تو اسے بے حد ناگوار گزرا وہ دل ہی دل میں سب سے خفا رہنے لگا خاص کر ذیشان اور "منی" سے تو اسے بہت ہی چڑ تھی، وہ کبھی اپنے غصّے کے اظہار کے لئے کھانا چھوڑ دیتا، کبھی چیزیں توڑ دیتا اور کبھی زبان درازی پر اُتر آتا، نتیجے کے طور پر اب اُسے چھوٹی موٹی سزائیں بھی ملنے لگیں۔ دن رات کی اس بے زاری اور گھٹن نے اسکی صحت پر بُرا اثر ڈالا وہ آئے دن بیمار رہنے لگا آج بخار ہے تو کل پیٹ میں درد، نزلہ اور کھانسی تو جیسے اس کی مستقل چپک کر رہ گئے تھے، وہ جوں جوں کمزور ہو رہا تھا۔ اس کا چڑچڑاپن بڑھتا جارہا تھا۔ گداز جسم میں ہڈیاں اُبھرنے لگیں اور دمکتا ہوا رنگ سانولا ہونے لگا۔

بچوں کی وجہ سے امی کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اب وہ سارا وقت صرف بڑے بیٹے ہی کو نہیں دے سکتی تھیں۔ پھر انہیں اسکی بدتمیزی اور کام چوری کا بھی شکوہ تھا اگر کبھی اسے کوئی کام بتاتیں تو کھٹ سے جواب ملتا "ذیشان سے کہیئے نا، میں تھکا ہوا ہوں۔"

اَبو دفتر سے لوٹتے تو شان بھاگ کر ان کی چپلیں لے آتا۔ منّی جلدی سے اُن کے اتارے ہوئے بوٹ اپنی جگہ رکھ آتی پھر وہ دونوں اَبو کے دائیں بائیں بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگتے۔ عمران صاحب دُور بیٹھے ٹکٹکی لگا کر یہ تماشہ دیکھتے رہتے۔ کبھی اَبو خود ہی انہیں مخاطب کرتے تو اُوندھا سیدھا جواب دیکر منہ پھیر لیتے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا کہ اَبو اُٹھ کر آئیں، انہیں پیار کریں، پھر کوئی مزیدار سی چیز نکال کر انہیں پکڑا دیں، لیکن اَبو خود ہی دفتر سے

تھکے ہارے آتے تھے، کھانے کی چیز اس وجہ سے نہیں لاتے تھے کہ عمران کی صحت ٹھیک نہ تھی، ٹافیاں وغیرہ الٹا اسے نقصان دیتی تھیں۔ اس کی بیماری کی سزا ذیشان اور مُنی بھگت رہے تھے لیکن انہیں کسی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ گھر میں کھانے پینے کی بازاری چیزیں تو آتی نہیں تھیں مگر عمران کو خوش کرنے کے لئے کبھی کبھار کوئی کھلونا ضرور آ جاتا تھا۔ ابو کی تنخواہ اتنی زیادہ نہیں تھی کہ وہ معیاری اسکولوں کے اخراجات ادا کرنے کے بعد غیر ضروری چیزیں خرید سکیں۔ اس پر سے "ولی عہد بہادر" کی بے شمار فرمائشیں ہوتی تھیں جنہیں پورا کرنے کے لئے امی کو گھر کے ضروری اخراجات کم کرنے پڑتے تھے۔ ابو تکلیف اٹھاتے تب کہیں جا کر کوئی پستول، کہانی کی کتاب گیند یا بلاّ آتا جو سب کا سب عمران صاحب کے خزانے میں جمع ہو جاتا۔ ابو کہتے تو تھے کہ یہ تم دونوں بھائیوں کے لئے ہے، مل کر کھیلنا۔ مگر عمران کبھی ذیشان کو ہاتھ لگانے کا موقع ہی نہ دیتا۔ ذیشان تھا بھی بڑا صابر بچہ نہ اس نے کبھی کوئی جھگڑا کیا اور نہ شکایت اس کے لئے تو بس وہ آدھ گھنٹہ ہی غنیمت تھا جب وہ عمران سے پہلے گھر آتا اور جلدی جلدی سائیکل چلا لیتا۔ رہی منی تو وہ اپنی انہی دو تین گڑیوں میں مگن تھی جو کئی سال سے اس کی ساتھی بنی ہوئی تھیں۔

آج بھی عمران نے آتے ہی چیزوں کا جائزہ لیا اور پوچھنے لگا۔ "تم دونوں نے میرا کوئی کھلونا تو نہیں لیا تھا۔" بچوں نے انکار میں زور زور سے گردن ہلائی تو پھر عمران نے پولیس والوں کے سے انداز میں جرح کی، "میری سائیکل تو نہیں چلائی تھی؟"

"نہیں بھائی جان" شانی نے ڈر کر جھوٹ بول دیا۔

"بس ٹھیک ہے،" وہ اطمینان سے بستر پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا اور بستے سے چپس کا پیکٹ نکال کر کھانے لگا، ذیشان کو پتہ تھا کہ چپس ملنے والے نہیں، ہیں وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔ لیکن منی بدستور اپنی جگہ کھڑی رہی۔ اس کا جی چاہ بھائی جان سے تھوڑے سے چپس مانگ لے۔

اسی وقت عمران نے اسے زور سے ڈانٹا، "نکمی! کوئی کام نہیں تمہیں جو یہاں کھڑی ہونقوں کی طرح گھور رہی ہو۔" منی شرمندہ ہو کر چل پڑی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

چھٹی کا دن تو عمران کے لئے اور بھی مصیبت بن جاتا۔ وہ بیزار بیزار ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکر لگاتا پھرتا اور خود سمجھ نہ پاتا کہ آخر اسے کس چیز کی تلاش ہے۔ صحن سے ابو، ذیشان اور منی کے قہقہے سنائی دیتے، وہ سب بار بار اسے بھی آوازیں دے کر بلاتے مگر عمران کبھی ان کے کھیل میں شریک نہ ہوتا وہ چھپ چھپ کر سب کو دیکھتا اور حسرت سے سوچتا۔ یہ سب لوگ آخر اتنے خوش کس طرح رہتے ہیں۔ ہنستے میں شان اور منی کا رنگ کیسے تمتمانے لگتا ہے۔ ابو کا

سینہ کس قدر چوڑا ہے وہ ایک ساتھ سب کو اپنے ساتھ چمٹالیں تب بھی جگہ بچ جاتی ہے۔ امی صبح سے شام تک اتنا بہت سا کام کرتی ہیں پھر بھی یوں، ہنستی مسکراتی رہتی ہیں جیسے انہیں یہ سب کر کے بڑا مزا آتا ہو۔ آخر مجھے ہنسی کیوں نہیں آتی، میں ان سب کی طرح خوش و خرم کیوں نہیں رہتا، یہ سوچیں اسے اُلجھا کر رکھ دیتیں۔ جب اسے اپنے سوالوں کا جواب نہ ملتا تو وہ اور پریشان ہو جاتا۔

عمران کے اسکول سے خط آیا اسکی کلاس ٹیچر نے امی کو بلایا تھا۔ امی حیران پرتھیں انہوں نے کئی بار پوچھا بھی۔ کیا بات ہے بیٹے، اسکول میں کسی سے جھگڑا تو نہیں ہوا؟ کوئی شرارت تو نہیں کی تم نے اور جب ہر دفعہ جواب انکار میں ملا تو اگلے دن وہ اسکول جا پہنچیں۔ مس نے انہیں دیکھتے ہی شکایت کی۔ دیکھئے محترمہ! یہ آپ کا لڑکا خواہ مخواہ ہر کسی سے لڑتا رہتا ہے۔ میں نے بہت سمجھایا مگر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ جس کی وجہ سے بیٹھتا ہے اسے مارتا ہے۔ یہ دیکھئے سہیل کا ہاتھ، عمران نے اسے پنسل کی نوک سے زخمی کردیا ہے۔ میں نے تنگ آکر آپ کو زحمت دی۔

ویسے یہ پڑھائی میں بہت اچھا ہے، لیکن اس کی حرکتوں کے باعث مجھے افسوس ہوگا اگر ہمیں اس کا نام اسکول سے خارج کرنا پڑا" امی کا شرمندگی سے سر جھک گیا۔ انہوں نے دھیمے لہجے میں ٹیچر سے کہا اور ایک اداس نظر بیٹے پر ڈالتی ہوئی کھڑی ہوگئیں۔ عمران کا خیال تھا کہ آج لازمی طور پر گھر میں پٹائی ہوگی۔ امی زور زور سے مجھے ڈانٹیں گی۔ ابو مار پیٹ کر مجھے غسلخانے میں بند کردیں گے۔ ذیشان اور منی مجھے روتا دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے، یہی سوچتا ہوا جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو اسے بڑی حیرت ہوئی جب معاملہ بالکل برعکس نکلا۔ امی نے نہ ایک لفظ اس سے کہا اور نہ ابو سے شکایت کی۔ ہاں وہ اس قدر دکھی لگ رہی تھیں۔ جیسے ابھی رو پڑیں گی۔ ابو کے بار بار پوچھنے پر بھی انہوں نے اپنی اُداسی کی وجہ نہ بتائی بس سر درد کا بہانہ کرتی رہیں۔ حالانکہ عمران بخوبی جانتا تھا کہ وہ کیوں پریشان ہیں۔ وہ خود کو امی کی اس حالت کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا اور اپنی حرکتوں پر شرمندہ بھی تھا۔ لیکن اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ خود پر کیسے قابو پائے۔ ایسا گُر کہاں سے سیکھے کہ سب لوگ اسکی تعریف کریں، مثالیں دیں۔ اس کے بھی ڈھیر سارے دوست ہوں۔ وہ جس محفل میں جائے سب اسے اپنے پاس بٹھانا چاہیں۔ شاید میری قسمت ہی خراب ہے، تھک ہار کر اُس نے اپنے آپ کو سمجھایا، اور سو گیا۔

دوسرے دن جمعہ تھا، صبح ناشتے کی میز پر اس نے دیکھا کہ امی کے ساتھ ساتھ آج ابو بھی غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ رات امی نے انہیں اسکول کی رپورٹ کے متعلق بتادیا

ہے۔ عمران کو بڑی ندامت محسوس ہوئی، اُسے ٹیچر اور اپنے ہم جماعتوں پر بھی غصہ آیا جنہوں نے شکایت کر کے اسے امّی اَبّو کے آگے شرمندہ کرا دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں منصوبے بنانے لگا کہ اگلے روز جب وہ اسکول جائے گا تو ایسے تمام لڑکوں کی پٹائی کرے گا جو اسکی چغلیاں کرتے ہیں اور جس قدر ہو سکا مِس کو تنگ کرے گا چاہے پھر کتنی ہی مار کھانی پڑے۔ ابھی وہ مِس کو ستانے کا طریقہ سوچ ہی رہا تھا کہ اَبّو نے میز سے اٹھتے ہوئے اسے اپنے کمرے میں آنے کے لئے کہا۔ عمران سمجھ گیا کہ جو کچھ اس کے ساتھ کل نہ ہو سکا وہ آج ہونے والا ہے، امّی اَبّو، کوئی بھی تو مجھے پسند نہیں کرتا۔ نہ ہی، مجھے کب کوئی اچھا لگتا ہے۔ وہ زور زور سے پاؤں پٹختا اَبّو کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ خلافِ توقع اَبّو نے بڑی نرمی سے اسے اپنے پاس بٹھایا اور دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"عمران! کیا یہ صحیح ہے کہ تم اسکول میں اپنے ساتھیوں کو مارتے ہو؟"

اِن کی نرمی نے عمران کا حوصلہ بڑھایا وہ بے جھجک بولا۔ "جی ہاں ابو! اس لئے کہ وہ سب میرے دشمن ہیں مجھ سے جلتے ہیں۔ کوئی بھی میرے ساتھ نہیں کھیلتا۔"

"تم نے کبھی سوچا بیٹے کہ اسکی وجہ کیا ہے۔؟" ابو نے پوچھا "بہت ٹھنڈے دل کے ساتھ تم اپنے رویئے پر غور کرو، کہیں ایسا تو نہیں کہ کھیل کے دوران تم صرف اپنی بات منوانا چاہتے ہو، دوسروں کی تعریف یا کامیابی تمہیں پریشان کردیتی ہے اور تم بجائے انہیں مبارکباد دینے کے ذلیل کرنا چاہتے ہو!"

عمران سوچ میں پڑ گیا، اسے یوں لگا جیسے ابو کلاس یا کھیل کے میدان میں چھُپ چھُپ کر اسے دیکھتے رہے ہوں کیونکہ ان ساری باتوں میں بڑی حقیقت ہے۔

اِسے چپ دیکھ کر اَبّو نے جواب دینے پر اصرار نہیں کیا وہ اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ موضوع بدل کر پوچھنے لگے، "اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہیں اپنے بہن بھائی اچھے لگتے ہیں۔ دیکھو بڑی سچائی سے جواب دینا۔"

"ہاں کبھی کبھی اچھے لگتے ہیں" عمران جواب دیا۔

"کب؟" ابو نے دوسرا سوال کیا۔ "ان کی کون سی عادت تمہیں اچھی لگتی ہے؟"

"جب وہ میرا حکم مانتے ہیں، میرا کام کرتے ہیں"۔

"لیکن یہ تو محبت کا ایک ہی رُخ ہوا نا بیٹے" ابو نے پیار سے کہا۔ "کہ بس وہی تمہارے کام آتے رہیں تو تم انہیں اچھا سمجھو، کیا ان کا دل نہیں چاہتا ہوگا کہ تم بھی کبھی ان کی مدد کرو۔"

"لیکن ابو وہ تو مجھ سے کچھ کہتے ہی نہیں"

" یہ اس لئے کہ انہیں تم سے امید ہی نہیں کہ کبھی ان کی بات مانو گے"

" لیکن میں کیا کروں ابو مجھ سے کوئی بھی خوش نہیں رہتا، اس لئے میرا بھی جی نہیں چاہتا کسی سے پیار کرنے کو"

" دیکھو بیٹے! کسی سے حکم منوانے اور کام لینے میں جتنا مزا ہے اس سے کہیں زیادہ کسی کی بات ماننے اور خود اس کے کام آنے میں لطف ہے"

" وہ کیسے ابو؟" عمران نے تعجب سے پوچھا۔

" وہ ایسے میری جان کہ فرض کرو تم نے کسی امتحان یا کھیل میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور بہت سے لوگ تمہیں مبارکباد دیں، تعریف کریں تو تمہیں کیسا لگے گا۔؟"

" بہت اچھا" عمران نے بڑے یقین سے جواب دیا۔

" لیکن اگر تم دوسروں کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دینے کے عادی نہیں ہو تو انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ تمہاری خوشی کا خیال رکھیں، سمجھے میری بات۔؟"

عمران نے اقرار میں گردن ہلائی، ابو نے ایک مرتبہ پھر موضوع بدل دیا۔" تمہیں معلوم ہے بیٹے کہ اگر تم زمین میں پھولوں کے بیج ڈالو گے تو کون سا پودا اگے گا۔؟"

لیجئے ابو! کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا" عمران نے فخر سے کہا۔" ظاہر ہے انہی پھولوں کا"

" اگر کسی کانٹے دار جھاڑی کے بیج بوؤ گے تب"

" پھر وہاں سے کانٹے ہی نکلیں گے" عمران نے فوراً جواب دیا۔

بس تو پھر سمجھ لو کہ دنیا کی مثال بھی ایسی ہے اگر تم دوسروں سے محبت کرو گے تو وہ بھی جواب میں تمہیں پیار دیں گے، اگر تم ان سے نفرت اور حقارت کا سلوک کرو گے تو بدلے میں تمہیں بھی انہی جذبوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

ابوّ نے غور سے اسکی طرف دیکھا عمران کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ بے حد متاثر ہے۔ ابو نے اپنی بات جاری رکھی۔

" پھر کسی کو چاہنے، خوش رکھنے اور اپنی چیز دے دینے میں جو بڑائی کا احساس ہے نا وہ انسان کو سچی مسرت بخشتا ہے یہ جذبہ نہ ہوتا تو نہ والدین اپنی اولاد کی بھلائی کی خاطر اپنا آرام مٹاتے، نہ ننھے منّے پرندے اپنے بچوں کی خاطر صبح سے شام تک دانہ دنکا ڈھونڈتے پھرتے۔ کوئی کسی کے کام نہ آتا تب اس دنیا کا کیا حال ہوتا شاید تم نہ سمجھ سکو۔"

ابو کا اندازہ درست تھا، عمران کی سمجھ میں بہت کچھ آ رہا تھا، اپنی بیماری میں امّی کا رات رات بھر جاگنا، ان سب کی خاطر ابو کا انتھک محنت کرنا۔ انہیں تعلیم دینے کے لئے اساتذہ کی جدوجہد، بڑی جماعت کے لڑکوں کا اپنے سے چھوٹوں کی مدد کرنا۔ اس سارے عمل میں یقیناً بہت مزا آتا ہوگا ورنہ کوئی بھی اتنی تکلیف نہ برداشت کرتا۔

سوچتے ہوئے اس کی نظر ذیشان پر پڑی جو بڑی محنت سے اسکی سائیکل صاف کر رہا تھا۔
"ثانی" اس نے بھائی کو آواز دی۔
"جی بھائی جان" وہ لپکا ہوا چلا آیا۔
"تمہیں سائیکل چلانا اچھا لگتا ہے؟"
جی... جی ہاں، لیکن سچ بھائی جان میں نے آپ کی سائیکل کبھی نہیں چلائی" ذیشان گھبرا گیا۔
"کیوں؟ وہ تمہارے لئے بھی تو ہے"۔ عمران نے محبت سے کہا۔" اچھا ذرا اسے چلا کر تو دکھاؤ مجھے"
پہلے تو ذیشان کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اور جب اسے پتہ چلا کہ عمران سچ مچ اسے اجازت دے رہا ہے وہ، ہرّا بھائی جان" کہہ کر بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ اور زور سے اس کا مُنہ چُوم کر سائیکل کی طرف دوڑا۔
عمران کی نظر سامنے لگے آئینے پر پڑی اس کا رنگ شیشے کی مانند چمک رہا تھا۔ اسے بے اختیار ہنسی آنے لگی تھی۔
"شاباش بیٹے، دیکھا محبت کا کرشمہ" ابو نے اس کے تمتماتے چہرے پر نظر ڈالی۔" یہ لو اپنا چپس کا پیکٹ"
عمران نے بے تابی سے پیکٹ کھولا، چپس منہ رکھتے ہوئے اسکی نگاہ منی پر پڑی جو دور کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔ اُس کا ہاتھ رُک گیا۔ "منی.... اے منی"
"جی بھائی جان" وہ دوڑتی ہوئی آئی۔" پانی لاؤں آپ کے لئے؟"
ارے نہیں، اِدھر آؤ میرے پاس، یہ پیکٹ تم لے لو"
"کیوں بھائی جان؟" منی کی سمجھ میں نہ آیا کہ آج یہ چپس اسے کیوں پکڑائے جا رہے ہیں۔
"کھانے کے لئے، اور کس لئے" عمران نے اسے پیار سے چپت لگائی" لو شاباش یہ سب تمہارے ہیں"۔
"سچ" !! منی نے تصدیق چاہی۔
"اور نہیں تو کیا جھوٹ" عمران نے مسکرا کر کہا تو وہ بجائے پیکٹ لے کر چلے جانے کے اس کے قریب آگئی اور اس سے بالکل جُڑ کر چپس کھانے لگی۔
"ارے بیٹے یہ شریر تو اپنا حصّہ سب سے پہلے کھا چکی ہے" امّی نے کہا۔
"تو کیا ہوا امی" اس چٹوری بلی کو چپس پسند بھی تو بہت ہیں" عمران نے جواب دیا تو منی نے بڑے لاڈ سے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ امّی ابو انہیں پیار سے دیکھ کر مسکرانے لگے۔
عمران کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا سینہ چوڑا ہو گیا ہے۔ بالکل ابو کی طرح اب اس میں اتنی گنجائش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ دوسروں کی خوشی میں خوش ہو سکے۔

67

س۔ خ۔ ع

کردار کی عمارت

کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ ایک ننھّے معمار ہیں؟ اور روزانہ بہت سارے لوگ آپ کو کچھ نہ کچھ تعمیر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ امی جان اور ابو جان بھی فکر مند رہتے ہیں کہ آپ کی تعمیر کی بنیاد اچھی ہے کہ نہیں۔

آپ کہیں گے کہ ہمیں تو تھوڑی یا آری پکڑنا نہیں آتی اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ مختلف اوزاروں کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے پھر ہم کوئی چیز کس طرح تعمیر کر سکتے ہیں؟ میں آپ کو بتاتا ہوں۔

جو عمارت آپ تعمیر کر رہے ہیں وہ آپ کا "کردار" ہے اگر کوئی اچھا ہوتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا کردار اچھا ہے۔ اگر کوئی شریر ہو تو کہا جاتا ہے کہ اس کا کردار خراب ہے۔

جیسے ہم ہوتے ہیں ویسا ہی ہمارا کردار ہوتا ہے۔

عُمر کا سب سے اچھا حصّہ وہ ہوتا ہے جب آپ چھوٹے سے ہوتے ہیں اور یہی آپ کے کردار کا بُنیادی حصّہ ہوتا ہے۔

ایک صبح کا ذکر ہے میں سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ اتنے میں شراب کے نشے میں مدہوش ایک آدمی جس نے پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے میری طرف آیا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اچانک وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی عمارت لڑکھڑا کر گرنے والی ہو۔ آپ نے دیکھا کہ اس نے اپنا کردار غلط بنایا تھا۔

میں آپ کو ایک اور بوڑھے آدمی کے بارے میں بتاؤں جسے سارے لوگ چچا فضل کے نام سے جانتے تھے۔ اُن کی عمر اسّی برس کے قریب تھی اور ان کے سر اور داڑھی کے بال بالکل برف کی طرح سفید تھے۔ ان کا چہرہ دیکھ کر ہی اُن سے محبّت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ اکثر ہمارے گھر پر آیا کرتے۔ چچا فضل دوسروں کی اکثر مدد کرتے تھے نہ تو وہ سگریٹ پیتے تھے اور نہ ہی کسی کو انھوں نے کبھی گالی دی۔ اب ان سے ملے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا مگر اب بھی میں ان سے محبّت کرتا ہوں۔ وہ بالکل اس عمارت کی طرح تھے جو ________ بالکل سیدھی ہو اور جس کی بنیاد اچھی اور مضبوط ہو۔ یعنی انہوں نے اپنا کردار اچھا بنایا تھا۔ اب اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ ان دونوں میں کس کی طرح بننا چاہیں گے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کا جواب ہوگا "چچا فضل کی طرح"۔ آپ کو معلوم ہے کہ کسی عمارت کا کونسا حصّہ سب سے پہلے تعمیر ہوتا ہے؟ وہ حصّہ اس کی بنیاد ہوتا ہے۔ اگر بنیاد اچھی اور مضبوط ہوگی تو عمارت بھی ویسی ہی بنے گی۔ اس طرح اگر آپ بچپن میں اچھے اور نیک رہیں گے تو بڑے ہو کر بھی آپ نیک اور اچھے رہیں گے۔ بالکل چچا فضل کی طرح۔

آپ کو میں بتاؤں کہ آپ اپنی "کردار کی عمارت" کی بنیاد میں کون سے اچھے عناصر شامل کریں گے۔ جس سے آپ کی عمارت مضبوط ہو۔ وہ عناصر ایمان، اطاعت، ایمانداری، سچّائی، بے غرضی، پاکیزگی، محبّت، تعاون اور ثابت قدمی ہیں۔

اخگر انور اعوان

شیطان

کسی گاؤں میں رمضانی نام کا ایک شخص رہتا تھا۔ جو کاشتکاری کر کے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ رمضانی اگرچہ ایک کسان تھا۔ مگر اپنی چند خوبیوں کے باعث گاؤں کا ہر شخص اس کی عزّت کیا کرتا۔ ایک تو وہ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتا تھا، دوسرا کبھی غصّے میں آکر آپے سے باہر نہیں ہوتا تھا۔ غرور اور تکبّر تو اس میں نام کو نہ تھا اور وہ اپنی فالتو آمدنی کو ہمیشہ غریب لوگوں کی ضرورت پوری کرتے پر صرف کرتا۔

یہ بات تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکالے جانے کے وقت ہی سے ہر اچھی بات سے نفرت ابلیس کا منشور رہی ہے۔ شیطان اپنے چیلوں کے ہمراہ ہر دم لوگوں کو راہِ راست سے بھٹکانے میں مصروف رہتا ہے۔ رمضانی کو بھٹکانے کا کام بھی اس نے اپنے کئی چیلوں کے سپرد کیا لیکن وہ سب کے سب ناکام لوٹے۔ آخر شیطان نے

اپنے سب سے ہونہار چیلے کو اہم ہدایات کے ساتھ اس کام پر مامور کیا کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے رمضانی کو ورغلا کر راہِ راست سے بھٹکائے۔

رمضانی کا معمول تھا کہ وہ فجر کے بعد ہی ہل چلانے کھیتوں میں چلا جاتا اور اپنا ناشتہ بھی ساتھ ہی لے جاتا۔ ایک روز حسبِ معمول وہ ناشتے کی پوٹلی کے ہمراہ کام پر پہنچا۔ ناشتے کی پوٹلی کو کوٹ میں لپیٹ کر جھاڑی کے نیچے چھپایا اور بیل کو ہل میں جوت کر کام کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد جب بیل تھک گیا اور خود رمضانی کو بھوک محسوس ہوئی تو وہ بیل کو چرنے کے لئے کھلا چھوڑ کر ناشتہ لینے چل دیا۔ وہاں پہنچ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جھاڑی کے نیچے کوٹ تو موجود تھا لیکن ناشتے کی پوٹلی اس میں موجود نہ تھی۔ رمضانی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کیونکہ باوجود اس نے کسی کو وہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا پھر اس کا ناشتہ کیسے غائب ہوا؟ "

ہوا یوں کہ جس وقت رمضانی کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا عین اسی وقت شیطان کے چیلے نے اس کی روٹیاں غائب کر دیں۔ اور اب وہ جھاڑیوں کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا تاکہ وہ رمضانی کو غصے میں گالیاں بکتے ہوئے اور شیطان کو مدد کے لئے بلاتے ہوئے سنے، رمضانی کو ناشتے کے یوں غائب ہو جانے کا افسوس تو بہت تھا اور اسے بھوک بھی خوب لگی تھی لیکن اس نے سوچا "اب کیا ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ جس کسی نے بھی میرا ناشتہ غائب کیا ہے اس کو اس کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اللہ کرے یہ ناشتہ اس کے لئے بہتری کا سامان ثابت ہو اور اس کا بھلا ہو" یہ سوچ کر اس نے کنوئیں سے کچھ پانی پیا، کچھ دیر آرام کیا اور اللہ کا شکر ادا کر کے دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔

یہ صورتحال دیکھ کر شیطان کے چیلے کو بہت پریشانی ہوئی کیونکہ وہ رمضانی کے منہ سے گالیاں نکلوانے میں ناکام رہا تھا۔ ابتدا ہی میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ اسی پریشانی کی حالت میں اپنے آقا (شیطان) کے پاس پہنچا اور پوری روئیداد اُسے سنائی، یہ بات سن کر شیطان غصے میں آ گیا اور بولا" اگر وہ شخص برائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوا تو اس میں قصور تمہارا ہے۔ کیا میں نے تم سب کو اس لئے رکھا ہوا ہے کہ ذرا سا مشکل کام پڑ جائے تو تم پریشان ہو جاؤ۔ تم لوگ اپنی ذمہ داریاں نبھانا نہیں جانتے۔ اگر تمام نیک لوگ ہماری چالوں سے اسی طرح بچتے رہے تو ہم تو تباہ ہو جائیں گے۔ اس صورتحال کو اسی حالت میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جاؤ اور حالات کو سنبھالا دو۔ میں تم کو تین سال کی مہلت دیتا ہوں اگر اس دوران بھی تم کامیاب نہ ہوئے تو یاد رکھو میں تمہیں آبِ زمزم سے نہلوا دوں گا۔ اور آئندہ سے تمہیں ہر گندی چیز سے دُور رکھا جائے گا۔

اس متبرک اور پاکیزہ پانی میں نہانے اور گندی چیزوں سے محروم ہو جانے کے تصور سے شیطان کے چیلے کو خوف کی جھرجھری آ گئی۔ وہ فوراً وہاں سے بھاگا اور راستے بھر سوچتا رہا کہ اس غلطی کا ازالہ کیسے کیا جائے۔ اس صورتحال پر اس نے کافی سوچ بچار کیا اور آخر کار اس نے ایک تین سال منصوبہ تیار کر لیا۔ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اس

نے ایک مزدور کا بھیس بدلا اور جا کر رمضانی کی نوکری اختیار کرلی۔ پہلے سال اس نے رمضانی کو مشورہ دیا کہ وہ نچی زمین پر فصل کاشت کرے اور رمضانی نے ایسا ہی کیا۔ اس سال موسم گرم اور خشک رہا۔ دوسرے کسانوں کی فصلیں سورج کی شدید دھوپ میں جل گئیں لیکن رمضانی کی فصل چونکہ نیچی زمین پر واقع تھی اس لئے وہ موسم کے اثرات سے محفوظ رہی اس کی فصل بڑی اچھی رہی۔ اور خوشے موٹے موٹے دانوں سے بھر گئے۔ اس بار سال بھر کے مصارف کے لئے گندم نکالنے کے بعد بھی کافی گندم بچ گئی۔

اگلے سال شیطان کے چیلے نے رمضانی کو مشورہ دیا کہ وہ اس دفعہ پہاڑی پر فصل کاشت کرے۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اتفاق سے یہ سال بارشوں سے بھرپور رہا۔ شدّتِ بارش اور کثرت پانی نے تمام فصلوں کو تباہ کر کے رکھ دیا لیکن رمضانی کی فصل ان آفتوں سے محفوظ رہی۔ اس سال اس کے پاس گزشتہ سال کے مقابلے میں اور زیادہ گندم بچ گئی اب اس کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اس بچی ہوئی گندم کا استعمال کیا ہو؟ شیطان کے چیلے کی محبت نے اس کے دل سے غریبوں کی محبّت اور خیرات کی برکت کا خیال نکال دیا تھا۔

یہ وقت تھا جب شیطان کے چیلے نے منصوبے کا دوسرا مرحلہ شروع کیا۔ اس نے رمضانی کو بتایا کہ کس طرح گندم کو پیس کر اور بعض دوسری چیزیں اس میں ملا کر ایک نشہ آور مشروب تیار کیا جا سکتا ہے۔ سادہ لوح رمضانی نے اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے تمام فالتو گندم کی شراب تیار کی اور اس کا استعمال شروع کردیا۔ شراب کو اسلام نے اُمّ الخبائث بتایا ہے چنانچہ اس کے استعمال سے برائیوں کے لئے تمام راستے صاف ہو جاتے ہیں۔ یہی کچھ رمضانی کے ساتھ بھی ہوا۔

اب شیطان کا چیلا اپنے آقا کے پاس پہنچا اور بڑے فخر سے اس کے سامنے دعویٰ کیا کہ جہاں وہ ایک مرتبہ ناکام ہو گیا تھا آج اس کی اسی جگہ کامیابی ہوئی ہے۔ شیطان نے یہ سن کر فیصلہ کیا کہ وہ خود جا کر اس کی کارکردگی کو دیکھے گا۔

شیطان اپنے اس ہونہار شاگرد کے ہمراہ رمضانی کے گھر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ رمضانی نے اپنے امیر دوستوں کی دعوت کر رکھی ہے۔ اور وہ اور اس کی بیوی شراب کے گلاس بھر بھر کر مہمانوں کو پیش کر رہے ہیں۔ اسی دوران اس کی بیوی میز سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑائی اور رکم و بیش گلاس بھر شراب فرش پر گر کر پھیل گئی۔ رمضانی یہ دیکھ کر چلاّیا "او احمق عورت یہ کیا بدتمیزی ہے؟ کیا تمہارے خیال میں یہ قیمتی مشروب کوئی عام پانی ہے جو تم اسے یوں فرش پر پھینک رہی ہو؟ جاہل اور پھوہڑ عورت!" اب چیلے نے اپنے آقا کو اشارہ کیا اور بتلایا کہ یہ وہ شخص ہے جب شدید بھوک کی حالت میں اس کا واحد ناشتہ غائب ہو گیا تھا تو اس نے کسی قسم کے غصّے یا خفگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اور اب بہت سی شراب میں سے ایک گلاس ضائع ہو جانے پر غصّے میں آگیا ہے۔

رمضانی نے بیوی کو بہت ڈانٹا اور پھر خود ہی مہمانوں کو شراب پیش کرنے لگا۔ عین اسی وقت اس کا ایک

غریب دوست جسے مدعو نہیں کیا گیا تھا رمضانی سے ملنے آگیا وہ دعوت میں موجود ہر شخص کو سلام کرنے کے بعد زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ اور بھوک پیاس سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھا رہا لیکن رمضانی نے نہ اس کو کچھ پیش کیا اور نہ ہی اس کی طرف توجہ کی۔ اس چیز نے شیطان کو خوش کر دیا لیکن چیلا مسکرایا اور بولا "ابھی دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے"

دیہاتیوں نے ایک ایک گلاس پیا اور ایک دوسرے کے متعلق چاپلوسی والی باتیں کرنا شروع کر دیں شیطان یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور چیلے کو شاباشی دیتے ہوئے بولا "اگر یہ مشروب ان میں ایسی لومڑیوں والی عادتیں پیدا کر دیتا ہے تو جلد ہی یہ ہمارے ہاتھوں میں کھلونے بن کے رہ جائیں گے"۔ ابھی آگے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے، چیلا فخر سے بولا "ابھی تو دُم ہلا ہلا کر لومڑیوں کی طرح ایک دوسرے کی خوشامدیں کر رہے ہیں۔ ذرا انہیں ایک ایک گلاس اور پینے دیں۔ جلد ہی یہ خونخوار بھیڑیوں کی مانند ہو جائیں گے"

دیہاتیوں نے دوسرا گلاس بھی پیا اور اس کے ساتھ ہی ان کی گفتگو غیر مہذب اور بھونڈی ہو گئی۔ اب وہ نرم گفتگو کرنے کی بجائے ایک دوسرے سے ناراض ہو کر ایک دوسرے پر چلانے لگے اور پھر جلد ہی ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے۔ ہاتھا پائی کا آغاز ہوا ایک دوسرے کے مُنہ پر گھونسے پڑنے لگے۔ میزبان بھی اس افراتفری میں شریک تھا۔ چنانچہ اس کی بھی اچھی خاصی پٹائی ہوئی۔

شیطان یہ سب کچھ بڑی مسرت اور اشتیاق سے دیکھ رہا تھا "بہت خوب!" وہ چلایا اور چیلے کو تھپکی دی لیکن چیلے نے مزید فخر کرتے ہوئے جواب دیا "ابھی تو آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

تیسرا گلاس پیتے ہی دیہاتی آپس میں جانوروں کی طرح دھینگا مشتی کرنے لگے۔ وہ سب مل کر چیختے اور عجیب عجیب آوازیں نکالنے لگے۔ کسی کو بھی اس چیز کا احساس نہ تھا کہ وہ کیوں چیخ رہے ہیں اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کی آوازیں سن رہے تھے۔

تمام مہمان آہستہ آہستہ لڑکھڑاتے ہوئے وہاں سے کھسکنے لگے۔ میزبان (رمضانی) مہمانوں کو الوداع کہنے کے لئے باہر نکلا۔ سڑک کے کنارے جمع کیچڑ میں مُنہ کے بل گرا اور کیچڑ میں لت پت ہو گیا نشے میں وہ اتنا چور تھا کہ دوبارہ اُٹھ نہ سکا۔ لیٹا لیٹا منہ سے اور نتھنوں سے عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگا۔

اس پر شیطان خوشی سے چلا اٹھا: "بہت خوب، شاباش، تم نے بہت اچھا مشروب ایجاد کیا ہے۔ میرا خیال ہے تم نے سب سے پہلے اس میں لومڑی کا خون شامل کیا ہوگا جس کے اثر سے دیہاتی ایک دوسرے کو لومڑی کی طرح کی چالاکی دکھانے لگے۔ پھر تم نے اس میں بھیڑیے کا خون شامل کیا ہوگا جس کی وجہ سے یہ لوگ بھیڑیوں

کی طرح آپس میں جھگڑنے لگے اور سب سے آخر میں تم نے اس میں سوّر کا خون شامل کیا ہوگا۔ جس کے اثر سے وہ جنگلی اور خونخوار ہو گئے۔"

"نہیں، بالکل نہیں" شیطان کے چیلے نے جواب دیا۔ "مجھے یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی بلکہ میں نے صرف اس چیز کا انتظام کیا کہ رمضانی کو اس کی ضرورت سے زیادہ گندم مل جائے اور وہ اسے ذخیرہ کرلے۔ وحشی جانوروں والی خصلتیں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ مگر جب تک اس کو اسکی ضرورت کے مطابق ملتا رہے اس وقت تک یہ خصلتیں قابو میں رہتی ہیں۔

ایک وقت تھا جب رمضانی نے ناشتے کے کھو جانے پر کسی غصے کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن جب اس کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ گندم آئی اور تکبّر نے دل میں جگہ بنالی تو اس نے محنت چھوڑدی۔ اور جب اس نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا غلط استعمال کیا تو اس کے خون میں موجود وحشی جانوروں والی خصلتوں نے اپنا آپ دکھانا شروع کردیا۔ جو بھی شخص ضرورت سے زیادہ مل جانے پر اللہ تعالیٰ کو بھلا دیتا ہے۔ وہ آسانی سے ہمارے دام میں پھنس جاتا ہے۔ شیطان نے چیلے کی بہت تعریف کی اور اسکی گزشتہ غلطی پر اسے معاف کرتے ہوئے اس کو اگلے عہدے پر ترقی دے دی۔

مصوّر بندر

۱۹۵۸ء میں لندن کی ایک آرٹ گیلری میں ۳۸۰ تصویریں رکھی گئی تھیں، ان کی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان تصویروں کے مصور دو بندر تھے۔ یہ تصویریں ایک لاکھ پونڈ میں فروخت ہوئی تھیں۔

طویل ترین بادشاہی

جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے تاریخ میں سب سے لمبا عرصہ حکومت کی ہے، وہ ابھی زندہ ہیں اور بدستور شہنشاہ چلے آرہے ہیں ان کی شہنشاہی کا عرصہ ساٹھ سال ہوچکا ہے اور ان کی عمر پچاسی برس ہے۔

پہلا اخبار

سب سے پہلے جولیئس قیصر روم نے روزانہ اخبار کا اجراء کیا، اس میں روزمرّہ کے واقعات، حکومت کے احکام کے علاوہ قومی حالات بھی درج ہوتے تھے۔

آپ کی پسندیدہ اور مقبول ترین
بِلّی مارکہ
میٹرو مِلن
اگربتّی

بھینی بھینی
اور مسحور کُن خوشبو والی
بلّی مارکہ
میٹرو مِلن اگربتّی
سیلوفین ایئر ٹائٹ پیکنگ میں
ٹیئر اسٹریپ کے ساتھ
تمام ممتاز ڈیلروں سے دستیاب ہے۔

تیار کردہ:
میٹرو اگربتّی کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۴۸۸ - کراچی
فون: ۲۹۲۷۳۷ - ۲۹۰۸۷۷ - ٹیلیکس ۲۳۴۳۴، میٹرو پی کے

عبیداللہ

بھلا کر بھلا ہو گا

اشرف سیٹھ اجمل کا کرائے دار تھا۔ سیٹھ صاحب کا شمار ڈھاکہ کے صفِ اوّل کے رئیسوں میں ہوتا تھا اِدھر اُدھر کوئی آٹھ دس کارخانے اور فیکٹریاں ان کی ملکیت تھیں اشرف بھی ان ہی کی ملکیت، ایک مکان میں سو روپے کرایہ پر رہتا تھا۔

اشرف کا بیٹا اکرم بڑا ذہین اور محنتی طالب علم تھا۔ کئی مرتبہ کلاس بھر میں اور ایک آدھ مرتبہ تو اسکول بھر میں اوّل پوزیشن حاصل کر چکا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد اس نے کالج کی زندگی اپنائی ابھی وہ سیکنڈ ائیر میں پڑھ رہا تھا۔ کہ اس کے والد صاحب پر اچانک دِل کا مہلک دورہ پڑا۔ ان کی زندگی بچانے کے لئے مقدور بھر کوششیں کی گئیں کافی بھاگ دوڑ کی گئی۔ لیکن شاید زندگی ہار چکی تھی۔ دل کا یہ دورہ بالآخر جان لیوا ثابت ہوا اور وہ موت کے ظالم پنجے سے بچ نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس طرح فرشتہ اجل نے اکرم کے سر سے وہ سایۂ رحمت چھین لیا تھا جس کے طفیل یہ مختصر کنبہ وقت کی گاڑی کھینچ رہا تھا۔ والد محترم کی بے وقت موت نے اکرم کو ادھ مُوا کر دیا۔ اب دکھیاری ماں اور یتیم بہن بھائیوں

کا وہ ہی تو واحد سہارا اور کفیل بھی تھا۔

تیزی سے بدلتے ہوئے ان دگرگوں حالات میں اسے کسی ایسے دستِ غیب کی بھی اُمید نہ تھی کہ وہ اہل خانہ کی کفالت کے بوجھ سے آسن طریقہ پر سبکدوش ہو سکے اور سلسلۂ تعلیم بھی منقطع نہ ہونے پائے۔

قدرت انسان پر چند دروازے بند کر دیتی ہے تو کچھ نئے دروازے کھول بھی دیتی ہے۔ اس مُصیبت اور بیکسی کے وقت سیٹھ اجمل اس کے لئے اندھیرے میں شمع اور اذیّت میں رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے۔ ان سے اس گھر کی بربادی دیکھی نہ گئی سیٹھ صاحب نے اکرم اور اس کے اہلِ خانہ کو تباہیوں سے بچا لینے کا تہیہ کر لیا تھا انہی نیک خیالات کے تحت انہوں نے نہ صرف مکان کا کرایہ اس وقت تک نہ لینے کا وعدہ کیا جب تک کہ اکرم اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا بلکہ اکرم کے گھر کے ہر قسم کے اخراجات بھی خود برداشت کرنے کی پیش کش کر دی۔

گو اکرم خوددار لڑکا تھا لیکن مجبوری کیا نہیں کرواتی، مختصر یہ کہ اس نے بادلِ ناخواستہ سیٹھ اجمل کے اس بَروقت بے غرض احسان کو بھی قبول کر لیا اور خود تلاشِ معاش میں لگ گیا۔ بھلا سیٹھ صاحب اس کی تعلیم کو ادھورا کیسے دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے اکرم کو واضح طور پر کم از کم الف اے تک تعلیم بہتر صورت میں مکمل کر لینے کی سخت ہدایت کر دی۔ انسان دوست سیٹھ اجمل کی نوازشات یہیں تک محدود نہ تھیں بلکہ انہوں نے بارہا تلقین کی کہ وہ اپنے ہر قسم بمعہ تدریس کے اخراجات بلا تامّل و جھجک ان سے لے لیا کرے کہ

میں اس نازک ترین مرحلہ پر جب کہ خدا نے ایک کنبہ کو سہارا دے کر نئی زندگی کی راہوں پر گامزن کر سکنے کی صلاحیت مجھے بخش رکھی ہے۔ اگر تمہاری مدد و اعانت میں کوئی کسر اٹھا رکھوں گا تو آخر کب اور کس کے کام آ سکوں گا۔ کہ قدرت کو مصیبت زدہ افراد ہی کا امتحان مقصود نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت قرب و جوار کے صاحبِ حیثیت افراد کا ظرف بھی آزمائش سے دوچار ہوتا ہے۔

خود دار اکرم ہر روز اپنے اخراجات کے بعد بچے ہوئے پیسے سیٹھ صاحب کو واپس کر دیتا تھا حالات انسان کو جینے کا قرینہ سِکھا دیتے ہیں اور اکرم تو ویسے بھی کافی حد تک کفایت شعار واقع ہوا تھا لہٰذا کبھی کبھی تو رقم جیسی کی ویسی لوٹا دیتا جس پر سیٹھ صاحب مجسّم حیرت و تعجب بن جاتے اور یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے رہنے دو بیٹا کل کام آجائیں گے۔ لیکن شاید اکرم اپنے اُصولوں سے انحراف کرنا گوارا نہ کر سکتا تھا وہ سیٹھ صاحب کی بات اکثر رَد کر دیتا۔

بنیادی ضروریاتِ زندگانی کے باآسانی حصول کی اس صُورت نے اکرم کے شانوں سے ایک گراں بار اُٹھالیا

تھا یہی وجہ تھی کہ وہ حسبِ معمول دل لگا کر پڑھنے لگا اس کی انتھک محنت رنگ لائی اس کے رتجگے کام آئے۔ وہ ایف اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کر چکا تھا۔

حصولِ ملازمت بھی کوئی آسان کام نہیں تھا چونکہ وہ دور گذر چکا ہے جب ایک میٹرک پاس کو بھی اعلیٰ آسامی پر فائز کر لیا جاتا تھا لہٰذا وہ جہاں جاتا ہر دَر خود پر بند پاتا۔

متواتر دو مہینے دَربدَر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اسے ایک دن اخبار میں ایک ضرورت کا اشتہار نظر آیا۔ حسبِ مطلوب وہ اس ملازمت کے لئے انتہائی موزوں تھا۔ تمام شرائط پر اکرم پورا اترتا تھا اور اس ملازمت میں مزید ترقیوں کے روشن امکانات بھی تو موجود تھے۔

لیکن صرف ایک مشکل رہ گئی تھی وہ یہ کہ یہ آسامی اس کے شہر یا کسی نزدیکی دوسرے شہر میں نہیں بلکہ ہزاروں میل دُور ملک کے مغربی حصہ میں تھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جو شخص روٹی، کپڑے اور مکان جیسی بنیادی ضروریات انسانی کے لئے دوسروں کا محتاج ہو وہ اتنے لمبے سفر کے اخراجات کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

حسبِ معمول شام ڈھلے اکرم سیٹھ صاحب کی خدمت میں فاضل رقم شکریہ کے ساتھ لوٹانے کے لئے حاضر ہوا۔ سیٹھ اجمل کی زمانہ شناس نگاہوں نے بِن کہے سُنے اکرم کی دِلی کیفیت بھانپ لی جبھی تو انہوں نے استفسار کیا کیا بات ہے بھئی اکرم بیٹے مجھے آج خلافِ معمول تم کچھ بجھے بجھے سے دکھائی دے رہے ہو۔

اکرم نے حقیقت چُھپانا مناسب نہ سمجھا اور مذکورہ ملازمت کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ جب سیٹھ صاحب کو اکرم کی خواہش کا علم ہوا تو گویا ہوئے۔

"اکرم بیٹے دُور جانے کا ارادہ ترک کر دو یہیں رہو۔ اللہ رازق و رحیم ہے، روزی اسی کے ہاتھ ہے وہی تمام مخلوق کا روزی رَساں ہے ہم اس کی مصلحتیں نہیں سمجھ پاتے بس اس کے دینے کے انداز مختلف ہیں ہر جاندار کے لئے الگ الگ ذرائع بنے ہوئے ہیں ہم کچھ بھی نہیں ہم بھی اسی کی جانب سے ایک وسیلہ ہیں۔

لیکن سیٹھ صاحب اکرم بولا ہم آخر کب تک آپ پر بوجھ بنے رہیں گے۔ آپ کے ارشادات بالکل بجا سہی لیکن سماجی اصول اور معاشرتی قوانین بھی تو کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ ذاتی انا بھی تو کوئی چیز ہے اب تو مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے آپ نے ایک طویل عرصہ تک ہماری ہر ضرورت کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ یہی کیا کم ہے ؟ میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ" اکرم کچھ دیر یاس لینے کے لئے رُکا۔ اپنے جذبات پر قابو پا کر گفتگو دوبارہ شروع کی۔ آپ بھی نہ جانے کیا سوچیں گے کہ کس بے حیائی سے دستِ سوال دراز کر رہا ہوں۔ لیکن میں فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ بے باکانہ جرات بھی آپ ہی کی شخصیت کے سحر کے طفیل مجھ میں پیدا ہوئی ہے۔

"میری خواہش ہے کہ یہ ملازمت ضرور حاصل کروں اور پھر یہ آسامی تو کوٹہ سسٹم کے تحت مشرقی پاکستان کا حصہ ہے مجھے اُمید ہے کہ اس مرتبہ مجھے ترقی کی راہیں ضرور مل جائیں گی بس اگر ممکن ہو تو آپ میرا مغربی پاکستان جانے کا انتظام کروادیں۔ اللہ نے چاہا تو میں آپ کی پائی پائی اتار دوں گا۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ آپ کی رقم سے کئی گنا زیادہ ادائیگی بھی آپ کی عنایات کا بدل کسی صورت نہیں ہوسکتی۔

آج اکرم نے بھرپور انداز میں رحمدل سیٹھ صاحب کے رُوبرُو اپنا مدعا بیان کر دیا تھا اس کی اتنی مؤثر اور طویل وضاحت سے اجمل کا دل پسیج گیا۔ ان کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں اور گویا ہوئے "بیٹے" میں تمہیں تلاشِ روزگار کی تگ ودو کی خاطر اتنی دور جانے تو نہ دیتا لیکن اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مجھے بھی تمہاری یہ آرزو پوری کر کے مسرّت ہوگی خدا تمہارا ہر حال میں حامی وناصر ہو۔

سیٹھ اجمل کی مدد وتعاون سے اکرم کراچی پہنچ گیا۔ جہاں ایک پرکشش ملازمت اس کی منتظر تھی۔ وہ جونیئر آفیسر بن گیا تنخواہ معقول تھی اور چونکہ وہ ایک حساس اور احسان مند لڑکا تھا لہٰذا اپنی ساری توجہ اپنے اہم مشن پہ وقف کردی تھی۔ اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کو تو وہ پہلے ہی اپنے پاس لے آیا تھا۔ اب تو اس نے سیٹھ اجمل کی پائی پائی بھی ادا کردی تھی اس طرح وہ اپنے ہنگامی فرائض سے سبکدوش ہوچکا تھا۔

اس کی شبانہ روز محنت وجستجو ضائع نہ گئی تاریکیوں کے لمحات ہمیشہ کے لئے ٹل گئے تھے نیا سویرا اس کا استقبال کر رہا تھا۔ ترقی پر ترقی، کامیابی در کامیابی اس کے قدم چُوم رہی تھی۔ شاید یہ خوشیاں اس آزمائش میں پورا اترنے کا صلہ تھیں جو اس پر گذر چکی تھی اب اکرم کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی کوٹھی کار، ٹیلی فون، نوکر چاکر غرض یہ کہ دنیا کی تمام آسائشیں اسے میتسر تھیں۔

حالات اور وقت کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ یہ ہر وقت بلکہ ہر گھڑی بدلتے رہتے ہیں اکرم کے مغربی پاکستان جانے کے ٹھیک پانچ سال بعد پاکستان کی تاریخ کا بدترین دور شروع ہوگیا۔ بدقسمتیاں مشرقی بازو کا مقدر بن گئیں۔ مشرقی پاکستان میں شرپسند عناصر نے گڑبڑ پھیلانا شروع کردی دشمن کی چال چل گئی ملک دشمن عناصر شیر ہو گئے۔ فسادات زور پکڑ گئے بھائی سے بھائی کو لڑادیا گیا۔ جغرافیائی سرحدوں کا دفاع تو جیسے تیسے ممکن تھا لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی۔ نظریاتی فصیل کی بنیادیں کھوکھلی ہوچکی تھیں لڑائی عُروج پر پہنچی آخر کار وہ بدبختی کی وحشناک گھڑی بھی آگئی جس کا تصوّر بھی پاکستان کے محب وطن افراد برداشت نہ کرسکتے تھے۔ غدار اپنا داؤ چلا چکے تھے۔ نوے ہزار جیالے پاکستانی سپاہیوں کو نہ معلوم وجوہات کی بنا پر ہتھیار ڈال دینے کا حکم دے کر دشمن کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا۔

چونکہ سیٹھ اجمل بھی متحدہ پاکستان کے حامیوں میں سے تھے۔ وہ وطن عزیز پر آنچ آتے نہ دیکھ سکتے تھے وہ پاکستان کے خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کرتے تھے لہذا ملک دشمنوں نے ان سے بھی نمٹنے کا فیصلہ کیا ان کا محاسبہ شروع کر دیا گیا۔ فیکٹریوں کو آگ لگا دی گئی وہ تجوری جس کے دہانے غریب غرباء کے لیے ہمیشہ سے کھلے تھے لوٹ مار کا نشانہ بن گئی۔

قدرت انہیں ان کے نجانے کون سے گناہوں کی سزا دے رہی تھی۔ یا شاید ان کی قوت و برداشت کا امتحان لیا جا رہا تھا۔ کل کا لکھ پتی آج "گدائے بے نوا" بن چکا تھا۔ گھر تو لٹ ہی چکا تھا۔ ظالموں نے بیوی اور بچوں کو بھی اپنے مذموم عزائم کا نشانہ بنا لیا۔ انہیں انتہائی سفاکی سے مکتی باہنی کے خونخوار درندوں نے ذبح کر ڈالا تھا۔

ہر انسان کو اپنی جان ہر حال میں پیاری ہوتی ہے۔ سیٹھ صاحب زمانے کی ٹھوکریں کھاتے "بھوکے پیاسے" لٹے پٹے کسی نہ کسی طرح مغربی پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

سرزمین پاکستان ان کے لیے ماں تھی اس کی خاطر انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کی طرح قیام پاکستان کی خاطر بھی دکھوں کی مالا ہنس کر گلے میں ڈال لی تھی۔ سو انہیں حالیہ قربانی بھی کچھ زیادہ ناگوار نہیں گذری۔ وہ آزاد پاکستان، مضبوط پاکستان اور خوشحال پاکستان دیکھنے کے متمنی تھے۔ خواہ یہاں انہیں کیسی بھی زندگی کیوں نہ بسر کرنا پڑے۔

کراچی میں وہ بالکل نووارد تھے کسی سے کوئی آشنائی نہ تھی کوئی جاننے والا نہ تھا۔ خدا کے سوا سہارا نہ تھا افسوس کے ان کے پاس اکرم کا پتہ بھی موجود نہ تھا کہ اس سے رحم کی درخواست کر دیتے۔ تین روز سے بھوکے ہونے کے باوجود انہوں نے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ملک کے مشرقی بازو پر بُرا وقت آتے ہی اکرم کے دِل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لینے لگے تھے اسے سیٹھ صاحب کی فکر دامن گیر تھی وہ سیٹھ صاحب کے جذبۂ حب الوطنی سے بھی بخوبی آگاہ تھا اور وہاں برسر پیکار ملک دشمن عناصر کی بدنیتوں اور ریشہ دوانیوں سے بھی واقف تھا۔ اس نے سیٹھ اجمل کا کھوج لگانے کی ہر تدبیر کر دیکھی تھی اب وہ مہاجرین کے کیمپوں کا صبح و شام طواف کرتا رہتا تھا۔ شاید کہ اس طرح اس کا محسن اس سے آملے اور وہ ان کی خدمت کر سکے۔

آج بھی اکرم سویرے ہی اُٹھ گیا تھا ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی ڈرائیور سے کار نکلوائی اور بندرگاہ کی راہ پر ڈال دی۔ اچانک ڈرائیور نے ہنگامی بریک لگا کر گاڑی روک لی۔ کیونکہ سڑک پار کرنے والا نامعلوم

ضعیف العمر شخص گاڑی کی زد میں آتے آتے بچا تھا۔

ڈرائیور نے گاڑی موڑی بوڑھے کو بچا کر نکلا ہی چاہتا تھا کہ اکرم نے اسی لمحہ گاڑی روک لینے کو کہا۔ اس کی نگاہ دھوکہ نہیں کھا رہی تھی۔ اس نے لپک کر دروازہ کھولا اور اپنے عظیم محسن کو پہچان چکا تھا۔ تیزی سے کار سے باہر کود پڑا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر ڈرائیور ہکا بکا رہ گیا۔ اکرم سیٹھ صاحب کا حلیہ اس طویل عذاب سے نبرد آزما ہونے کے بعد کلیتاً بھول چکا تھا۔ وہ سیٹھ یا رئیس کا حلیہ نہیں بلکہ فقیر و گداگر نظر آرہے تھے اکرم ان کی یہ حالت بھلا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ تڑپ کر رہ گیا۔ پیمانہ لبریز ہو چکا تھا آنسو ضبط نہ ہو سکے بل کھا کر یوں بہے جیسے بند توڑ دیا گیا ہو اور وہ بے اختیار سیٹھ اجمل کے قدموں پر گر گیا۔

اسی اثنا میں سیٹھ صاحب بھی اسے پہچان چکے تھے انہوں نے اکرم کو بڑھ کر اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ اور سینے سے لگا لیا۔ یہ چند لمحات اس قدر جذبات سے مغلوب رہے کہ فریقین میں سے کسی نے بھی اپنی زبان سے ایک لفظ تک نہ کہا اور سب کچھ کہہ سن لیا۔

"صاحب اب گھر چلیں" ڈرائیور کے اس استفسار پر دونوں ہی خیالوں کی دنیا سے لوٹ آئے۔ اکرم نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا "لو میں بھی کیا پاگل ہوں آپ کو بیٹھنے تک کا نہ کہا" اور فوراً ہی دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

گھر آکر سیٹھ صاحب نے اپنی طویل داستان چھیڑ دی، اکرم کی والدہ نے انہیں نہا دھو کر تازہ دم ہو لینے کا مشورہ دیا۔ اکرم کو سیٹھ اجمل جیسے محسن اور اس کے اہل خانہ پر گزری ہوئی قیامت کا سن کر بہت دکھ پہنچا۔

سیٹھ صاحب کو یہاں پہنچ کر بڑی حد تک سکون مل چکا تھا ہر چند کہ گذشتہ چند مہینوں کی سختیاں ہر گز ایسی نہ تھیں کہ انہیں فراموش کر دیا جاتا لیکن تقدیر نے ان سے ایک گھر جیسی جنت چھین کر دوسری عطا فرما دی تھی۔ اکرم ہی نہیں گھر کا ہر فرد انہیں کسی طور بھی اجنبیت کا احساس تک نہ ہونے دیتا تھا۔

چند ماہ بعد سیٹھ صاحب کافی حد تک سنبھل چکے تھے۔ اب وہ خود کو خود کفالت کا اہل پاتے تھے لہٰذا ملازمت تلاش کرنے لگے جب ان کے اس خیال کی خبر اکرم کو ہوئی تو وہ ششدر رہ گیا۔ فوراً ان کے پاس پہنچا، پوچھا میرے محسن! مجھ سے آپ کو کیا گلا ہے کیا میں آپ کا بیٹا نہیں کیا مجھ پر آپ کا کوئی حق نہیں رہا۔ سیٹھ صاحب گویا ہوئے نہیں بیٹے! مجھے یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں یہ تو اصول دنیاداری ہے۔ مجھے بھی معاشرے کے ان اصولوں کا احترام کرنا چاہئے' اکرم چیخا لیکن یہ اصول معاشرت اس وقت کہاں تھے۔ جب آپ میرے کفیل تھے' سیٹھ صاحب نے مسکرا کر کہا"

وہ میرا فرض تھا۔ اکرم بولا تو یہ بھی میرا فرض ہے کہ آپ کی تاحیات خدمت کروں۔ آپ بے کار نہیں رہ سکتے تو ضرور کام کیجئے لیکن ملازمت نہیں بلکہ ہماری سرپرستی ہمیں یہ احساس جیسے ڈھاکہ میں آپ نے نہیں ہونے دیا کہ ہم یتیم ہیں اب بھی وہ مرہم مداوا ہمارے زخمی جذبات پر رکھ دیجئے" اکرم اپنی بحث جیت چکا تھا۔ سیٹھ صاحب ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ اب بھی اکرم اور اس کے بہن بھائی انہیں ایک مشفق باپ کا نعم البدل گردانتے ہیں۔ ان کی خدمت کو اپنی زندگی کا ایک اہم فرض گردانتے ہیں۔

بلاشبہ یہ سب کچھ سیٹھ صاحب کی ان سابقہ نیکیوں کا نتیجہ تھا جو وہ اپنی نیک فطرت کے تحت بے غرضانہ کر چکے تھے۔

بحرالکاہل

دنیا کا سب سے بڑا سمندر ہے جو مجموعی طور پر زمین کے ۱۶۵ ملین مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی گہرائی ۱۱ ہزار میٹر (۳۶،۰۰۰ فٹ) ہے۔ اسی سمندر کی تہہ میں نیوزی لینڈ اور ساموآ کے درمیان دنیا کا دوسرا بلند ترین پہاڑ بھی واقع ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی سطح سمندر سے ۳۶۵ میٹر (۱،۱۹۷ فٹ) نیچے ہے۔

پُل کی چوری

آپ نے بہت سی چوریوں کے واقعات پڑھے اور سُنے ہوں گے، لیکن کسی پُل کو چُرانے کا واقعہ آپ کے لیے یقیناً نیا ہو گا۔ دسمبر ۱۹۷۴ء میں بیونس آئرس (ارجنٹائن) میں چوروں کے ایک گروہ نے، جس میں ماہر ٹیکنیکل تجربہ کار افراد شامل تھے، ایک پورے کا پورا پُل چوری کر لیا۔ یہ پُل دریائے سان انٹونیو پر بنایا گیا تھا۔ بعد میں پُل کے حصّے کاٹ کر اسکریپ دھات کے طور پر فروخت کر دیے گئے۔

نام سے ٹیکس

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ (۱۱۳۸ء تا ۱۱۹۳ء) نے عیسائیوں سے بہت سی صلیبی جنگیں لڑیں اور ۴ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو بیت المقدّس کو عیسائیوں سے آزاد کرا لیا۔ عیسائی ۹۰ سال سے مسلمانوں کے قبلۂ اوّل پر قابض تھے۔ یورپ کے عیسائی بادشاہوں نے ان کے ساتھ جنگ میں مقابلہ کرنے کا انتظام اس طرح کیا تھا کہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے نام سے یورپ کی رعایا پر باقاعدہ ٹیکس عائد کر دیا تھا اور اس طرح جنگی ساز و سامان کے لیے رقم حاصل کی جاتی تھی۔ یوں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ دنیا کے وہ واحد شخص ہیں، جن کے نام سے باقاعدہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔

انعام یافتہ کہانی

اسماء ہارون

گولے گنڈے والا

اور ، رمجو کی بھی بھلا عمر ہی کیا تھی .....؟ یہی کوئی دس گیارہ برس کا بچّہ تھا۔ یہ تو اس کے کھیلنے اور پڑھنے لکھنے کے دِن تھے ..... لیکن اس کے ابّو ، منی بس کی تیز رفتاری کے باعث ایک حادثے میں انتقال کر چکے تھے ! قاتل ڈرائیور کو مستعد پولیس ابھی تک گرفتار نہیں کر پائی تھی ..... اپنے گھر کا اکلوتا بچّہ ہونے کی وجہ سے گھریلو ذمے داریوں کا بوجھ اس کے نازک کندھوں پر آن پڑا تھا ! اُس کی عمر رسیدہ ماں ، جُوں توُں گھر کا کھانا پکا لیتی تھی۔ اور یہ بھی بہت بڑی بات تھی !

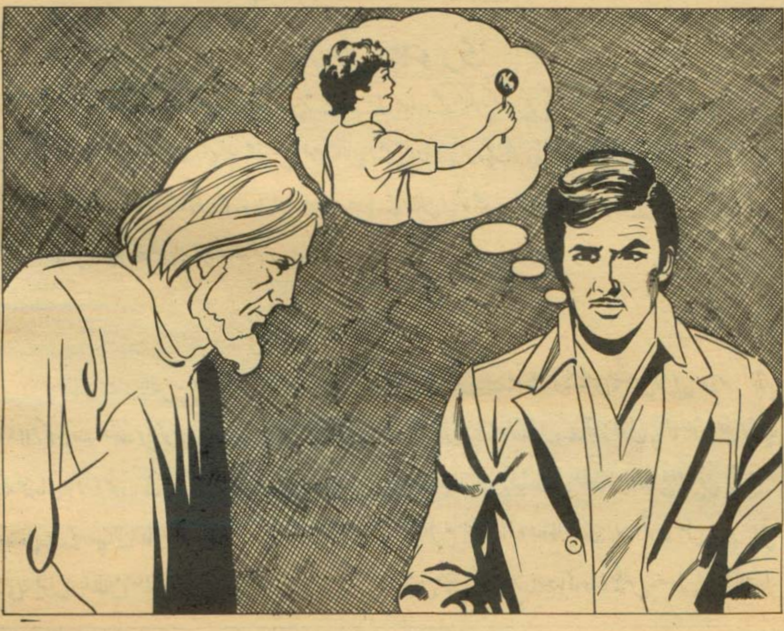

رجّوُ کے خریدار، ننھے منّے، چھوٹے بڑے بچّے بچیاں، اپنی پیاری پیاری آوازوں میں، دل لُبھانیوالا شور مچارہے تھے۔ رجّوُ کے پھرتیلے ہاتھ اپنے روائتی انداز اور رفتار سے چل رہے تھے، گولے گنڈے بنتے جارہے تھے۔ اور باری باری سے "خریدار" فارغ ہوتے جارہے تھے! "بیٹا محمد رمضان!" ایک مدھم میٹھی سی آواز نے رجّوُ کو محبت سے پکارا! رجّوُ اپنے "کام" سے فارغ ہوکر، رنگ برنگی شیشیاں اور بوتلیں ترتیب سے رکھنے ہی پایا تھا کہ پکار کی مٹھاس نے اُسے اپنی طرف متوجہ کرلیا!۔

"جی۔۔۔! کتنے والا گولا گنڈا بناؤں؟۔۔۔۔ رجّوُ اگرچہ پڑھا لکھا بچّہ نہیں تھا لیکن بات کرنے کا ڈھنگ بخوبی جانتا تھا!

"نہیں، بیٹا! مجھے گولا گنڈا نہیں چاہیئے۔۔۔ تم سے ایک بات کرنی ہے"

"جی۔۔۔۔!؟"

"بیٹا! تم کچھ پڑھ لکھ لو! گنڈے گولے تو بعد میں بھی بیچے جاسکتے ہیں۔"

"جی، میرا باپ زندہ۔۔۔۔۔۔"

"جی۔۔۔۔ گھر کا خرچہ۔۔۔۔"

"اس کا بھی انتظام ہوجائے گا، بیٹے! اللہ تعالیٰ سب انتظام پیدا کردے گا"

تم پڑھنے کی نیّت تو کرو۔۔۔۔۔۔ میں پھر کہتا ہوں کہ تم کچھ تعلیم حاصل کرلو'۔"

"آئندہ چل کر تم بہت سُکھی رہوگے۔"

"مجھے کون پڑھائے گا، جی!" رجّوُ کے اندر کا بھول پن بے ساختہ بول اُٹھا!

"اللہ نے چاہا تو میں پڑھاؤں گا تمہیں!"

"جی۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔ ٹھیک ہے، آپ عبدل کے اَبّو ہیں نا! اچھا، میں کل سے آجاؤں پڑھنے؟"

"ہاں۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔ میں کل صبح، انشاء اللہ تمہارے گھر پہنچوں گا۔"

اور یُوں، "رجّوُ" اسکول میں تعلیم پانے لگا۔ اب، اُس کے گولے گنڈے والے "کاروبار" کے اوقات تبدیل ہو گئے تھے۔ صبح کی شفٹ میں وہ اسکول جاتا اور دوپہر ڈھلتے ہی، وہ اپنے ٹھیے پر پہنچ جاتا! یونہی دِن گزرتے چلے گئے۔۔۔ دن ہفتوں، مہینوں اور، مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔

ایک دِن، شام کو مغرب سے ذرا کچھ پہلے، عبدل کے گھر کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے اس کے والد، شیخ محمد مٹھا۔ اپنے تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف تھے، کہ ایک گبھرو جوان نے مودبانہ سلام کیا۔ سلام کا جواب

دیتے ہوئے، نوجوان کو اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہا... سر! آپ نے مجھے پہچانا؟"...... بزرگی ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے لگی...... نوجوان بے تابانہ نگاہوں سے شیخ صاحب کو جھانکے جا رہا تھا۔

"سر!..... جی، میں رجو ہوں...... آپ کا محمد رمضان!" بزرگ شیخ صاحب محبت بھری نگاہ سے اُسے دیکھ رہے تھے، شاید کچھ کچھ پہچان سے گئے تھے۔

"اَچھا..... اچھا! بیٹا! کہو، کیسے آنا ہوا؟"

"سر! اسلام کے لیے خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا۔ بہت بے چینی سی پا رہا تھا میں آپ سے ملنے کے لیے.... آپ ہی تو میرے سچے محسن ہیں، سر! آپ ہی نے مجھے پڑھنے کی ترغیب دی تھی۔ آج اللہ کے فضل و کرم سے میں بی اے پاس ہوں اور ایک مقامی بینک میں ملازم ہوں!" ماضی کے رجو اور حال کے محمد رمضان بی اے نے، پوری کتھا ایک ہی سانس میں سنا ڈالی، اور پھر محمد رمضان کے ساتھ اس کے شفیق و محترم محسن کی آنکھوں میں بھی دمکتے ستاروں جیسے آنسو جھلملانے لگے...... موتیوں جیسے قیمتی آنسو...... بے پایاں مسرت کے آنسو..... اور دوسرے ہی لمحے بوڑھے کی پدرانہ آغوش نے نوجوان رجو کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔

"برف کے گولے گنڈے والا!"۔ اور پھر ٹن ٹن..... ٹن ٹن.....، کی مانوس صدا چند سیکنڈ وں تک فضا میں گونجنے لگتی۔ گلی، کوچے میں کھیلتے بچے بالے، اور آس پاس کے گھروں سے چھوٹے بچے بچیاں حسبِ مقدور تیزی سے لپکتے ہوئے گنڈے گولے والے رجو کے اردگرد جمع ہو جاتے۔ "رجو بھائی! پہلے مجھے دے دو۔" "نہیں! پہلے میں...... لو، گا رجو!"...... "اوئے پیچھے ہٹو! دیکھتے نہیں ہو، میں بھی کھڑا ہوں.... "رجو بھیا! سب سے پہلے مجھے دینا، اچھ..... چھا آ!" اور رجو، پھرتی سے رنگ برنگے گولے گنڈے بنانے میں مشغول ہو جاتا، ایک عجیب اور آنکھوں کو بھانے والی رونق سی لگ جاتی تھی اس کے آس پاس!

آنکھ مچولی کے پرانے شمارے کیسے منگائیں؟

ہمیں بے شمار بچوں کے ایسے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن میں انہوں نے "آنکھ مچولی" کے پرانے شمارے بھیجنے کی فرمائش کی ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی "آنکھ مچولی" کی البم مکمل کر سکیں۔

جو ساتھی پرانے شمارے منگانا چاہتے ہیں وہ فی شمارہ ۵ روپے اور سالنامہ و خاص نمبر ۱۰ روپے کی شرح سے ماہنامہ "آنکھ مچولی" کے پتہ پر منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر روانہ کر دیں۔ انہیں مطلوبہ شمارے فوراً روانہ کر دیئے جائیں گے۔

نئی تحریریں

بھن بھن نگری

ثوبیہ ناز کراچی

"بٹیا ذرا یہاں آنا۔"

"جی امی آئی" ہم نے زور سے کہا۔

"یہ ذرا دھلے ہوئے کپڑے ہیں ان پر میں نے استری کردی ہے۔ انہیں ذرا صحیح طریقے سے الماری میں رکھ دو اور کمروں میں اسپرے بھی کردو۔ کم بخت مچھروں کی بہتات ہوگئی ہے۔"

"جی اچھا......" ہم نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے فرمانبرداری سے کہا۔ کیونکہ یہ دوسرا کام ہمارا بہت پسندیدہ تھا۔ ہم نے جلدی سے کپڑے لئے اور الماری میں رکھ کر فلٹ پمپ ایسے تھام لیا جیسے آج کل نوجوان کلاشنکوف تھامے ہوتے ہیں اور کمرے میں ایسے داخل ہوئے جیسے سپہ سالار میدان جنگ میں داخل ہوتا ہے اور پہلا اسپرے ہم نے ایسا نشانہ باندھ کر کیا جیسے دشمن کو گولی ماری جاتی ہو۔ آن کی آن میں چار مچھر ایسے گرے جیسے دشمن کے چار سپاہی گر گئے ہوں۔

"ونڈرفل!...... سب کچھ ہماری توقع کے مطابق ہو رہا تھا۔

"ارے ارے یہ کیا کررہی ہو"

"ہائیں یہ کون بولا" ہم نے گرج کر کہا۔

"اوہ تو یہ تم بول رہے ہو!" ہم نے کونے میں بیٹھے ہوئے مچھر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیوں بولے تم۔ جب دو دشمنوں میں جنگ ہو رہی ہو تو بیچ میں نہیں بولتے!" وہ بھی کم نہیں تھا۔ بولا "تم چاہے کچھ بھی کہو مگر میں تمہیں روزانہ دیکھتا ہوں کبھی چھپکلی کے پیچھے جھاڑو، چپل لے کر بھاگتی ہو کبھی مکھیوں کو مارتی ہو تو کبھی تمہارے ہاتھ میں چوہا ماردوائی ہوتی ہے۔ ان مکڑیوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم ان کے پیچھے پڑجاتی ہو اور ان کے جالے توڑ دیتی ہو اور روزانہ اندھیرا ہوتے ہی تم ہم بیچاروں کے پیچھے پڑجاتی ہو۔"

"آہا اب سب بیچارے ہوگئے ہو"۔ ہم نے چیخ کر کہا۔ "کم از کم میں تو تم مچھروں کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں کرسکتی۔ اتنی مشکل سے آج کل جسم میں خون بنتا اور تم نامراد ایسے مزے سے چوس لیتے ہو جیسے مزیدار مشروب کی چسکی لیتے ہیں۔"

وہ بولا "اور کیا کریں جس طرح مرغیوں اور بکریوں کو کھانا دیا جاتا ہے اس طرح ہمیں بھی دے دیا کرو۔ پھر

ہم خون نہیں چوسیں گے"۔
" ہاں جیسے تم تو ہمیں دودھ اور انڈے دوگے، ہیں نا"
ہم نے جل کر کہا۔ ہماری اس بات پر مچھر کے دانت نکل پڑے۔ پھر بولا:۔
" اور ہاں ایک بات سنو ذرا اچھی غذا کھایا کرو تمہارا خون بہت اچھا نہیں ہوتا ہے اور ...."
" بس بس آگے نہیں بولنا"۔ ہمیں گھن آنے لگی۔ دل تو بہت چاہا کہ اسے بڑھ کر مسل دیں۔ مگر ہمیں اس سے بات چیت میں مزہ آرہا تھا۔ اس لئے اپنا ارادہ بدل دیا اور ذرا نرم لہجے میں بات شروع کی۔
" ہاں میاں مچھر۔ تمہارے ماں باپ نے تمہارا کوئی نام تو رکھا ہوگا؟"
" میرا نام چیچا ہے "۔ مچھر نے جواب دیا۔
"چیچا وطنی ہی رکھ لیتے"..... ہم نے دل میں سوچا
" اچھا یہ بتایئے کہ آپ کہاں کی پیداوار ہیں"۔
" بھئی یہیں کے ہیں"۔
" بھئی صاف صاف بات کریں۔ آپ کہاں پیدا ہوئے؟"
" اس شہر میں اتنی تعداد میں نالیاں، مین ہول۔ گڑھے وغیرہ کھلے ہوتے ہیں۔ اور کئی جگہ کی پائپ لائن پھٹی ہوتی ہے، ہم لوگ وہاں پیدا ہوتے ہیں اور وہیں پلتے بڑھتے ہیں"، چیچا کے اس جواب سے ہم کچھ شرمندہ سے ہوگئے۔
" اور ہاں" اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ۔

گھروں کے آس پاس بھی گندگی کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم ادھر آجاتے ہیں"۔
" اچھا اپنے پورے دن کا شیڈول تو بتاؤ" ہم نے پوچھا۔
" بھئی صبح اُٹھتے ہیں اور اپنے گھروں سے نکل کر تمہارے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ اگر گھر ہمارے لئے نیا ہو تو پورے گھر کا پہلے دورہ کرتے ہیں۔ ورنہ کہیں پردے کے پیچھے یا میز کے نیچے بیٹھ جاتے ہیں"..... وہ سانس لینے کے لئے رُکا۔
"دن بھر بھوکے پیاسے رہنے کے باوجود رات کو حرکت میں آجاتے ہیں اور تم لوگوں پر حملہ کرتے ہیں، ویسے مجھے اس وقت بڑا مزہ آتا ہے جب تم لوگ اپنے جسم پر کسی مچھر کو دیکھ کر جب اُسے مارتے ہو اور اگر نشانہ خطا ہو جائے اور اُلٹا تمہیں چوٹ لگ جائے میں اس لمحے کو بہت خوش ہوتا ہوں"۔ یہ سُن کر ہمارا خون کھول اُٹھا۔
اتنے میں وہ بولے" لو آگئی بھن بھن نگری۔ ایک گڑھے کو دیکھ کر جب ہم نے اندر جھانکا تو دیکھا کہ مچھروں کا غول اس میں موجود ہے۔
مسٹر مچھر نے ہماری ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہماری ایک نگری ہے "بھن بھن نگری" خیر آؤ اس کی سیر کرائیں وہ اندر جاتے ہوئے بولے "اوہ مگر تم کیسے اندر جاؤگی"۔ "اب وہ واپس آکر بیٹھ گئے" اچھا چلو یہیں سے سیر کرلو۔ وہ جو تمہیں دُبلے پتلے چھ مچھر ایک ساتھ کھڑے نظر آرہے ہیں ناں وہ آج کی نوجوان نسل ہے"۔

" ارے کہیں آپ کا تعلق بھی تو اس نسل سے نہیں ہے" ہم نے پوچھا۔
" ارے نہیں میں تو بوڑھا ہوگیا ہوں۔ اس لئے اتنا دبلا پتلا ہوں۔ اور وہ جو مٹی کے گھر نظر آرہے ہیں ناں بھئی وہ بائیں جانب "۔
" اچھا اچھا وہ مٹی کے ٹکڑے" ہم نے جھانکتے ہوئے کہا۔ گھر ہیں اور وہ جو کونے کے ساتھ والا گھر ہے وہ میرا ہے ہمارے گھروں میں سب سے اچھی چیز یہ ہے کہ ان میں کچن کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کھانا ریڈی میڈ باہر سے ملتا ہے"۔
مسٹر چیچا نے مختصراً بات کہی۔

ہاں تمہیں تو وہ مٹی کے ٹکڑے لگیں گے۔ وہی ہمارے
" اچھا وہ کیا ہے"؟ ہم نے ایک طرف اشارہ کیا۔
" وہ چھوٹے بچوں کا پلے گراؤنڈ ہے وہاں بچے ریس لگا رہے ہیں۔ اُن میں وہ بچہ جو سب سے پیچھے ہے وہ میرا پوتا ہے۔ وہ بھی ہار کے بعد ہی جیت ہوتی ہے" انہوں نے اپنی شرمندگی مٹاتے ہوئے کہا۔ ویسے اس میں اُن کا کیا قصور۔
"ارے دیکھو میرا پوتا آگے بھاگ رہا ہے ارے کتنا تیز بھاگ رہا ہے واہ بھئی واہ ...."
" سنیئے وہ کیا" ہم نے اُن کا دھیان بٹایا "وہ بھی بچے ہیں اور وڈیو گیم کھیل رہے ہیں اور وہ جو لائن سے کرسیاں لگی ہوئی ہیں ناں وہ کسی جلسے کی تیاری ہو رہی ہے دیکھو کافی کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ اور جو مچھریاں اُڑ رہے ہیں ناں یہ اس جلسے میں آنے والے سیاسی لیڈروں کی حفاظت کریں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے تمہارے ہیلی کاپٹر کرتے ہیں"۔
ہم نے کہا" ابھی تک جلسہ شروع نہیں ہوا"
" ہاں وقت کی اہمیت کا اندازہ نہ انسان کو ہے نہ مچھر کو"
" اُف یہ دوسرا طنز" ہم نے سوچا مگر یہ طنز بھی صحیح تھا۔ ہمیں حق بات کہنے والے پسند ہیں۔
اُب کافی وقت ہوگیا ہے"۔ ہم بولے کیونکہ ہمیں بھی وقت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔
" ہاں آنٹی پریشان ہو رہی ہوں گی"۔
ہمیں لفظ "آنٹی" پر ہنسی آگئی۔
" اچھا چلو"۔ وہ بولے۔
" ذرا یہ تو بتائیں کہ آپ نے اس شہر کا نام بھن بھن نگری کیوں رکھا ہے ؟" ہم نے پوچھ ہی لیا۔ ہائیں وہ تو غائب ہوگئے بالکل ایسے۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہو جاتے ہیں۔
اتنے میں ہمارے کان میں بڑی زور سے کسی مچھر نے اپنی سریلی آواز میں بھنبھنا ہٹ شروع کردی۔
" کیا سمجھیں" وہ سامنے آتے ہوئے بولے تو ہمیں ہنسی آگئی اچھا تو یہ آپ تھے۔ ہاں اب سمجھی کہ بھن بھن کرنے کی وجہ سے آپ لوگوں نے اس نگری کا نام بھن بھن نگری رکھ دیا ہے"۔
" اچھا اب رات کو ملاقات ہوگی" چیچا دھمکی دیتے

ہوئے بولے اور اُڑ گئے اور ہم کیمپ سنبھال کر بچے کھچے مچھروں پر حملہ آور ہو گئے۔

چوری پکڑی گئی

کشور کمار ——— کراچی

آگرہ میں اناج کے دو بیوپاری رہتے تھے، جو گہرے دوست تھے۔ دونوں کا ایک ہی کاروبار تھا اس کے باوجود ان میں مقابلے بازی کا رُجحان نہیں تھا دونوں کے اپنے اپنے گاہک تھے اور کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا۔ اِن میں ایک دراز قد تھا اور ایک پستہ قد۔ ایک روز دراز قد، پستہ قد دوست کے پاس پہنچا اور اُس سے خاصی بڑی رقم اُدھار مانگی...

"مجھے چند خوبصورت زیورات پسند آگئے ہیں جو بہت سستے بک رہے ہیں، میں وہ اپنی بیوی کو تحفتاً دینا چاہتا ہوں۔ اس ماہ مکان کی مرمت میں بہت پیسہ خرچ ہو گیا اس لیے کچھ بچا نہیں۔"

پستہ قد دوست نے مطلوبہ رقم اس کو دے دی اور کہا "جا کر زیورات خرید لو، امید ہے وہ تمھاری بیوی کو پسند آئیں گے۔" پستہ قد تاجر نے شام کو دکان بند کرنے کے بعد گھر جا کر وہ بات اپنی بیوی کو بتائی تو وہ برہم ہو کر بولی "تم بہت احمق آدمی ہو اتنی بڑی رقم بغیر ضمانت کے تم نے اپنے دوست کے حوالے کر دی، نہ اس سے کوئی تحریر لکھوائی، اگر اس کی نیت میں فتور آگیا تو کیسے ثابت کرو گے کہ تم نے اتنی بڑی رقم اُسے دی تھی۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو" اس کے شوہر نے جواب دیا۔ "اگر میں برسوں کے جانے پہچانے شخص پر بھروسہ اور اعتماد نہ کر سکا تو پھر اور کسی پر کیا بھروسہ کر سکوں گا۔"

بیوی، شوہر کا یہ جواب سُن کر خاموش ہو گئی کئی مہینے بیت گئے، دراز قد تاجر رقم کی واپسی کا ذکر تک نہ کرتا، بلکہ جب بھی دونوں کی ملاقات ہوتی تو وہ پستہ قد کا دھیان بٹانے کے لیے اِدھر اُدھر کے فضول اور بے مقصد قصے چھیڑ دیتا کبھی موسم کی اور پھلوں کی باتیں کرتا اور کبھی اناج کے نرخوں اور بازار کے بھاؤ وغیرہ پر بحث شروع کر دیتا۔ مگر اُدھار لی ہوئی رقم کے بارے میں منہ سے ایک لفظ نہ نکالتا۔ پستہ قد تاجر جو نہایت مخلص اور با مروّت انسان تھا، اُس کے اِس رویّے سے کچھ پریشان تھا۔ ایک روز وہ اسی سوچ میں غرق بیٹھا تھا کہ اس کی بیوی نے کہا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تمھارے دوست کی نیت خراب ہو گئی ہے۔" پستہ قد تاجر کو بیوی کی اس بات پر یقین آگیا۔ ایک روز اُس نے دراز قد تاجر سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ دراز قد تاجر صاف مُکر گیا اور بولا "قرضہ... کیسا قرضہ؟" پستہ قد تاجر اس کا جواب سُن کر حیران رہ گیا اور اُس سے کہا میں اتنی بڑی رقم کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے پیسے تم سے ضرور وصول کروں گا۔"

دوسرے دن پستہ قد تاجر قاضی کے پاس گیا اور سارا واقعہ سُنایا۔ قاضی نے کہا "تمھارے پاس کوئی تحریری ثبوت یا گواہ نہیں ہے تو پھر کس طرح ثابت کرو گے کہ تم نے اتنی بڑی رقم اپنے دوست کو اُدھار دی تھی۔" یہ سُن کر پستہ قد تاجر مایوس ہو کر چلا گیا۔

اگلے روز قاضی نے دونوں تاجروں کو طلب کیا اور اُن

سے کہا" میرے پاس گندم کی بہت سی بوریاں ہیں جن کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ گندم مجھے کچھ کسانوں نے تحفے میں دے دی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں آدھی آدھی گندم لے لو اور اسے بیچ کر رقم مجھے لا دو۔ میں تم دونوں کو اس رقم میں سے مناسب منافع دوں گا۔" دونوں تاجروں نے تین چار دن میں ساری گندم فروخت کر دی۔ بوریاں خالی ہوئیں تو انھیں ہر بوری میں سے سونے کی ایک ایک اشرفی ملی۔ پستہ قد تاجر اُن اشرفیوں کو لے کر قاضی کے پاس پہنچ گیا، لیکن دراز قد تاجر نے اپنے حصّے میں آئی ہوئی اشرفیاں دبا لیں۔ دو دن بعد دونوں تاجر فروخت شدہ گندم کی قیمت لے کر قاضی کے پاس پہنچ گئے۔

"تمھیں بوریوں میں سے کچھ نہیں ملا؟"

قاضی نے دراز قد تاجر سے پوچھا۔ "نہیں جناب!"

دراز قد تاجر نے معصومانہ لہجے میں جواب دیا۔ قاضی نے ملازم کو اشارہ کر کے بلایا اور اُس کے کان میں کہا "جلدی سے دراز قد تاجر کے گھر جاؤ اور اس کے بیٹے کو رقم کی اُس صندوقچی کے ساتھ لے آؤ جو ان کے گھر میں ہے۔ لڑکے سے کہنا کہ یہ قاضی کا حکم ہے۔"

ملازم کچھ دیر بعد تاجر کے لڑکے کو لے کر آ گیا۔ قاضی نے لڑکے کو صندوقچی کھولنے کا حکم دیا۔ صندوقچی کھولی گئی تو اس میں اشرفیاں بھری ہوئی تھیں۔

"یہ اشرفیاں تمھارے پاس کہاں سے آئیں؟" قاضی نے پوچھا۔ "یہ اشرفیاں میرے ابّو کو گندم کی بوریوں میں سے ملی تھیں۔"

"تم نے یہ اشرفیاں واپس کیوں نہیں کیں؟" قاضی نے دراز قد تاجر سے مخاطب ہو کر کہا۔ دراز قد تاجر بہت شرمندہ ہوا اور قاضی سے معافی مانگی۔ قاضی نے اُسے اپنے تاجر دوست سے قرض لی ہوئی رقم واپس کرنے کا حکم دیا اور کہا "میں نے جان بوجھ کر یہ اشرفیاں تمھاری نیت کا امتحان لینے کے لیے بوریوں میں رکھ دی تھیں۔ جو شخص چند اشرفیوں کے لیے بے ایمان ہو سکتا ہے، وہ پانچ سو اشرفیوں کی خاطر بھی بددیانتی کا مُرتکب ہو سکتا ہے۔"

صائمہ اور ڈاکو

محمّد سعید عباس ملیر کالونی کراچی

صائمہ اور ارم اُچھلتی کودتی اپنے گھر جا رہی تھیں۔ دونوں پانچویں جماعت میں پڑھتی تھیں۔ صائمہ، ارم کے پڑوس میں رہتی تھی۔ دونوں سہیلیوں میں پکّی دوستی تھی۔ "ارم ایک گھنٹے بعد تم میرے گھر آ جانا اپنی کاپیاں اور کتابیں لے کر۔ مس الماس نے جو ہوم ورک دیا تھا، وہ دونوں مل کر کریں گے۔" صائمہ بولی۔

"ٹھیک ہے میں آ جاؤں گی۔" ارم نے کہا اور دونوں اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیں۔

صائمہ کی دستک سُن کر اُس کی امّی نے تھوڑا سا دروازہ کھولا، پھر صائمہ کو دیکھ کر پورا دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے امّی! آپ نے دروازہ کھولنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا؟"

"ہاں بیٹا ابھی ریڈیو پر اعلان ہُوا ہے کہ ایک ڈاکو جیل سے فرار ہو گیا ہے۔ وہ اسی کالونی کی جانب آیا ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔"

"ارے امّی کچھ نہیں ہوتا آپ تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہیں۔"

صائمہ نے کہا اور اپنے کمرے کی جانب چل دی۔

اِرم کے امّی ابّو کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے۔ اِرم کے امتحانات ہونے والے تھے اس لیے وہ اُسے اُس کے داداجان کے پاس ہی چھوڑ گئے تھے اِرم گھر کے دروازے پر پہنچ کر دستک دینے ہی والی تھی کہ اچانک اُس کی نظر دروازے پر پڑی جو تھوڑا سا کھُلا ہوا تھا" ارے کیا داداجان دروازہ بند کرنا بھُول گئے ہیں ؟" اِرم نے سوچا اور اندر داخل ہوگئی، اُس کے اندر داخل ہوتے ہی کسی نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کوئی ٹھنڈی سی چیز اُس کی گردن سے آلگی اُسے ایک سرگوشی سُنائی دی" خبردار جو تم نے شور مچایا ورنہ تمھاری گردن کاٹ دُوں گا" پھر وہ ہاتھ اُس کے مُنہ سے ہٹ گیا۔ اِرم نے مُڑ کر دیکھا اُس کے سامنے ایک خوفناک آدمی ہاتھ میں خنجر لیے کھڑا تھا اُس کے ایک بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

صائمہ اپنے کمرے میں بیٹھی اِرم کا انتظار کر رہی تھی۔ "پتا نہیں، یہ اِرم ابھی تک کیوں نہیں آئی" صائمہ نے سوچا اور بستے سے اسکول کی کاپیاں نکالنے لگی "ارے یہ کیا" اس کی نظر اِرم کی کاپی پر پڑی جو اُس کی کاپیوں کے ساتھ بستے سے نکلی تھی" اوہ اِرم تو اپنی کاپی بھُول ہی گئی جو کہ ہاف ٹائم میں، مَیں نے اِرم سے لی تھی وہ بیچاری کاپی ڈھونڈ رہی ہوگی اُف اُس کی کاپی میرے پاس موجود ہے" صائمہ نے سوچا اور اِرم کو کاپی واپس کرنے اُس کے گھر چل دی امّی کے پوچھنے پر اُس نے بتا دیا کہ وہ اِرم کے گھر جا رہی ہے۔

"آپ کون ہیں ؟ داداجان کہاں ہیں ؟" اِرم نے ڈرتے ہوئے اُس آدمی سے پوچھا" زیادہ باتیں مت کرو تمھارے داداجان سامنے موجود ہیں" اُس آدمی نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے ہیبتناک لہجے میں کہا۔ اِرم کے داداجان ایک کُرسی سے بندھے ہوئے تھے۔ اِرم اپنے داداجان کی طرف بڑھی تو وہ آدمی بولا" خبردار ! جو تم نے انھیں کھولا" پھر وہ اپنا زخمی بازو پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے سے تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔

اِرم نے اُس آدمی سے کہا" مجھے پیاس لگ رہی ہے میں پانی پینا چاہتی ہوں"

"ٹھیک ہے، جاؤ سامنے فریج سے ایک بوتل نکال لاؤ اور جو کچھ کھانے پینے کی چیزیں ہوں وہ بھی نکال لانا"

"جی اچھا" اِرم نے کہا اور اُٹھ کر فریج کی طرف بڑھی اُسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ آدمی تیزی سے کھڑا ہوگیا۔ اور اِرم کے داداجان کے پاس پہنچ کر خنجر اُن کی گردن پر رکھ دیا اور بولا" دیکھو باہر کون آیا ہے اگر کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو اِس بڈھے کی گردن کاٹ دوں گا"

ارم نے دروازہ کھولا۔ سامنے صائمہ کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے ارم ! تم ضرور اپنی انگلش کی کاپی کے بارے میں پریشان ہوگی وہ میرے پاس ہے اور تم ابھی تک میرے پاس کیوں نہیں آئیں۔ پتا ہے، مَیں کب سے تمھارا انتظار کر رہی ہوں" صائمہ نے کہا۔

"صائمہ آج میں نہیں آسکتی میری طبیعت کچھ خراب ہے۔ تم اکیلے ہی ہوم ورک کر لو" اِرم نے جلدی سے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ صائمہ باہر کھڑی اِرم کے رویے پر حیران ہو رہی

تھی، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ ارم ہمیشہ صائمہ کو اپنے گھر میں لے جاتی تھی مگر آج تو اُس نے گھر کے اندر تک آنے کے لیے نہیں کہا، صائمہ سوچتی ہوئی اپنے گھر چل دی" اوہ، کہیں ارم کے گھر وہی جیل سے بھاگا ہوا قیدی تو نہیں گھس آیا؟" صائمہ کے دل میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا۔ یہ سوچتے ہی صائمہ فوراً ارم کے گھر کی عقبی جانب بڑھی وہاں ایک شیشے کی کھڑکی تھی جس کا شیشہ ایک کونے سے تھوڑا سا ٹوٹا ہُوا تھا صائمہ نے وہاں سے اندر جھانکا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی، جس نے قیدیوں والا لباس پہنا ہُوا ہے، ارم کے دادا جان کی گردن پر خنجر رکھے کھڑا ہے اور ارم سے کچھ کہہ رہا ہے۔

یہ دیکھتے ہی صائمہ تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنے گھر پہنچی اُس نے اپنے بھائی جان کو سب کچھ بتا دیا۔ اُس کے بھائی جان نے قریبی تھانے فون کر کے وہاں موجود انسپکٹر کو تمام حالات سے آگاہ کیا تھوڑی دیر میں پولیس پارٹی ارم کے گھر پہنچ چکی تھی۔ انسپکٹر نے صائمہ سے سارے حالات معلوم کیے اور پھر بولا: "بیٹی تمھیں کوئی ایسا راستہ معلوم ہے، جہاں سے ارم کے گھر میں داخل ہوا جا سکے۔ کیونکہ اگر ہم سامنے سے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے تو وہ قیدی ان کو نقصان پہنچا سکتا ہے"۔

"جی ہاں انسپکٹر صاحب ایک راستہ ہے۔ ارم کے گھر کے پچھلی جانب ایک روشن دان ہے جس میں سلاخیں نہیں ہیں۔ ہم کھیل کھیل میں اس روشن دان کے ذریعے بھی گھر میں جاتے رہتے ہیں"۔

"ویری گڈ"۔ انسپکٹر بولا۔ پھر اُس نے سپاہیوں کو بلایا سپاہیوں نے ارم کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا، انسپکٹر روشندان کے ذریعے گھر میں داخل ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ارم کے گھر کا دروازہ کھُلا اور انسپکٹر اس آدمی کو پکڑے گھر سے باہر آیا۔ انسپکٹر نے بتایا کہ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اُس نے اس آدمی پر قابو پا لیا تھا۔

صائمہ کی بہادری اور عقلمندی سے ارم اور اس کے دادا کی جان بچ گئی اور ایک خطرناک مجرم قانون کے شکنجے میں جکڑا گیا۔

پھُندنے والی ٹوپی

آثم میرزا، سیالکوٹ

ویسے تو ہمارے دادا جان بہت اچھے تھے ہم سب سے محبت کرتے تھے، مگر ہماری ایک بات ماننے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئے۔ ہم چاہتے تھے کہ دادا جان کالے پھُندنے والی سُرخ رنگ کی پرانی اور قدیم ترکی ٹوپی پہننا ترک کر دیں۔ مگر اُن کا کہنا تھا کہ یہ ٹوپی ان کی عزّت اور وقار ہے اور وہ کسی صورت اسے اپنے سے جُدا نہیں کر سکتے ہم انہیں سمجھاتے کہ دادا جان ہم آپ کے لئے بازار سے جدید تراش کی نئی نویلی چمکتی دمکتی ٹوپی لا دیتے ہیں، مگر دادا جان ہمارے اس مشورے کو فوراً ہی رد کر دیتے۔

ایک دن میرے کچھ دوست ملنے آئے۔ میں انہیں اپنے گھر کی سیر کرانے لگا۔ لان سے ہو کر ہم اندر پہنچے مختلف کمروں سے ہوتے ہوئے ہم دادا جان کے کمرے میں آئے تو وہ حسبِ معمول ٹوپی پہنے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میرے دوست انہیں عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔ اور پھر منہ دبا کر کھی کھی کرنے

لگے۔ دادا جان نے چونک کر ہمیں دیکھا:

"فرخ بیٹا ادھر آؤ۔ کیا یہ تمہارے دوست ہیں؟"

دادا جان نے مسکراتے ہوئے شفقت بھرے انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں دادا جان!" میں نے جواب دیا۔

"ان کی کیا خدمت کی ہے؟"

"ابھی تو گھر کی سیر کرا رہا ہوں!"

"پہلے انہیں کھلاؤ پلاؤ پھر سیر کراؤ۔ میرے کمرے کے فریج میں تازہ پھل پڑے ہوں گے۔" دادا جان بولے۔ مگر میرے ایک دوست نے اشارے سے منع کر دیا اور وہ سب باہر چلے گئے۔

"فرخ بیٹا یہ تمہارے دوست کیسے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں، بزرگوں کا ادب کیسے کیا جاتا ہے۔"

دادا جان ناراضگی سے بولے۔ میں ان کی بات کے جواب میں سر ہلاتا ہوا اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔ وہ سب مل کر دادا جان کی ٹوپی کا مذاق اڑانے لگے اور طنزیہ فقرے کسنے لگے میں چپ کھڑا سنتا رہا۔ اب میں اُن سے کیا کہتا۔ میں تو خود دادا جان کی اس پرانی ٹوپی سے بیزار تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سب چلے گئے۔ میں اپنے کمرے میں آگیا میرا دل بہت اُداس تھا۔ دادا جان کی ٹوپی کی وجہ سے مجھے دوستوں میں جو شرمندگی ہوئی تھی اس کی وجہ سے میں نے ٹوپی کو کہیں دور پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔

دادا جان وضو کرنے کے لئے غسلخانے میں گئے تو میں چپکے سے کمرے میں داخل ہوا۔ اور میز پر رکھی ہوئی ٹوپی بغل میں دبا کر باہر آگیا اور اسے باغیچے میں آخری کونے پر باڑھ کے اندر چھپا کر واپس چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد پورے گھر میں شور مچ گیا۔ "دادا جان کی ٹوپی گم ہو گئی" سب لوگ جمع ہو گئے تھے میں اپنے کمرے میں لیٹا رہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

تبسم کمرے میں داخل ہو کر بولی۔ "دادا جان کی ٹوپی گم ہو گئی ہے۔ وہ بڑے غصے میں ہیں۔ بہت شور مچا رہے ہیں"

میں مسکین صورت بنائے اُس کے ساتھ دادا جان کے پاس آگیا۔ اور چور کو بُرا بھلا کہنے لگا۔

ابو دفتر سے واپس آئے۔ تو ٹوپی کی گمشدگی کا سُن کر ابو نے باری باری ہمیں اپنے پاس بلایا۔ پہلے پیار سے پھر غصے سے پوچھا۔ مگر ہم سب نے کانوں کو ہاتھ لگا کر اپنی بےگناہی کا یقین دلایا۔

شام کے وقت میں ڈرتے ڈرتے دادا جان کے کمرے کے دروازے پر آیا۔ میں گھبرا گیا تھا اور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ دادا جان اب کیا قدم اٹھانے والے ہیں۔ اندر سے ان کے رونے کی آواز آئی۔ میں رُک گیا۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے ابو جان سے کہہ رہے تھے۔

"نصیر بیٹا! جب ملک آزاد ہوا تو تم زیادہ بڑے نہ تھے۔ تمہیں یاد ہے نا۔ کس طرح ہم سارا سارا دن آزادی کے لئے نعرے لگاتے ..... پھرتے تھے۔ دشمنوں کے خلاف منصوبے بنایا کرتے تھے۔ کئی دفعہ میں تمہیں اپنے ساتھ جلوس میں لے گیا تھا۔ یاد ہے نا! اس وقت ہم لوگوں میں کتنا جوش تھا۔ پھر آزادی کے اعلان کے بعد ہمارے قصبے پر حملہ ہوا۔ ہمارے بہت سے آدمی شہید ہو گئے۔

خدا کا شکر ہے کہ میں تمہارے ساتھ جان بچا کر اس آزاد ملک میں آگیا۔ تمہیں تعلیم دلائی اس قابل بنایا کہ تم افسر بن کر زندگی گزار سکو۔ یہ کوٹھی اولاد۔ یہ عزّت تمہیں اس آزاد ملک کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ اور اس ملک کو بنانے میں اس سیاہ پُھندنے والی ٹوپی نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ یہ ٹوپی پہن کر ہی میں جلوس میں سب سے آگے ہوتا تھا، جھنڈا لہراتا تھا۔ اب یہ ٹوپی نہ ملی تو میں مر جاؤں گا میرے بعد تم اس ٹوپی کا جو چاہو حشر کرو مگر میرے جیتے جی ایسا ظلم نہ کرو۔ خدا کے لئے ٹوپی تلاش کر کے لادو۔ وہ ٹوپی ہم سب کی عزّت کا نشان ہے"۔ دادا جان بچّوں کی طرح بلکنے لگے۔ میں کانپ اُٹھا۔ یہ میں نے کیا کیا تھا۔؟ میں بھاگ کر باغیچے میں پہنچا۔ اور ٹوپی نکال کر سینے سے لگالی۔ مجھے عجیب طرح کی خوشی حاصل ہو رہی تھی۔

میں نعرہ لگاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "مِل گئی۔ مِل گئی۔ ہماری عزّت مِل گئی۔" میں نے ٹوپی دادا جان کے سر پر رکھ دی اور انہوں نے مجھے سینے سے لگالیا۔

سچّائی کی تلاش

مرسلہ: عظمیٰ رحمٰن

انور نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ بڑے خون خرابے کا ماحول تھا۔ اُس کا خاندان بڑے بڑے نوابوں کی خدمت کرتا چلا آیا تھا۔ دادا، نانا، غرض ہر ایک نے نوابوں کی نوکری کی تھی اور ان میں سے ہر ایک نے خاصی دولت جمع کر لی تھی لیکن انور کے خاندان کے کوئی بزرگ طبعی موت نہیں مرے تھے بلکہ اُن کو مختلف الزامات میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کے والد کو بھی اسی طرح غلطی کے جرم میں مار دیا گیا تھا۔ باپ کی موت کے بعد انور سے کہا گیا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے والد کی جگہ حاصل کر لے لیکن انور نے نوابوں کی نوکری سے صاف انکار کر دیا۔ انور کی بوڑھی ماں نے ہمّت بندھائی کہ جس موت سے وہ خوفزدہ ہے وہ ایک نہ ایک دن آنی ہی ہے اس لئے اس سے خوفزدہ ہو کر جاہ و منصب سے منہ پھیرنا بزدلی ہے۔ لیکن ماں کی نصیحتوں کا انور پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ دمشق کے شمال مغرب میں پھیلے ہوئے اس پہاڑی سلسلے میں چلا گیا جو جبالِ لبنان کہلاتا تھا۔ ان پہاڑی سلسلوں میں وہ لوگ آباد تھے جن کو دنیا پسند نہیں آئی تھی۔ اور جو غاروں میں آ چھپے تھے۔ انور کسی ایسے درویش کی تلاش میں تھا جس کی مریدی اختیار کر کے اس کا دل اور روح مطمئن ہو جائے وہ مسلمان فقراء سے ملا اور اُن کے اِردگرد مریدوں کا ہجوم دیکھ کر مایوس ہو گیا۔ پھر وہ پارسی فقراء کی طرف چلا گیا لیکن پارسی فقراء کی بنیادی تعلیم نے اسے بہت دل برداشتہ کر دیا پھر وہ پہاڑیوں کے دامن میں آباد لوگوں کی طرف چلا گیا اور اُن سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ ان کے علم میں کوئی ایسا بزرگ ..... ہے جس کی بزرگی اور عظمت کا اُن کے دلوں پر سکّہ بیٹھ چکا ہو۔ اس نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہاں کوئی بزرگ کامل رہتے ہیں ؟ میزبان نے خوش ہو کر کہا، اس نواح میں ایک ایسے بزرگ موجود ہیں جن کی بزرگی اور کمال کا ایک زمانہ

معترف ہے اور بڑے بڑے حکمران ان کے خانقاہ کی جبّہ سائی کرتے ہیں ہر وقت ان کے در پر مراد مانگنے والوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ النور نے کہا۔ تب پھر تم مجھ کو اُن بزرگ کے پاس کب لے کر جاؤ گے۔ میزبان نے کہا۔ اللہ نے چاہا تو کل وہاں لے چلوں گا۔ اور خانقاہ کی عظمت اور دبدبے کا نظارہ کراؤں گا۔ النور نے وہ دن بڑے اضطراب میں گزارا، اسے اپنی ماں بھی یاد آئی لیکن اُس نے سوچا کہ اپنے مقصد میں کامیابی کے بغیر وہ کس طرح واپس ہو سکتا ہے جب اُس نے میزبان سے مسلمان بزرگ کی عظمت اور بڑائی کا ذکر سنا تو اُس کے مایوس دل میں ایک بار پھر امید کی شمع روشن ہوگئی۔ دوسرے دن علی الصبح میزبان اسے اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوگیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ خانقاہ کی حدود میں داخل ہوگئے جب دونوں خانقاہ کے دروازے پر پہنچے تو انہیں دروازے پر ہی روک لیا گیا۔ میزبان نے دربانوں سے کہا۔ کیا بات ہے؟ ایک شخص نے جواب دیا اندر حلب کا حکمران آیا ہے اس لئے پیر و مرشد نے کچھ دیر کے لئے لوگوں کی آمد و رفت روک دی ہے۔ النور نے کہا میں بعلبک کا امیر ہوں اور میں اسی وقت تمہارے ولی سے ملنا چاہتا ہوں اور اگر میں تمہارے ولی سے متاثر ہوگیا تو اُن کی خانقاہ کے لئے مستقل نذرانہ مقرر کردوں گا۔ دربان اندر چلا گیا اور واپس آکر ان دونوں سے کہا۔ اندر چلیئے۔ وہ ان دونوں کو خانقاہ میں لئے چلا گیا۔ خانقاہ ایک گوشے میں بنی ہوئی تھی۔ دونوں دربان کے ساتھ خانقاہ میں داخل ہوئے اس وقت پیر و مرشد حلب کے امیر سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔

پیر و مرشد نے ایک نظر النور اور میزبان پر ڈالی لیکن مخاطب نہیں ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد حاکمِ حلب رخصت کی اجازت کے لئے کھڑا ہوگیا اور پھر عاجزی سے درخواست کی کچھ زبانی بھی ارشاد فرمائیے۔ اس پر ولی نے کہا: یاد رکھو! انسان کے حق میں محنت، آرام سے بہتر، گمنامی، نام و نشان سے بہتر اور داد و دہش، قبولِ عطیات سے بہتر ہے"۔ پھر حاکمِ حلب خانقاہ سے نکل گیا۔ میزبان نے ولی سے کہا یہ بعلبک کا امیر ہے، ولی نے النور سے کہا۔

کیا تو واقعی بعلبک کا امیر ہے؟ النور نے جواب دیا۔ نہیں، لیکن میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ولی نے کہا تو کیا پوچھنا چاہتا ہے؟ اس پر النور بولا آپ نے ابھی فرمایا ہے انسان کے حق میں محنت آرام سے بہتر ہے لیکن عالم یہ ہے کہ آپ کچھ بھی نہیں کرتے۔ بس آرام ہی آرام ہے جو آپ اپنے مریدوں کے ساتھ فرماتے رہتے ہیں۔ مریدوں میں کھلبلی مچ گئی میزبان نے گھبرا کر النور کو وہیں چھوڑ دیا اور خود خانقاہ سے باہر آگیا لیکن النور نے اپنی بات جاری رکھی اور کہا اسی طرح آپ کی نصیحت کا دوسرا جزُ کہ گمنامی نام و نشان سے بہتر ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا آپ گمنام تو نہیں ہر طرف آپ کا نام و نشان بکھرا ہوا ہے۔ ولی کو اس بات پر غصہ تو بہت آیا لیکن صبر و تحمل سے کام لیا اور کہا بس

یا اور کچھ کہنا ہے؟ اس پر انور نے کہا کہ آپ نے اپنی نصیحت کے تیسرے جُزو میں فرمایا کہ داد و دہش، قبولِ عطیات سے بہتر ہے لیکن یہاں میں دیکھ رہا ہوں کہ اس خانقاہ میں کسی کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے لیکن قبول عطیات کے لئے پورا ماحول ساز گار ہے اور پھر انور نے مزید کہا درویش کی زندگی شاید مجھے راس نہیں آئے گی اس لئے میں اپنے گھر چلا جاؤں گا اور دنیا کے دوسرے انسانوں کی طرح زندگی گزار دوں گا۔ اور یہ کہہ کر انور خانقاہ سے نکل گیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے اور اس کو ڈھونڈنے کے لئے بن باس لینے یا گوشہ نشینی اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ایک دلچسپ واقعہ

مرسلہ:۔ عبدالباسط کورنگی دارالعلوم کراچی

سائنس میں ارشمیدس کی شہرت کا سبب یہ ہے کہ اس نے یہ اصول دریافت کیا کہ جب کوئی ٹھوس چیز کسی مائع میں ڈالی جائے تو اس کے وزن کے برابر اس ٹھوس چیز کا وزن گھٹ جاتا ہے۔ اس اصول کو "اصولِ ارشمیدس" کہتے ہیں ارشمیدس نے یہ اصول کس طرح دریافت کیا؟ اس کا ایک بہت دلچسپ قصّہ ہے جو ہم آپ کو سناتے ہیں سسلی کے بادشاہ نے سونے کا ایک تاج بنوایا اسے شک تھا کہ سُنار نے دھوکہ کیا ہے اور اس میں کچھ چاندی کی ملاوٹ کر دی ہے۔ بادشاہ نے ارشمیدس کے سامنے اپنا شک بیان کیا اور اس سے کہا کہ وہ دیکھے کہ تاج کا سونا خالص ہے یا اس میں کھوٹ ہے لیکن یہ جانتے وقت تاج کو کوئی نقصان نہ پہنچے ارشمیدس کوشش کرتا رہا۔ لیکن بہت عرصے تک وہ کوئی ایسا طریقہ دریافت نہ کر سکا جس سے تاج کے سونے کے کھرے یا کھوٹے ہونے کا پتا چل سکے اور تاج کو کوئی نقصان بھی نہ پہنچے۔ ایک روز ارشمیدس نہا رہا تھا۔ نہانے کے دوران اس نے دیکھا کہ جوں ہی اس کا جسم پانی کے اندر گیا پانی کی سطح اوپر اُٹھ گئی اور اس کا جسم بھی ہلکا ہو گیا۔ دیکھتے ہی اس نے محسوس کر لیا کہ مسئلہ حل ہو گیا۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا اور اسی حالت میں پالیا پالیا چلاتا ہوا بازار میں دوڑنے لگا اس نے دریافت کر لیا تھا کہ ٹھوس چیزوں کو پانی میں ڈال کر ان کے ٹھوس پن کا موازنہ کیا جا سکتا ہے ایک ہی ٹھوس چیز کے دو الگ نمونے لے کر پانی میں ڈالے جائیں ایک نمونہ خالص ہو اور ایک ملاوٹ والا پانی کے اندر ان کا جتنا وزن گھٹے گا وہ ایک سا نہیں ہو گا اس طرح کھرے اور کھوٹے کی پہچان کی جا سکتی ہے چنانچہ پانی کے اندر چاندی کے ملاوٹ والے سونے کے تاج کا وزن وہ نہیں ہو گا جو خالص سونے کے تاج کا ہو گا اور اس طرح تاج کو نقصان پہنچے بغیر فیصلہ کرنا بالکل آسان ہو گیا۔

آؤ ملائیں ہاتھ

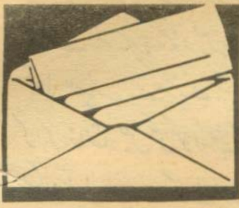

اِعلان

"آؤ ملائیں ہاتھ" کے کالم میں اپنا تعارف بھیجنے والے ساتھی عام طور پر لکھتے ہیں کہ وہ بڑے ہوکر ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ، کرکٹر، وِنگ کمانڈر یا کچھ اور بننا چاہتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ اگر وہ کسی خاص پیشے کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو کیوں؛ ظاہر ہے کسی خاص پیشے کو پسند کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔ تعارف بھیجنے والے ساتھیوں سے گزارش ہے کہ وہ آئندہ اپنے مستقبل کے ارادے کے ساتھ ساتھ اس کا سبب بھی بیان کریں۔ جس ساتھی کا جواب سب سے اچھا ہوگا اُسے آنکھ مچولی کا نیا شمارہ بطورِ انعام ارسال کیا جائے گا۔

(ادارہ)

محمد اکرم میمن، نو سال
جماعت پنجم، مشغلہ، ڈاک ٹکٹ جمع کرنا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس
معرفت پبلک لائبریری، سجاول، ضلع —— ٹھٹھہ

شعیب الرحمن، تیرہ سال
جماعت ہفتم، مشغلہ، لڑائی کرنا
بڑے ہوکر نفسیاتی ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، عربی
کوارٹر نمبر ۱۴ اسی بیراج ٹاؤن شپ، سکھر، سندھ

محمد شہباز، سات سال
جماعت دوئم، مشغلہ، تصاویر جمع کرنا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس
۱۳۱ فیز II ڈیفنس سوسائٹی، —— کراچی

محمد عامر، چودہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر پائلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب
ریلوے کوارٹر نمبر ۱۲ بلاک ۶۴، کالاپل، کراچی کینٹ

مطیع اللہ خان، گیارہ سال
جماعت چہارم مشغلہ، کہانیاں پڑھنا
بڑے ہوکر فوجی بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اردو
ر کولڈ ڈرنک، نیازی چوک، دریا آباد، کراچی

مریم عرفان، چودہ سال
جماعت نہم مشغلہ، شکار کھیلنا
بڑے ہوکر فوجی آفیسر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اردو
ٹنڈو سمبرو، حاجی نواب ویل، تحصیل ٹنڈو الہ یار

حافظ محمد اکرم، چودہ سال
جماعت ششم مشغلہ، مطالعہ کرنا
بڑے ہوکر فوجی آفیسر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگریزی
چاہ سیالاں، پوسٹ آفس آدم پورہ، ننکانہ صاحب ——

حافظ جاوید احمد، چودہ سال
جماعت ششم مشغلہ، رسالے پڑھنا
بڑے ہوکر سائنسدان بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، ریاضی
اے/۱۶۰۱ نئی منڈی محلہ مدینہ کالونی —— پتوکی پنجاب

عمران، گیارہ سال
جماعت ہفتم مشغلہ، کچھ نہیں
بڑے ہوکر فوجی بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، ڈرائنگ
۱۶۰ قصبہ کالونی، اورنگی —— کراچی ۴۱

سراج الدین احمد، بارہ سال
جماعت ششم مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگلش
جی ۷، ۲/۱ ملیر کالونی —— کراچی

ہمایوں بشیر، تیرہ سال
جماعت ہشتم بی، مشغلہ، رسالے پڑھنا
بڑے ہوکر پائلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اسلامیات
گھر نمبر ۱۱، گلی نمبر ۴۸، الیف/۸، فور، —— اسلام آباد

خاور جمال، گیارہ سال
جماعت چہارم مشغلہ، رسائل پڑھنا
بڑے ہوکر سراغرساں بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگلش
ون سی ۹/۱۰ لانڈھی نمبر ۱ —— کراچی نمبر ۲۰

ذیشان، بارہ سال
جماعت ششم مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر پائلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس
۵۹/اے، ۲ الفلاح سوسائٹی، شاہ فیصل کالونی —— کراچی

سرفراز حسین زیدی، پندرہ سال
جماعت ہفتم مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اردو
۱۰۹۶/۲۰ النور سوسائٹی —— کراچی نمبر ۳۸

ارشد الہدیٰ عادل، بارہ سال
جماعت پنجم، مشغلہ، مطالعہ کرنا
بڑے ہو کر انجینئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اردو، حساب
کوارٹر نمبر ۱۰۸، قصبہ کالونی ـــــــ کراچی ۷۱

محمد محسن، سات سال
جماعت، دوئم، مشغلہ، کہانیاں سننا
بڑے ہو کر پائلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب
محمد مبین، انبالہ بیکری ـــــــ نواب شاہ

محمد فیصل جنجوعہ، تیرہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، کچھ نہیں
بڑے ہو کر ایرو ناٹیکل انجینئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس
معرفت بشیر احمد جنجوعہ، جنجوعہ اسٹریٹ، لالا موسیٰ

طارق علی، گیارہ سال
جماعت ہفتم، مشغلہ، کارٹون بنانا
بڑے ہو کر انجینئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب
معرفت سردار خان لاشاری، مختیار کار آفس، جیکب آباد

تلانگ بلوچ، بارہ سال
جماعت ششم، مشغلہ، فٹبال کھیلنا
بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس
معرفت نذیر فدائی بلوچ دکاندار مین روڈ، جیوانی بلوچستان

ظہور احمد بلوچ، بارہ سال
جماعت ہفتم، مشغلہ، فٹبال کھیلنا،
بڑے ہو کر پائلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس
ایوب جنرل اسٹور، بس اسٹاپ، اتھل بیلہ، ضلع لسبیلہ

کاشف آزاد، بارہ سال
جماعت ہفتم، مشغلہ، رسائل پڑھنا
بڑے ہو کر وطن کا جیالا بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب
مکان نمبر ۴ ایچ، ۶۰۷، اے، اکبری مسجد، موہن پورہ، راولپنڈی

وسیم احمد، چودہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہو کر سائنسدان بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، بیالوجی
راشن شاپ نمبر ۱۸/۴، حاجی قاسم کالونی، مہاجر کیمپ، کراچی

محمد ذیشان قاضی، بارہ سال
جماعت ششم، مشغلہ، کتابیں پڑھنا
بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اردو
ای/۱۰ اے ایم قاضی بلڈنگ، نشتر آباد، پشاور

مقبول حسین، پندرہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کھیل کود
بڑے ہو کر انجینئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، ڈرائنگ
شیر پور پوسٹ آفس، تحصیل پنڈ دادن خان، ضلع جہلم

محمد سلیم ، سولہ سال

جماعت ہفتم، مشغلہ، دینی مطالعہ

بڑے ہو کر اچھا انسان بننا چاہتا ہوں

پسندیدہ مضمون، انگلش

صوفی محمد شفیع اینڈ سنز نزد ریجنٹ سینما، گوجرانوالہ

شکیل احمد عزیز، پندرہ سال

جماعت ہفتم، مشغلہ، رسائل پڑھنا

بڑے ہو کر قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں

پسندیدہ مضمون، حساب انگلش

۸/۱۱، بی ایریا لیاقت آباد ——— کراچی ۱۹

مرزا منظور بیگ، چودہ سال

جماعت نہم، مشغلہ، مصوری کرنا

بڑے ہو کر آرٹسٹ بننا چاہتا ہوں

پسندیدہ مضمون، بیالوجی

۱۲/۱۲-سی، ملیر توسیعی کالونی، کھوکھرا پار، ——— کراچی، ۲۷

منور حسین ناصر، تیرہ سال

جماعت ہفتم، مشغلہ، کہانیاں پڑھنا

بڑے ہو کر پائلٹ بننا چاہتا ہوں

پسندیدہ مضمون، سائنس

منور حسین ناصر مجید اینڈ کمپنی، مچھ ——— بولان

اطہر حسین، تیرہ سال

جماعت ہشتم، مشغلہ، اسکاؤٹنگ

بڑے ہو کر کیا بنوں گا، ابھی نہیں سوچا

پسندیدہ مضمون، حساب

معرفت غلام حسین، مکان نمبر ۱۰۳، گلی نمبر ۳، گرین ٹاؤن کراچی

شاہد حسین اختر تیرہ سال

جماعت ہفتم، مشغلہ، ٹکٹ جمع کرنا

بڑے ہو کر فوجی بننا چاہتا ہوں

پسندیدہ مضمون، اسلامیات

مکان نمبر ۱۳۱۶، گلی نمبر ۳، محمود آباد ——— کراچی ۴۴

- قلمی دوستی کے اس کالم میں صرف اسکول کے طلبہ وطالبات شریک ہو سکتے ہیں۔
- کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا۔
- خراب اور نامکمل کوپن قابل قبول نہ ہوں گے۔
- طالبات قلمی دوستی کے لیے اپنی تصاویر نہ بھیجیں۔

نام ——— عمر ——— جماعت ———

مشاغل ——— اسکول میں پسندیدہ مضمون ———

بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں۔ ——— وجہ ———

پتہ ———

پروفیسر متین الرحمٰن مرتضیٰ

امّی ابّو کا صفحہ

والدین کو اپنے بڑے اور بالغ بچّوں سے کبھی کبھی ایک شکایت یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کا سہارا بننے کے بجائے اور گھر کے معاشی مسائل میں والدین کا ہاتھ بٹانے کی بجائے ان سے ایسی فرمائشیں کرتے ہیں جن کا پورا کرنا والدین کی استطاعت میں میں نہیں ہوتا، اور جب والدین ایسی فرمائشوں کی تکمیل سے معذوری کا اظہار کرتے ہیں تو بچّوں کا طرزِ عمل سرکشی بے مہری اور لاتعلقی کا ہوتا ہے اور بچّوں کے یہ تیور والدین کے لیے بڑے جذباتی صدمے، دُکھ اور اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔ والدین کی سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی بھر بچّوں سے محبت کرنے اور انھیں ناز و نعم میں پالنے کا یہ صلہ انھیں بچّوں کی طرف سے کیوں ملتا ہے؟

اگر تجزیہ کیا جائے تو اس صورتِ حال کا سبب خود والدین کا اپنا رویّہ ہوتا ہے۔ ابتدائی عُمر میں جب بچّوں کی فرمائشوں کا پورا کرنا آسان ہوتا ہے تو وہ ان کی ہر فرمائش کو پورا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ فرمائشیں نامناسب بھی ہوتی ہیں تو وہ ان فرمائشوں کو ردّ کر کے بچّوں کو سمجھانے کی بجائے ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں، اور کچھ والدین کا تصور یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر بچّوں کی فرمائش مکمّل طور پر پوری نہ کی جائیں گی تو اوائل عمری سے ہی ان میں احساسِ محرومی جڑ پکڑے گا۔ چنانچہ والدین کی حیثیت سے اپنے بچّوں کو ذہنی طور پر صحت مند رکھنے اور احساس محرومی کے اثرات سے محفوظ پرورش کے نقطۂ نظر سے بھی وہ بچّوں کی فرمائشوں کی تکمیل اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

یہ سوچ اور یہ طرزِ عمل صحیح نہیں ہے۔ اوائل عمری سے بچّوں کو یہ احساس دینا ضروری ہے کہ ان کی ہر فرمائش پوری نہیں کی جا سکتی اور اس میں ان کی بہتری ہے۔ اُن کے کھانے پینے رہنے سہنے اور پہننے اوڑھنے کی ضرورتوں کی تکمیل اعتدال کے ساتھ کی جاتی رہے تو اِن میں احساسِ محرومی پیدا نہیں ہو سکتا۔ متوسّط گھرانوں میں بچّوں کو ابتدا ہی سے گھر کے مالی و معاشی وسائل و مسائل کی کیفیتوں سے باخبر رکھا جائے تو بچّوں میں اِن مسائل میں شرکت اور ذمّہ داری کا احساس از خود اُبھر آتا ہے۔ ایسی صورتوں میں بچّوں میں ضد اور سرکشی کے جذبات جڑ نہیں پکڑتے۔ اعتدال کے ساتھ پرورش پانے اور اوائلِ عمری سے گھر کے وسائل و مسائل سے باخبر ہو جانے والے بچّوں کا رویّہ اپنے والدین سے زیادہ مہر و محبّت اور خدمت و ایثار کا ہوتا ہے اور ایسے بچّے قبل از وقت ہی اپنے والدین کا سہارا بننے اور ان کا دست و بازو بننے کے لیے بے چین ہوتے ہیں۔ چنانچہ والدین کو بچّوں سے شاکی ہونے کی بجائے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا تجزیہ کرنا چاہیئے۔ بچّے تو اپنے والدین کے کردار و عمل کا آئینہ ہوتے ہیں۔

جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مُٹھی میں بند
ہے کیا... بتا دو نا!
ناز
پان مصالحہ
ASHRAF PRODUCTS.
P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE

Regd. No. M-266 OCTOBER 1987
Monthly AANKH MICHOLEE Karachi